اول المسلمین ﷺ کے بعد

شیعہ سنی تقسیم کی داستان

لیزلے ہیزلٹن

ترجمہ : عمر بنگش

Copyright © 2009 by Lesley Hazleton
All rights reserved. Published in the United States by Doubleday, a division of Random House, Inc., New York, and in Canada by Random House of Canada Limited, Toronto.
www.doubleday.com
DOUBLEDAY and the DD colophon are registered trademarks of Random House, Inc.
Library of Congress Cataloging-in-Publication Data
Hazleton, Lesley, 1945–

After the prophet: the epic story of the Shia-Sunni split in Islam / Lesley Hazleton. —1st ed.
p. cm.
1. Islam—History. 2. Caliphate—History. 3. Muhammad, Prophet, d. 632—Death and burial. 4. ’A’ishah, ca. 614–678. 5. ’Ali ibn Abi Talib, Caliph, 600 (ca.)–661. 6. Shi’ah—Relations—Sunnites. 7. Sunnites—Relations—Shi’ah. I. Title.
BP55H42 2009
297.8’04209—dc22 2 009006498

eISBN: 978-0-385-53209-9

v3.0

اس باب کے مطالعے سے قبل یہ نوٹ ضرور ملاحظہ کریں: اس کتاب کے مندرجات کی صحت بارے ایک سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایک بار پھر عرض کر دوں۔ اس کتاب میں شامل مواد کے صرف دو ہی بڑے حوالے ہیں۔ ابن اسحاق اور ال طبری کام جنھوں نے بالترتیب سیرت رسول اور تاریخ اسلام تحریر کی ہے۔ یاد رہے، محمدؐ کی سوانح حیات اور اوائل دور کی تاریخ اسلام کے صرف یہی دو قابل اعتبار حوالے ہیں جو آٹھویں اور نویں صدی میں جمع کیے گئے۔ اصل واقعات کے بیان کے لیے مندرجہ بالا حوالہ جات کے علاوہ کتاب کی ترتیب کے لیے ضروری ہے کہ سنی اور شیعہ کے نظریات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے حوالے کے طور پر کتاب میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ، دونوں گروہوں کے جید علماء اور سکالروں کی کتب کے حوالہ جات بھی استعمال میں لائے گئے ہیں۔ بعض جگہوں پر معاملات کو سمجھنے کے لیے مصنفہ اور مترجم نے دونوں رخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ظاہر ہے، ضروری ہے۔ یاد رہے، اصل ماخذ یعنی اوائل تواریخ یا سنی / شیعہ علماء کے نظریات کی کسی طور بھی مصنفہ اور مترجم پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ پوری کوشش یہ ہے کہ فرداً فرداً جہاں تک ہو سکے، سوالات کے جواب دیئے جائیں مگر اکثر بوجوہ مصروفیت، سوالات میں ذاتیات کے عنصر اور صرف داستان گوئی کے انداز پر معترض ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں رہتا۔ صلہ عمر پر اظہار رائے کا ہر طرح سے احترام کیا جاتا ہے۔ یہ نوٹ تحریر کر دیا ہے تا کہ قارئین کے شبہات دور ہو سکیں۔ شکریہ

فہرست

تمہید 4
حصہ اول : محمد ﷺ 7
باب 1 7
باب 2 23
باب 3 43
باب 4 65
باب 5 84
حصہ دوم : علی علیہ السلام 104
باب 6 104
باب 7 130
باب 8 155
باب 9 175
باب 10 196
باب 11 225
حصہ سوم : حسین علیہ السلام 246
باب 12 246
باب 13 275
باب 14 309
باب 15 329
ماخذ اور حوالہ جات 340

تمہید

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ یوں لگا، جیسے کان پھٹ گئے ہیں۔ پہلے چند سیکنڈ تک تو لاکھوں زائرین مثال جڑ کی طرح جہاں تھے، وہیں دب گئے۔ سبھی جانتے تھے کہ کیا ہوا ہے، لیکن یقین نہیں آرہا تھا۔ دماغ ماؤف اور اوسان خطا تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد کانوں میں بجتی سیٹیاں کم ہوئیں، حواس قدرے بحال ہوئے تو ہر طرف چیخ پکار اور ہاؤ ہو مچ گئی۔

لوگوں میں فوراً ہی افراتفری پھیل گئی۔ سب ایک ساتھ، خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مرکزی چوک سے نکل کر گلیوں میں پھیل گئے۔ ان میں زیادہ تر کا رخ ایک ہی جانب تھا، وہ دوڑتے ہوئے سنہری گنبد والی مسجد کے احاطے میں پہنچنے لگے۔ دھوئیں اور دھول سے اٹے، اکثر خون میں لت پت، شدید زخمی حالت میں یہاں وہاں پڑے تھے۔ کسی کی ٹانگ اڑ گئی اور کوئی خون بہہ جانے سے ہلکان، کئی لاشیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بند جگہوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ابھی پہلے دھماکے سے بھی پوری طرح سنبھلے نہیں تھے کہ گنبد کے سائے تلے، صحن کے بیچ میں ہی ایک اور بم پھٹا، پھر ایک اور، اس کے بعد ایک اور۔۔۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ یکے بعد دیگرے نو دھماکوں سے قیامت کا سماں بندھ گیا۔

تیس منٹ کے اندر کار میں نصب بموں، خودکش دھماکوں، گرینیڈ اور مارٹر گولوں کے حملوں سے دھرتی لرز اٹھی۔ جب یہ ہو چکا تو اطراف میں جلے ہوئے گوشت کی بو، خون اور دھول ہی دھول تھی۔ یہاں تک کہ کئی ایمبولینسوں کے تیز سائرن بھی شور میں دب کر رہ گئے۔

یہ 4 مارچ، 2004ء کی صبح کا واقعہ ہے۔ اسلامی کلینڈر میں دس محرم کا دن، جسے عاشورہ بھی کہا جاتا

ہے۔ کربلا میں شیعہ زائرین کی ایک بڑی تعداد جمع ہے۔ زیادہ تر لوگ پچاس میل دور واقع بغداد شہر سے یہاں تک پیدل چل کر پہنچے تھے۔ انہوں نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا، جلوس میں سینکڑوں کی تعداد میں علم اور جھنڈے بلند تھے اور زائرین ترنم سے نوحے الاپتے، نعرے لگاتے اور سینہ پیٹتے ہوئے 'شہدا کے شہزادے' یعنی محمد ﷺ کے نواسے حسین علیہ السلام کا ماتم کر رہے تھے۔ حسین علیہ السلام کو اسی مقام پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ، یہ عاشورہ کا دن ہے، ماتم کا حال ہے لیکن اس کے باوجود ماحول میں ایک لحاظ سے جشن کا سا بھی عنصر گھلا ہوا ہے۔ کئی برسوں تک اس اجتماع، یعنی عاشورہ کے دن زیارت اور جلوس پر پابندی عائد چلی آ رہی تھی۔ صدام حسین کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ شیعہ کھلے عام آزادی سے یہ اجتماع منعقد کر رہے تھے۔ آج لوگوں کا یہ جم غفیر، ایک بار پھر ملنے والی آزادی کا مظہر تھا۔ لیکن اب ہوا یہ کہ، ماضی یاد کرنے نکلے تھے، خود ماضی کا حصہ بن گئے۔ مرنے والوں کا شمار بھی شہداء میں ہو گیا۔

بعد ازاں اس واقعے کو 'عاشورہ کا قتل عام' کہا جائے گا۔ یہ واقعہ بعد ازاں ملک میں ایک طویل اور فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا آغاز ثابت ہو گا۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال ہو گا، آخر حالات اس نہج تک کیسے پہنچ گئے؟

سنی شدت پسند گروہ، القاعدہ نے عراق میں ہوئے اس حملے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ القاعدہ کے جنگجوؤں نے یہ حملہ خاصی مہارت اور انتہائی سرعت سے کیا۔ جس مقام پر یہ قیامت مچی، وہ تو ایک طرف، بے حد حیرت انگیز اور انتہائی دکھ کا باعث تھا۔ اس کے علاوہ بھی، سینکڑوں اموات اور ہزاروں زخمیوں کو دیکھ کر دہشت کا سماں بندھ گیا۔ شیعہ کلینڈر میں دس محرم کا دن سب سے متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہودیت میں یوم کیپور یا عیسائیت میں ایسٹر کے اتوار کی سی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اس واقعہ کی یاد ہے جو 680ء میں اسی دن یعنی دس محرم کو اسی مقام یعنی کربلا میں پیش آیا تھا۔ عربی میں کربلا، دو لفظوں کا مرکب ہے۔ کرب اور بلا۔ کرب کا مطلب بربادی یا پائمالی اور بلا سے مراد مصیبت یا غم واندوہ ہے۔

محمد ﷺ کو گزرے ابھی پچاس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کے انتہائی قریبی عزیزوں کا یہیں قتل عام ہوا اور ان کے گھر کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر زنجیروں میں جکڑ لیا گیا۔ تب بھی، جیسے جیسے خبر پھیلی، اس وقت کی اسلامی دنیا، یعنی مشرق میں ہندوستان کی سرحدوں اور مغرب میں الجیریا تک، غم و غصہ پھیل گیا۔ اس وقت بھی ایک سوال نے جنم لیا اور یہی سوال آج چودہ سو سال بعد بھی پوچھا جا رہا ہے۔ آخر حالات اس حد تک کیونکر پہنچے؟

ساتویں صدی عیسوی میں جو واقعات کربلا کے مقام پر پیش آئے، وہ ایک عرصے سے چلے آ رہے شیعہ اور سنی گروہوں کے بیچ قطعی طور پر تفریق کی بنیاد بن گئے۔ اوائل دور کی اسلامی تواریخ، یعنی ابن اسحاق اور الطبری کی تصانیف میں ان واقعات اور پس منظر کا احوال خاصی تفصیل کے ساتھ واضح اور نہایت بے تکلف انداز میں ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ واقعات مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں آج بھی سنیوں کو ازبر ہیں اور شیعہ کے دل پر تو جیسے نقش ہیں۔ ان واقعات کے نتیجے میں اگر ایک طرف تاریخ کے دھارے کو پہلی بار روک لگی تو لوگ واقعی سوچنے پر مجبور ہوئے۔ دوسری طرف یہی واقعات تھے، جو ایسی جذبات انگیز قوت کو مجتمع کر گئے جو وقت کے ساتھ سدا پھیلتا ہوا ایک ایسا مرغولہ بن گیا جس میں حال اور ماضی، ایمان اور سیاست، ذاتی شناخت اور قومی آزادی الغرض ہر چیز لاینحل طور پر بٹ کر رہ گئی۔

شیعہ کا موقف یہ ہے کہ، 'ہر دن عاشورہ ہے اور ہر جگہ کربلا ہے'۔ 4 مارچ، 2004ء کو یہی پیغام حرف بہ حرف مگر نہایت دہشت انگیز انداز میں دہرایا گیا۔ کربلا کی کہانی بلاشبہ کبھی نہ ختم ہونے والی داستان ہے جو آج بھی تقریباً ساری ہی اسلامی دنیا میں اسی طرح مسلسل لیکن نہایت دہشت انگیز انداز میں تہہ در تہہ، ہر روز ہی کھلتی رہتی ہے۔ اس لہو لہو داستان میں عراق سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے جو شیعہ اسلام کا پنگوڑا رہا ہے، جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی۔

یہ کتاب، اسی دور کی کہانی ہے۔ ہمیں پتہ چلے گا کہ کہانی تب کیسے پیش آئی اور آج بھی، وہی داستان آخر کیوں رکنے کا نام نہیں لیتی اور مسلسل پیش ہی آتی چلی جا رہی ہے۔

حصہ اول: محمد ﷺ

باب 1

یہ داستان کہاں سے شروع ہوتی ہے؟اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ محمد ﷺ کے انتقال کا وقت تھا ۔اس قصے کی واقعی ابتداء اسی دن ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تمام انسان، حتی کہ پیغمبر بھی فانی ہوتے ہیں۔ اس بات سے ہر کوئی واقف تھا، یہاں تک کہ خود محمد ﷺ کو بھی اچھی طرح اندازہ تھا لیکن اس کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب نے ہی حقیقت سے آنکھیں چرا لی ہوں۔ لوگ آخر تک یہی سمجھتے رہے کہ شاید، وائے شاید۔۔۔

اچھا، کیا محمد ﷺ خود بھی جانتے تھے کہ وہ بالآخر مر ہی جائیں گے؟ یقیناً، وہ جانتے تھے اور اس کا تذکرہ بارہا ملتا ہے۔ اسی طرح، ان کے ارد گرد لوگ بھی اچھی طرح واقف تھے لیکن پھر بھی، کوئی اس خیال کو تصور میں لانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا، انہیں کبھی اس حقیقت کی تلخی سوجھی ہی نہیں۔ یہی بات عجیب تر ہے۔ محمد ﷺ کی عمر تریسٹھ برس ہو چکی تھی اور اس زمانے میں، یہ اچھی خاصی طویل عمر شمار ہوا کرتی تھی۔ وہ جنگوں اور لڑائیوں میں کئی بار زخمی ہوئے، بالخصوص احد کی لڑائی میں تو انہیں کاری چوٹ آئی تھی۔ اسی طرح، ان کی زندگی پر کم از کم تین ایسے قاتلانہ حملے ہوئے، جن کی تفصیلات تواریخ میں عام مل جاتی ہیں۔ شاید، اس طور بھرپور زندگی گزار چکنے کے بعد، مہمات اور بقول شخصے، 'ہیرو کی زندگی' بسر کرنے کے بعد، ان کے رفقاء کے لیے بھی یہ مانتے ہوئے خاصی مشکل پیش آ رہی تھی کہ محمد ﷺ کو بالآخر ایک بیماری آن لے گی۔ یا کہیے، ایک طبعی مرض ان پر کاری ہو گا؟ بالخصوص، اب جب کہ سارا عرب و حجاز ان کی تحریک

کے جھنڈے تلے آن جمع ہوا تھا، اس کے بعد تو محمد ﷺ کا بچھڑنا، تقریباً ناممکن سی بات لگتی تھی۔

وہ لوگ جو کبھی آپ ؐ کی جان کے درپے رہا کرتے تھے، انہوں نے بارہا قتل کے منصوبے بھی بنائے۔ اب ایک طویل سفارتی جدوجہد اور جنگ کے بعد اتحادی بن چکے تھے۔ امن قائم ہو گیا تھا اور امہ کا تصور یک جان ہو کر واقعی پنپ رہا تھا۔ یہ صرف ایک نئی صبح نہیں تھی بلکہ چہار سو امید اور تابناک مستقبل کا سورج جگمگا رہا تھا۔ عرب اب صرف حجاز کی پہاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے، پس منظر میں بسنے والی ایک مضافاتی آبادی نہیں تھے بلکہ تاریخ میں پہلی بار وہ دنیا کے سیاسی اور ثقافتی منظر نامے پر ایک بڑی قوت بن کر ابھرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اس نئی بے پایاں قوت کار ہنما، ایسے درخشاں موڑ پر اچانک کیسے بچھڑ سکتا ہے؟ اگرچہ، موت اٹل ہے تو وہاں یہ حقیقت، جو تیزی سے کامیابیاں بٹورنے سے بھی کہیں بڑی سچائی ہے، منہ پھلائے کھڑی تھی۔ برسوں تک تشدد اور مشکلات کا سامنا کرنے، لڑائیوں، جنگوں اور قاتلانہ حملوں سے بچ نکلنے کے بعد بھی، محمد ﷺ طبعی وجوہات کے ہاتھوں جان ہار رہے تھے۔

بظاہر یہ عام سا بخار اور ساتھ ہی سر درد کی شکایت تھی۔ پہلے پہل، یہ اتنی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، صحت مسلسل گرنے لگی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ بخار ہر وقت رہتا یا سر مسلسل ہی درد سے پھٹ جاتا۔ کبھی ہوتا، پھر اتر جاتا، لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی شدت بڑھتی گئی۔ عرب کے طول و عرض میں پھیلی اس جراثیمی بیماری کی کلاسیکی نشانیاں ہوا کرتی ہیں، دس دن کے اندر ہی بخار، سر اور کمر میں پھیلتے ہوئے قولنج کے درد نے آپ ؐ کو دوہرا کر کے رکھ دیا۔ سرسام یا ورم سحایا نامی یہ بیماری، جسے عام زبان میں گردن توڑ بخار بھی کہا جاتا ہے، آج بھی دنیا کے کئی کونوں میں جان لیوا ہے۔

جلد ہی محمد ﷺ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے اور پٹھوں میں شدید درد، دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کی حفاظتی جھلی میں سوزش کی وجہ سے کسی سہارے کے بغیر کھڑے ہونے سے بھی رہ گئے۔ مسلسل ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں معلق ہوتے رہے اور چوبیسوں گھنٹے پسینہ یوں بہتا جیسے اس میں نہائے ہوں۔ یہ اس وجد کی سی کیفیت نہیں تھی، جس میں کبھی وحی نازل ہوتی تو پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ اس سے تو جلا ملتی تھی، یہ کمزور کر دینے والی حالت تھی۔ تب تو انہیں ہر وحی کے بعد، جیسے طاقت اور رگوں میں توانائی

بہنے کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اب بیویاں کپڑے کی پٹیاں، ٹھنڈے پانی میں بھگو کر ان کی پیشانی پر لپیٹتی رہیں کہ کچھ افاقہ ہو، لیکن یہ بے سود تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاید اس طرح درد اور بخار جسم سے نکل جائے گا لیکن ظاہر ہے، ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہاں، اس سے تھوڑی دیر کو آرام آ جاتا، علامات دب جاتیں لیکن یہ اس کا علاج نہیں تھا۔ سخت بیماری کی حالت میں، خیر یہ بھی غنیمت تھی۔ عارضی ہی سہی، تھوڑی دیر کو سکون مل جاتا لیکن جلد ہی پھر حالت بگڑ جاتی اور درد ناقابل برداشت ہو جاتا، جسم سے طاقت نکل جاتی۔

جلد ہی محمد ﷺ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے اور پٹھوں میں شدید درد، دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کی حفاظتی جھلی میں سوزش کی وجہ سے کسی سہارے کے بغیر کھڑے ہونے سے بھی رہ گئے۔ مسلسل ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں معلق ہوتے رہے اور چوبیسوں گھنٹے پسینہ یوں بہتا جیسے اس میں نہائے ہوں۔ یہ اس وجد کی سی کیفیت نہیں تھی، جس میں کبھی وحی نازل ہوتی تو پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ اس سے تو جلا ملتی تھی، یہ کمزور کر دینے والی حالت تھی۔ تب تو انہیں ہر وحی کے بعد، جیسے طاقت اور رگوں میں توانائی بہنے کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اب بیویاں کپڑے کی پٹیاں، ٹھنڈے پانی میں بھگو کر ان کی پیشانی پر لپیٹتی رہیں کہ کچھ افاقہ ہو، لیکن یہ بے سود تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاید اس طرح درد اور بخار جسم سے نکل جائے گا لیکن ظاہر ہے، ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہاں، اس سے تھوڑی دیر کو آرام آ جاتا، علامات دب جاتیں لیکن یہ اس کا علاج نہیں تھا۔ سخت بیماری کی حالت میں، خیر یہ بھی غنیمت تھی۔ عارضی ہی سہی، تھوڑی دیر کو سکون مل جاتا لیکن جلد ہی پھر حالت بگڑ جاتی اور درد ناقابل برداشت ہو جاتا، جسم سے طاقت نکل جاتی۔

اس چھوٹے سے کمرے میں ہٹے کٹے، صحتمند شخص کا دم گھٹ جاتا، محمد ﷺ تو پہلے ہی ناجوڑ تھے۔ یہ مئی کا اواخر اور جون کی شروعات تھی، صحرا میں گرمی دن چڑھتے ہی بڑھنے لگتی اور دوپہر تک لو اور شدید حبس سے دم گھٹنے لگتا۔ ایسے میں آپ ﷺ کو سانس لینے میں شدید تکلیف رہتی ہو گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس بیماری میں شور اور روشنی سے بھی تکلیف ہونے لگتی ہے۔ روشنی کا انتظام ہو سکتا تھا، روشن دانوں اور دروازے پر پردے گرا دیے جاتے لیکن شور کا کوئی حل نہیں تھا۔

مشرق وسطیٰ میں جیسے آج، ویسے ہی تب بھی ایک مریض کمرہ عام طور پر تیمارداروں سے بھرا رہتا ہے۔

رشتے دار، رفقاء، ساتھی اور حامی۔۔۔ جو شخص قربت کا دعوی دار ہو، وہی دن اور رات مریض کمرے کے آس پاس ہوتا اور ہر شخص کی کوشش یہ کہ وہ آپؐ، جو اس نوزائیدہ ریاست میں طاقت و اختیار کا مرکز تھے، سرہانے بیٹھے رہے۔ لوگوں کی آمد و رفت چوبیس گھنٹے جاری رہتی جو ہمہ وقت فکر کا اظہار کرتے، مشورے دیتے اور بار بار ایک ہی سوال دہرا کر زچ رکھتے۔ محمد ﷺ جاگتے رہنے کی بھرپور کوشش کرتے، تگ و دو میں رہتے کیونکہ بیماری کی حالت میں بھی وہ ان معززین کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ بہت کچھ تھا جس کا انحصار آپؐ کے تعلقات پر تھا۔

باہر، مسجد کے احاطے میں عام لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے جو ہر وقت یہیں موجود رہتے۔ دن اور رات، گھروں کو بھی نہ جاتے اور کوشش رہتی کہ جس قدر ممکن ہو سکے، مریض کمرے کے قریب رہیں۔ تقریباً لوگ خود کو یہ تسلی دیتے رہے کہ یہ بیماری سوائے اس کے، کچھ نہیں کہ چند دن میں اتر جائے گی، لیکن اس کے باوجود وہ ایک عجب مخمصے کا شکار تھے، کیونکہ انہوں نے اسی بیماری کے ہاتھوں لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھ رکھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ جان لیوا ہے مگر اس کے باوجود وہ بوجوہ اس حقیقت کو آخر تک ماننے سے قاصر رہے۔ بہرحال، وہ مریض کمرے کے باہر پڑے دعائیں مانگتے رہے اور انتظار کرتے۔ ان کی آنکھیں کمرے پر جمی رہتیں اور کان کسی خبر کو سننے کے لیے دھرے رہتے جبکہ زبان پر دعا اور درود جاری رہتا۔ جس سے ایک علیحدہ صورتحال بن گئی۔ مسجد کے احاطے میں ہر وقت ایک کشمکش اور بے چینی کی سی فضا قائم رہتی جو اپنے آپ میں ایک قضیہ تھا۔ جوں ہی کوئی خبر نکلتی، وہ منہ در منہ ایک گاؤں سے دوسرے اور یوں پورے نخلستان اور پھر مکہ اور عرب کے طول و عرض میں پھیل جاتی۔

لیکن، پچھلے کچھ دنوں سے بیماری بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے پریشانی میں اضافہ ہو گیا اور اب لوگ مریض کمرے اور مسجد کے احاطے میں ہر وقت شور و غوغے کی بجائے متفکر رہنے لگے۔ تقریباً پورے نخلستان میں ایک سکوت سا پھیل گیا اور لوگ اب پہلی بار جان گئے کہ وہ جس کا ڈر تھا، وہی ہونے جا رہا ہے۔ اب لوگوں کے ذہن پر بیماری سے زیادہ ایک نیا سوال حاوی ہو گیا، جو ابھی بھی کسی کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر انہونی ہو گئی، یعنی محمد ﷺ انتقال کر گئے تو پھر، ان کا جانشین کون ہو گا؟ کون ہے

جو معاملات سنبھالے گا؟ نیا رہنما کون ہے؟

یہ سب خاصا آسان ہو جاتا اگر محمد ﷺ خود اپنا جانشین مقرر کر دیتے یا کم از کم ان کے یہاں اولاد نرینہ ہوتی۔ صرف ایک بیٹا بھی کافی تھا۔ اگرچہ، روایتی طور پر اس طرح کا کوئی رواج نہیں تھا کہ جس میں ایک رہنما کے چل بسنے کی صورت میں اختیار سب سے بڑے بیٹے کے حوالے کر دیا جاتا، وہ ایسی صورت میں بھی وصیت میں منجھلے بیٹے یا قریبی رشتہ دار کو یہ اختیار دے سکتے تھے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ اگر وصیت نہ ہو تو رسمی طور پر سب سے بڑا بیٹا ہی حقدار ہو گا۔ تاہم، محمد ﷺ کے یہاں نہ تو بیٹے تھے اور نہ ہی انہوں نے صاف طور پر کسی جانشین کو مقرر کیا۔ وہ بغیر وصیت کے ہی گزرنے والے تھے۔ عربی میں اس کے لیے 'ابتر' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے لغوی معنی خاتمے، کٹے ہوئے یا جدا کے ہیں۔ یعنی، وہ بیٹے کو جنم دیے بغیر جا رہے تھے۔

اگر محمد ﷺ کے یہاں کوئی بیٹا ہوتا تو شاید اسلام کی تاریخ مختلف ہوتی۔ یہ جھگڑا نہ ہوتا۔ خانہ جنگی سے بچ جاتے، خلفاء اور ان کے ناطے دار ایک دوسرے کے حریف نہ ہوتے اور امکان غالب ہے کہ شیعہ اور سنی میں پھوٹ نہ پڑتی۔۔۔ تاریخ میں اس سارے وبال کو ٹالا جا سکتا تھا۔ محمد ﷺ کی پہلی بیوی خدیجہ کے یہاں اگرچہ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کی پیدائش ہوئی تھی لیکن وہ دونوں ہی شیر خواری کی عمر میں چل بسے تھے اور بعد ازاں محمد ﷺ نے خدیجہ کے انتقال کے بعد نو شادیاں کی لیکن ان میں سے ایک بھی، حمل سے نہ ہوئیں۔

اس بابت مکہ اور مدینہ، دونوں ہی شہروں میں بات ہوتی رہی تھی۔ خدیجہ کے بعد کی جانے والی نو کی نو شادیاں کہیے تو سیاسی اور سفارتی وجوہات کی بناء پر کی گئی تھیں اور جیسا کہ اس زمانے میں حکمرانوں کے یہاں رواج تھا، سفارتی اتحاد اسی طرح قائم ہوا کرتے تھے۔ محمد ﷺ کی یہ شادیاں اسلام کی نئی ریاست میں، سماج یعنی امہ کو اکٹھا رکھنے کا موجب تھیں۔ یہ واحد طریقہ تھا کہ جس کے ذریعے قبائل اور دیرینہ دشمنان کے بیچ ایک نئے تعلق اور دوستی کو فروغ دیا جا سکتا تھا۔ صرف دو سال پہلے ہی جب مکہ میں اسلام کا بول بالا ہو چکا تھا، محمد ﷺ نے یہاں بھی نئی بنیادیں شادی کے ذریعے ہی رکھیں۔ آپؐ نے ام حبیبہ سے شادی کی، جو

ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ابوسفیان مکہ کے سردار تھے اور ایک عرصے تک محمد ﷺ کے دیرینہ دشمن چلے آ رہے تھے۔ جیسا دنیا بھر میں ہوتا ہے، یہاں بھی لازم تھا کہ اس طرح کے اتحاد عام طور پر اولاد کے ذریعے ہی پختہ ہوا کرتے ہیں، صرف شادی کا بندھن کافی نہیں ہوتا۔ نئے خون سے نئی امید وابستہ کی جاسکتی ہے، اس طرح پرانی رقابتیں اور انقسام کو مٹایا جا سکتا ہے۔ ایک رہنما کے لیے، شادی صرف اسی وجہ سے ضروری سمجھی جاتی ہے۔

خدیجہ کے بعد محمد ﷺ کی تقریباً بیویوں کے یہاں اولاد تو تھی لیکن وہ ان کی سگی نہیں تھی۔ یعنی، عائشہ کے علاوہ آپؐ کی تمام بیویاں بیوہ یا طلاق یافتہ تھیں۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دولت مند مرد اس زمانے میں بھی ایک ہی وقت میں چار شادیاں کر سکتے تھے اور محمد ﷺ کو خصوصی طور پر اجازت تھی کہ وہ سیاسی اور سفارتی اتحاد کی غرض سے جتنی چاہتے، شادیاں کرتے۔ مردوں کے علاوہ، عورتیں بھی اکثر دو، تین اور چار دفعہ شادیاں کر لیتی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ مرد ایک ہی وقت میں چار شادیاں کر سکتے تھے جبکہ عورتیں یکے بعد دیگرے سلسلہ وار کئی شادیاں کر سکتی تھیں، یعنی ایک وقت میں ایک ہی شادی کی اجازت تھی۔ چنانچہ، طلاق یا بیوگی کی صورت میں وہ دوبارہ سے شادی کر لیتیں۔

اس تمام طریق کا مطلب یہ تھا کہ مکہ اور مدینہ، دونوں ہی شہروں میں ناطے داری کا مثل، گہرا اور جکڑ مکڑ جال بنا ہوا تھا۔ سوتیلے بہن بھائی، عمزاد، چچازاد، سسرالی اور دور کے رشتہ دار، الغرض ہر شخص دوسرے کے ساتھ کم از کم تین یا چار رشتوں میں بندھا ہوا تھا۔ یہ جدید دور میں مغرب کی ایک خاندان کی تعریف سے میل نہیں کھاتا۔ ساتویں صدی عرب میں یہ تعلق داری کا ایک وسیع جال ہوا کرتا تھا جو کہ آج کل کے زمانے میں یک خطی شجرہ کے بالکل برخلاف ہے۔ تب یہ شجرہ ایک تناور درخت کی بجائے، زمین پر پھیلی انتہائی گہری جڑوں کی بیلوں کے جنگل کی مانند ہوا کرتا تھا جو ایک دوسرے میں اس طرح جکڑی ہوئی ہر طرف یوں پھیلی رہتی ہیں کہ ان میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ لوگ ایک ہی قبیلے میں چاہے کسی بھی کنبے سے تعلق رکھتے یا کہیے تو قبائل میں کسی بھی ایک قبیلے سے تعلق رکھتے، وہ بہر حال ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے ناطے دار ٹھہرتے۔ لیکن، اس کے باوجود خونی رشتوں کی اہمیت اپنی جگہ پر

ہمیشہ ہی برقرار رہا کرتی تھی، جیسا کہ اس نوزائیدہ ریاست کے اقتدار میں اہم قرار پائی۔

روایت میں درج ہے کہ خدیجہ کے بعد بھی محمد ﷺ کے یہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ بیٹا، ماریہ کے یہاں پیدا ہوا تھا جو ایک باندی تھی۔ ماریہ کو مصر کے رئیس نے تحفتاً پیش کیا تھا۔ آپؐ نے ماریہ کو مسجد سے دور، مدینہ کے مضافات میں ایک مکان دلا رکھا تھا۔ ان کے اس باندی سے جنم لینے والے بیٹے کا نام ابراہیم تھا۔ لیکن، یہ بھی جانبر نہ ہو سکا اور شیر خواری کی عمر میں ہی انتقال ہو گیا۔

اس وقت مریض کمرے میں موجود ساری ہی بیویوں نے کبھی اپنے تیئں پوری کوشش کی ہو گی کہ وہ ایک بیٹے کو جنم دے سکیں۔ اس طرح، جو بیوی ایسا کر لیتی، وہ یقیناً دوسری تمام بیویوں سے ممتاز ٹھہرتی۔ پھر یہ کہ ایک پیغمبر کے بیٹے کی ماں؟ یعنی، پیغمبر کا جائز وارث؟ اس سے بڑی عزت اور منزلت کسی عورت کے لیے آخر کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ، اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کہ ان تمام بیویوں نے بھرپور کوشش کی ہو گی اور عائشہ کے بارے میں تو یہ کہ انہوں نے اپنے تیئں ہر ممکن سعی کر لی ہو گی کیونکہ وہ محمد ﷺ کے بعد ہمیشہ لاولد رہنے والی تھیں۔

عائشہ، محمد ﷺ کی تمام بیویوں میں سب سے کم عمر، شوخ اور ان کی پسندیدہ تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ تب اور آج بھی ان کا معاملہ خاصا نزاعی ہے۔ عائشہ کا ایک دکھ یہ بھی تھا کہ وہ کبھی ماں نہیں بن پائیں۔ دوسری بیویوں کی طرح انہوں نے بھی کوشش کی ہو گی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ شاید، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ اب بھی خدیجہ کی یاد سے جڑے تھے۔ خدیجہ کے ساتھ ان کا ساتھ تقریباً چوبیس سال پر محیط ہے اور ان کی مثال آپؐ کے لیے ایک قطب ستارے کی سی تھی۔ یہ خدیجہ ہی تو تھیں جنھوں نے پہلی وحی نازل ہونے کی رات محمد ﷺ کو سہارا دیا تھا۔ گود میں ساری رات ان کا سر رکھے تسلی اور دلاسا دیتی رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ انہیں یقین دلایا تھا کہ صرف محمد ﷺ ہی نہیں، وہ بھی پر امید ہیں کہ آپؐ خدا کے چنے ہوئے، رسول ہیں۔ شاید، محمد ﷺ کے خاندان میں یہ اعزاز صرف خدیجہ کے پاس باقی رہنا طے تھا کہ وہ ہمیشہ ہی 'شاہ مادر'، ان کے گھر کی مثال 'سردار عورت' رہیں۔ ان کی نسل بھی انہی کی اولاد سے پھلے پھولے گی، کیونکہ صرف ان کی ہی بیٹی فاطمہ بعد ازاں محمد ﷺ کے چہیتے نواسوں حسن اور حسین علیہ السلام کی

ماں ہوں گی۔

محمد ﷺ کی بابت یہ کہ انہی کی تولیدی ذرخیزی پر کوئی سوال نہیں ہے۔ان کی خدیجہ کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد اس کا واضح ثبوت ہے۔اسی طرح، بعد کی بیویوں پر بھی کوئی سوال نہیں کہ سابقہ شوہروں سے تقریباً سب کے یہاں اولاد پیدا ہوئی تھی۔ شاید، کثیر ازدواج کے سبب محمد ﷺ نے غیر متاہل رہنے کا فیصلہ کر رکھا ہو۔ یا، جیسے آنے والی کئی صدیوں میں سنی عالمین کا اصرار ہو گا کہ محمد ﷺ کے یہاں نرینہ اولاد کا نہ ہونا، دراصل وحی کی قیمت ہے۔قران خدا کا حتمی بیان ہے،اس کے بعد کوئی وحی نازل نہیں ہو گی۔ اسی طرح محمد ﷺ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور ان کا کوئی بھی قریبی عزیز، چاہے وہ ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو،اس قابل نہیں تھی کہ نبوت کا بھار اٹھا سکے،اس کو آگے بڑھا سکے جیسے کہ شیعہ کا خیال تھا کہ یہ عین ممکن ہے۔ بہر حال، سنی کہا کریں گے کہ یہی وجہ ہے کہ محمد ﷺ کی اولاد نرینہ، یعنی بیٹوں کا شیر خواری میں ہی چل بسنا قضائے الٰہی ہے کیونکہ وہ تادیر زندہ رہ کر پیغمبر کی نسل آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔

خیر، قصہ مختصر یہ کہ بعد کی تمام شادیوں سے محمد ﷺ کے یہاں اولاد نرینہ پیدا نہیں ہوئی اور آج جب وہ شدید بیمار تھے، جانشینی کا مسئلہ درپیش تھا۔

محمد ﷺ نے اپنی منشاء بتا دی تھی جو ایک لحاظ سے کہیے تو خدا کی مرضی تھی۔ وہ مرضی انہوں نے طویل جدوجہد کے بعد پورے جزیرہ عرب میں چلادی تھی۔ جبرائیل کے ہاتھوں پہلی وحی کے بعد صرف دو دہائیوں میں انہوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ پہلی وحی نازل ہوئی تو فرشتے نے حکم دیا تھا، 'پڑھو!' اور یوں قران کی پہلی آیات 'اقراء' کے نام سے الہام کی صورت آن موجود تھیں۔اس کے بعد، ایک وقفہ ہوا تھا اور پھر تواتر سے الہامی کلام نازل ہوتا رہا۔ یہ ایسی شیریں زباں تھی جو اس سے پہلے کسی نے سنی اور نہ ہی پڑھی تھی۔ جو سنتا، دم بخود رہ جاتا۔اس قدر فصیح اور صاف کہ لوگ سنتے ہی جان لیتے کہ یہ خدائے ذوالجلال کی زبان ہے۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی اونٹوں کی رکھوالی پر مامور اور اب ایک آڑھتی، آخر اس قدر خوبصورت زبان میں یہ کلام بنانے کے قابل، کیونکر ہو سکتا ہے؟ بالکل نہیں ہو سکتا۔ وہ بلا شبہ خدا کے رسول تھے جو خدا کی ہی زبان بول رہے تھے۔

چنانچہ، جب اسلام قصبوں، شہروں، نخلستانوں سے ہوتا ہوا صحرا کے خانہ بدوش قبائل میں بھی پھیل گیا تو اس کے ساتھ خوشحالی کا دور بھی آیا۔ اب خراج کی وصولی چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ امہ کی ملکیت میں مال خانے میں پہنچ کر تقسیم ہوتی رہتی۔ چنانچہ، اس طرح کی ریاست، جس کا کام فلاح تھا اور پھر دن بدن یہ پھیلتی ہی جا رہی تھی، اس کا اپنا مال خانہ تھا اور ملکیت میں باغات، زمینیں اور جائیدادیں تھیں، انتہائی ضروری ہو گیا کہ رہنما اپنی وصیت عیاں کر دے۔ وصیت یہ کہ وہ اپنے جانشین کو مقرر کرے یا کم از کم پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ایک ضابطہ کار واضح کر دے جس سے جانشین کی تقرری ممکن ہو سکے۔

محمد ﷺ اپنے بعد امت بارے کیا سوچتے تھے؟ یہ ایسا سوال ہے جو شیعہ اور سنی کی اس داستان میں اصل قضیے کی جڑ ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ جس طرح کا یہ سوال ہے، ہمیشہ بے جواب ہی رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ آپؐ کے بعد جو کچھ بھی ہوا، اس تمام قصے میں ہر شخص دعویدار رہا کہ وہ اور صرف وہی جانتا ہے کہ آخر پیغمبر کیا چاہتے تھے؟ حالانکہ، کسی جانشین کی واضح تقرری کے بغیر یہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ کوئی بھی شخص صاف صاف نہیں کہہ سکتا کہ محمد ﷺ کی مرضی کیا تھی۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، کسی بھی قسم کی دلیل پیش کر دے، ہمیشہ ہی شک کا عنصر باقی رہے گا۔ یہی نہیں، اس ضمن میں کوئی بھی دلیل ہو، چاہے وہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، کسی دوسری دلیل سے اگر رد نہ بھی کر سکے، شبہ میں ضرور مبتلا کر سکتی ہے۔ یوں، اس معاملے میں قطعیت، حقائق کی بجائے ایمان کا معاملہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یہ تو طے ہے کہ محمد ﷺ جانتے تھے کہ وہ تا دیر زندہ نہیں رہیں گے، لیکن اتنے جلدی صحت جواب دے جائے گی، اس کا انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بارے کسی بھی طرح سے ہمیشگی یا ابدیت کا مخمصہ نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ بیماری سے قبل تک خاصی بہتر حالت میں تھے، چال ڈھال سے لگتا کہ پوری طرح تندرست اور توانا ہیں۔ جسامت ویسے ہی مضبوط اور بھاری بھر کم، سر کے بال بھی تقریباً سیاہ تھے، صرف قریب سے دیکھنے پر نظر آتا کہ کہیں کہیں چاندی اتر آئی ہے۔ لیکن، ان کی زندگی پر ہوئے تین قاتلانہ حملوں کے بعد وہ اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ زندگی ابد نہیں اور خود ان کی اپنی زندگی تو کئی خطرات سے دوچار ہے۔ دوسری طرف، یہ بھی ہے کہ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد آپؐ کی حالت بھی وہی رہی ہو

گی جیسے مثال کہا جاتا ہے کہ اس سے زندگی کو ایک نئی قوت مل جاتی ہے۔ ویسے بھی، قاتلانہ حملوں اور جنگوں میں سخت حالات کا نتیجہ ہمیشہ ہی اسلام کے حق میں نکلا تھا، محمد ﷺ نے ان مواقع کو اپنی تحریک کے حق میں بھرپور استعمال کیا تھا اور چند مواقع تو ایسے تھے جن میں اسی وجہ سے بازی پلٹ گئی تھی۔

یہ صرف دس سال پہلے کی ہی تو بات تھی جب ان کی تعلیمات کو اپنے آبائی شہر مکہ کی اشرافیہ سے شدید خطرات لاحق تھے۔ ان کا پیغام بنیادی نوعیت کا تھا، جس کی جڑیں واحدانیت کی قدیم روایت سے ملتی تھیں۔ اس تحریک کا اصل نشانہ شہری زندگی بسر کرنے والے امراء اور اشرافیہ کی لوٹ مار اور ناانصافی تھا۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ ساتویں صدی عرب میں معاشرہ خانہ بدوش ہوا کرتا تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شہروں اور قصبات میں بستے لوگوں کو کئی نسلیں گزر چکی تھیں۔ اگرچہ سماجی شناخت ابھی تک قبائلی ہی تھی، لیکن معاشرے میں حیثیت اور رتبے کا تعین ہی نامی گرامی قبائل سے تعلق کی بناء پر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت عرب میں قریش سے زیادہ قابل عزت، دولت مند اور طاقتور قبیلہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ مکہ کا یہی قبیلہ دراصل شہری اشرافیہ اور امراء کا نمائندہ بھی ہوا کرتا تھا۔

قریش تجارت کیا کرتے تھے اور ان کا شہر شمال اور جنوب میں واقع تجارتی راہداری کا مرکزی نقطہ ہوا کرتا تھا۔ یہ راہداری مغربی عرب کے طول میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ کہ مکہ شہر کی اس راہداری پر ایک مرکزی حیثیت جغرافیائی لحاظ سے تھی۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کی ایک نسبت تھی۔ یہ نسبت اس شہر کی کعبہ کے سبب حرمت تھی۔ کعبہ، جو چوکور شکل کی ایک کوٹھی تھی، جس کے گرد کئی خدائی اوتار جمع کیے گئے تھے۔ یہ اوتار اور نشانیاں عرب کے قبائل کی خدائی نمائندگی کرتے تھے اور انہیں مقدس حیثیت حاصل تھی۔ ان میں سے اکثر کے بارے مشہور تھا کہ وہ ایک برتر ذات، جسے تب بھی عرب 'الہ' یا 'اللہ' کہہ کر پکارتے تھے، اس کی اولاد تھی۔ یوں، تجارتی راہداری کا مرکز ہونے کے علاوہ مکہ زیارت کا بھی مرکز تھا۔ چونکہ یہ ایک مکرم اور محترم شہر تھا، اسی لیے اس کی حدود میں قتل و غارت، چوری چکاری اور فتنے کی ممانعت تھی۔ حرمت کے مہینوں میں تو بالکل ہی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پورے سال اور بالخصوص حرمت کے دنوں میں یہاں بڑے تجارتی میلے پورے انتظام اور تسلی، یعنی محفوظ ماحول میں منعقد

کیے جاتے تھے۔ یوں، تجارت اور زیارت مل کر خاصا منافع بخش کاروبار بن چکا تھا۔ قریش نے کمال ہوشیاری سے ایمان اور مالیات کو ایک دوسرے میں گڈ مڈ کر رکھا تھا۔ جیسے، وہ کعبہ تک رسائی کا خراج وصول کرتے تھے، تجارتی قافلوں پر ٹیکس لاگو تھے اور مکہ کی حدود میں کسی بھی طرح کے کاروبار پر محاصل وصول کیے جاتے تھے۔ اگرچہ، آمدن خاصی تھی لیکن دولت کی تقسیم میں خاصی جانبداری برتی جاتی تھی۔ روایتی طور پر قبائلی اصول تو یہ تھا کہ اس کا فائدہ سب تک پہنچنا چاہیے لیکن جوں جوں شہری زندگی پنپتی رہی، یہ روایات دم توڑتی گئیں۔ ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ ایک ہی قبیلے کے بعض گنے چنے کنبے اور خاندان تو خوب فائدہ اٹھاتے لیکن باقی لوگوں کو واجبی سا نفع ملتا۔ یہی پسماندہ اور پسے ہوئے لوگ تھے جن کے یہاں محمد ﷺ کے پیغام کو خوب پذیرائی ملی۔

غریب غرباء، یتیم، بیوائیں اور غلام۔۔۔ محمد ﷺ کی تعلیمات کے مطابق یہ سب بھی خدا کی نظر میں برابری کے حق دار تھے۔ چاہے کسی بھی قبیلے سے تعلق ہو، قبیلے کے نامی گرامی یا سب سے نچلے کنبے اور کنبے میں بھلے کوئی بھی خاندان ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کسی گروہ کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ خود کو دوسروں سے برتر جانے یا باقیوں کا حق غصب کر کے ترقی کرے۔ اسلام کا پیروکار ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی، منشاء اور خواہشات کو خدا کے لیے قربان کر دے اور اس کی نظر میں برابر ٹھہرے۔ پرانی چپقلشیں اور انقسام بھلا دے۔ تعلیمات زور دیتی تھیں کہ قبائلیوں کے بیچ کسی بھی قسم کی دوڑ، مقابلے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور امیروں کو غریبوں کا حق سلب کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اسلام کے مطابق، سب لوگ ایک ہیں، ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں اور انہیں ایک ہی سماجی رتبہ حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ، انہیں اس بات پر قائم رہنا تھا کہ برتر ذات صرف اور صرف خدا کی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

یہ مساوات کے عقیدے پر مبنی پیغام تھا جو اپنے زمانے کے لحاظ سے انقلابی کہلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کا پیغام اس سے پہلے فلسطین میں، پہلی صدی عیسوی میں ایک دوسرے پیغمبر نے بھی بلند کیا تھا۔ وہ لوگ جو شہر کی دولت اور اختیار پر قابض تھے، ان کے نزدیک یہ تعلیمات، توقع کے عین مطابق صریح بغاوت اور تخریبی ٹھہریں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس پیغام کا مقصد معاشرے میں توڑ پھوڑ اور سماج میں کجی کے سوا کچھ

نہیں۔ جبکہ، حقیقت میں یہ ان کے اختیار اور 'سٹیٹس کو' کو کھلا چیلنج تھا۔ پھر یہ ہوا کہ جب محمد ﷺ کے پیروکاروں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا تو مکہ کی اشرافیہ اس بابت واقعی متفکر ہو گئی۔ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے اور تحریک سے نبٹنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر لی۔ لیکن، جتنی وہ محمد ﷺ کو خاموش کرانے کی کوشش کرتے، ان کا پیغام اسی قدر تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہر حربہ استعمال کر لیا، بدگوئی سے لے کر بدنمائی، تذلیل اور یہاں تک کہ بائیکاٹ بھی کر کے دیکھ لیا، لیکن سب بے سود رہا۔ بالآخر، حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ مکہ کے نامی گرامی خاندانوں کے چنے ہوئے افراد، ایک گروہ کی شکل میں ان کے گھر کے باہر اسلحے سے لیس ہو کر جمع ہو گئے۔ وہ انتظار میں تھے کہ صبح عبادت کی غرض سے باہر نکلیں تو وہیں ان کا کام تمام کر دیں۔ لیکن، محمد ﷺ کو اس حملے کی بروقت اطلاع مل گئی تھی اور وہ رات کے اندھیرے میں ہی مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کا رخ شمال میں ایک نخلستان میں واقع شہر، مدینہ کی طرف تھا۔ یہاں ان کی آمد ایک معاہدے کے تحت ہوئی تھی، جس کے مطابق وہ ایک ثالث کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور بدلے میں ان کی اور مہاجرین کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ جس برس یہ ہجرت ہوئی، تب ہی اسلامی کلینڈر ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ عیسوی کلینڈر میں 622ء کا سال تھا۔

محمد ﷺ کی سربراہی میں نخلستان کا یہ شہر جلد ہی عرب کا سیاسی مرکز بن گیا۔ جس سے، جنوب میں واقع مکہ کی قدیم مرکزی حیثیت گہنا کر رہ گئی۔ یوں، جلد ہی دونوں شہروں کے بیچ ان بن شروع ہو گئی جس کا نتیجہ تین بڑی جنگوں اور لاتعداد جھڑپوں کی صورت بر آمد ہوا۔ لیکن، بالآخر، محمد ﷺ کو مکہ سے شہر بدر کرنے کے آٹھ سال بعد فتح مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ مکہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس موقع کو 'فتح' کا نام دیا گیا، جس کے اصل معنی 'توسیع یا کشائش' کے ہیں، یعنی، اب یہ واقعی آزاد ہو گیا اور 'آباؤ اجداد کے طریق' کی بجائے 'واحدانیت' کے قدیم تصور سے ایک بار پھر جڑ گیا۔ کعبہ کو مکمل طور پر ایک خدا سے منسوب کر دیا گیا اور محمد ﷺ نے اپنے دائرہ اختیار میں اپنے پیغام، یعنی اتحاد اور یگانگت، برابری کو فروغ دیتے ہوئے پرانی تمام رنجشیں بھلا کر مکہ کی اشرافیہ کو معاف کر دیا۔ یہی نہیں، انہیں اس نئی ریاست کے انتظام و انصرام، قیادت میں کلیدی کردار بھی دے دیا۔

لیکن وائے افسوس، ایسا ہوتا ہے کہ اکثر دوست، دیرینہ دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ محمد ﷺ اچھی طرح جانتے تھے کہ نقصان صرف دشمن ہی نہیں پہنچاتے۔ ضرورت پڑے تو وہ جو انتہائی قریب ہیں، وہ بھی تل سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی، پوری دنیا میں یہی مشہور تھا کہ اختیار اور اقتدار کی منزل پانا خاصے جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی، اس کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رہنمائی کا طرہ ہونا ضروری تھا۔ ایسے حالات میں، اکثر رہنما، اپنا جانشین مقرر کرنے سے کترایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بھلے کوئی کس قدر بھی بھروسا مند ساتھی ہو، چاہے جتنا بھی اعتماد کرلو، بالآخر وہ یا اس کے حامی چاہتے تھے کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے۔ یعنی، معاملات کو قدرتی طریقے سے، اپنے وقت کے مطابق پورا ہونے کی بجائے مصنوعی طریقے سے منطقی انجام تک پہنچانے کو کوششیں شروع ہو جاتیں۔ شہد میں گھول کر یا دنبے کی بھنی ہوئی لذیذ بوٹیوں میں ایک چٹکی زہر شامل کرنا کونسا مشکل کام ہوتا؟ تب بھی، یہ حربے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلکہ، اسلامی تاریخ میں بھی یہ چیزیں بہت جلد عام ہو جائیں گی۔

یہ تو ایک رخ ہے۔ قوی امکان یہ ہے کہ محمد ﷺ نے اس لیے جانشین مقرر نہیں کیا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس لمحے انہوں نے رسمی طور پر قائم مقام یا وارث نامزد کر دیا، وہ اسی دن سے اپنے ہاتھوں امہ میں تقسیم کا بیج بو دیں گے، یا شاید وہ اس انقسام کو بڑھوتری کا باعث بن جائیں، جو پہلے سے موجود تھی؟ وہ کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی، اپنے دیرینہ دشمنوں کو خون بھی معاف کر دیے اور اتحاد اور یگانگت کی غرض سے ہر طرح کا سامان کر لیا تھا، اب آخر وقت میں وہ ان کے اپنے ہاتھوں تال ترغہ ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح ان کے ارد گرد، دوستوں اور مشیران میں حسد اور جلن کا عنصر پیدا ہو جائے گا اور وہ لوگ جو ان کے بھروسا مند ساتھی تھے، ان کی آنکھوں کے سامنے اپنا اثر قائم کرنے اور اختیار حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ حالانکہ محمد ﷺ خود ایک کرشماتی شخصیت کے مالک تھے، بلکہ پیغمبر تھے لیکن جب معاملہ ریاست کے اختیار کا آجائے تو پھر انہیں پتہ تھا کہ ارد گرد لوگ، کچھ بھی کر گزریں گے۔ ایک ذرا لحاظ نہیں کریں گے، کیونکہ وہ انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ تاہم، اس ضمن میں، یعنی اپنے حامیوں اور رفقاء کو جس

قدر اس بابت وہ ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتے، ان میں عدم اعتماد اور تفاوت کی کمی روز بروز بڑھتی ہی دکھائی دے رہی تھی اور اب جب کہ محمد ﷺ ایک مریض کمرے تک محدود ہو گئے تھے، یہ نفاق صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ اب لوگ گروہوں میں بٹ جائیں گے، دھڑے بازی شروع ہو گی اور ہر نئے دن کے ساتھ بحث میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ان کی پوری زندگی کی محنت داؤ پر لگ جائے گی۔ لوگوں کو جوڑے رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی جان بھی کئی بار خطرے میں ڈالی، تمام عمر کا حاصل ہو سکتا تھا کہ، کھو جائے۔ شاید، ایسا ہونا اٹل تھا لیکن محمد ﷺ کا معاملہ یہ رہا ہو گا کہ وہ یقیناً اس اسقاط کی ابتداء اپنے ہاتھوں سے نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ انہوں نے تو قبائل کے بیچ ایک عرصے سے جاری چپقلش ختم کی تھی۔ بے اختیار اور پسے ہوئے طبقات کو آواز، طاقت دی تھی۔ مکہ کی حکومت امراء کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ لادینی کو حتمی طور پر نکال باہر کیا تھا اور جھوٹے خداؤں کو نیچا دکھا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تو دنیا کے ایک بڑے مذہب، بلکہ تیسرے بڑے توحیدی نظریے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ انہوں نے تو ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ اب، کیا وہ اسی مسئلے کو جو کبھی ناممکن ہوا کرتا تھا، اب دوبارہ اپنے ہاتھوں پنپنے دے سکتے تھے؟

تاریخ میں ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ بھانپ چکے تھے کہ ان کے بعد کیا ہونے جا رہا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کے آخری الفاظ یہ تھے، 'اے اللہ، میری امت پر رحم کر جو میرے بعد جانشین ہوں گے'۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ کسر نفسی اور انکسار کا مظاہرہ تھا؟ یا شاید یہ ایک خدا کے حضور گزارش تھی کہ وہ لوگوں کی مدد کرے؟ یا کیا محمد ﷺ، اپنے آخری دم پر، آنے والے وقت میں خون اور دکھ کی اس داستان کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے؟ یہ کیا تھا؟ ایسے معاملات میں قدیم عرب کہاوت میں کہا جاتا ہے کہ، 'خدا بہتر جانتا ہے'۔ اسی طرح ہمیں کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ الفاظ کا قضیہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہی تشریحات کے تابع ہوتے ہیں۔ تخیل، دوسری طرف ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد نہیں لیکن اس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ داستانیں گھڑنے والوں کے لیے کارآمد تو ہوتا ہے لیکن تاریخ میں اس کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہوتی۔ سچ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں تاریخ کے بنیادی حقائق پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور ان روایات کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ تاریخ کی ان

روایات کے کئی زاویے نکل آتے ہیں اور ہر شخص، اپنی مرضی اور غرض کے عین مطابق ان روایات کی ناک موم کی طرح اپنی من پسند اطراف میں موڑ سکتا ہے۔

سنی علماءاور سکالر آنے والی صدیوں میں اصرار کریں گے کہ محمد ﷺ کو اپنے پیروکاروں کی خیر خواہی اور شخصی سالمیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے اس معاملے میں ان پر ہی اعتبار کیا۔ صرف انہی پر نہیں بلکہ فیصلہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ انہیں یقین تھا کہ بالآخر ان کے دیرینہ رفقاء خدا کی مرضی کے عین مطابق، درست فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہی عالمین کے مطابق، محمد ﷺ کے نزدیک امہ کی حیثیت نہایت مقدس اور واجب التعظیم رہی تھی۔ مراد یہ ہے کہ امتی ہر صورت، اپنی راست بازی کی بنیاد پر، صداقت اور اجتماعیت کو فروغ دیتے ہوئے درست سمت میں قدم اٹھائیں گے۔ لیکن، دوسری طرف شیعہ کے علماء اور سکالروں کا خیال یہ ہے کہ محمد ﷺ نے بہت پہلے ہی اپنے انتہائی قریبی عزیز اور داماد، یعنی علی کو خدا کی مرضی کے عین مطابق جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں، آپؐ نے اس بات کا ایک سے زیادہ مواقع پر اور عوامی سطح پر اشارہ دیا تھا۔ مزید یہ کہ اگر علی کے مخالفین آخری وقت میں، جب محمد ﷺ بیماری کی حالت میں مسجد سے ملحق کمرے تک محدود تھے، ان کی وصیت لکھوانے کی کوشش کو سبوتاژ نہ کرتے تو یقیناً، ایک بار پھر، واضح طور پر وہ علی کو بطور جانشین مقرر کرنے والے تھے۔

محمد ﷺ کی زندگی کے آخری دس دنوں میں، وہ تمام لوگ جو آنے والے سالوں میں شیعہ اور سنی کی اس داستان میں کلیدی کردار ادا کریں گے، اس مریض کمرے میں ان کی آمد و رفت جاری رہی۔ ان اصحاب میں ایک عورت اور پانچ مرد شامل ہیں۔ ان میں سے ہر شخص آپؐ کا قریبی رشتہ دار یا رفیق ہے۔ اسی طرح، ان میں سے ہر ایک کی محمد ﷺ کے بعد جانشینی میں گہری دلچسپی ہے۔ مردوں میں محمد ﷺ کے دو سسر، دو داماد اور ایک برادر نسبتی شامل ہے۔ یہ پانچوں ہی ایک یا دوسری صورت، بالآخر محمد ﷺ کے بعد جانشین مقرر ہو کر رہیں گے۔ انہیں 'خلیفہ' یا 'محمد ﷺ کا جانشین' قرار دیا جاتا رہے گا۔ لیکن، سوال یہ تھا کہ آخر ان میں سے پہلے کون ہوگا؟ خلافت کے منصب کی حقداری کس ترتیب سے ہوگی؟ اور یہ سب کیونکر ہوگا؟ یہی اس داستان کی بنیاد ہے۔ آنے والے چودہ سو سالوں تک یہی قضیہ، جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے،

بالآخر گہرے نفاق اور تقسیم کا باعث بن جائے گا۔

ان اصحاب کے بیچ جو بھی اختلاف رہے ہوں، وہ اس چپقلش سے کہیں کم تھے جو اس کمرے میں عورت، یعنی محمد ﷺ کی سب سے کم عمر، پسندیدہ مگر لاولد بیوی عائشہ اور مردوں میں سب سے کم عمر، علی کے بیچ چلی آرہی تھی۔ علی، محمد ﷺ کے چچازاد تھے، تقریباً لے پالک اور داماد ہونے کے ناطے، ان کے سب سے قریبی مرد رشتہ دار تھے۔ یہ دونوں ہی، یعنی علی اور عائشہ محمد ﷺ کے انتہائی قریب تھے اور روزمرہ زندگی میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لیکن، باوجود آپؐ کے ساتھ انتہائی قربت کے، پچھلے کئی برسوں سے ان کے بیچ بات چیت بند تھی۔ یہاں تک کہ وہ محمد ﷺ کی موجودگی میں بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔

ان دونوں کے بیچ کشیدگی محمد ﷺ کی بیماری کے دوران بھی جاری رہی۔ مریض کمرے کی فضا جو پہلے ہی مقدور تھی، یقیناً مزید تناؤ کا شکار ہوگئی ہوگی۔ شاید، خود محمد ﷺ کو بھی اس وقت تک ادراک نہیں تھا کہ علی اور عائشہ کے بیچ جاری یہ چپقلش آگے چل کر اسلام کے مستقبل پر کس قدر گہرا اثر ڈالے گی۔ ویسے بھی، کون سوچ سکتا تھا کہ سات برس پہلے پیش آنے والا گمشدہ ہار کا واقعہ، جو تب خوش اسلوبی سے حل ہو چکا تھا، اب آنے والی صدیوں میں تقسیم اور نفاق کی بنیاد بن سکتا ہے؟

باب 2

یہ صرف ایک ہار نہیں تھا، اگرچہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ عام سا ہار تھا۔ یعنی، ایک ڈوری میں چند منکے پروئے ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ عقیق یا مرجان رہے ہوں گے، یا پھر شاید سمندر کی سیپیاں ہوں گی؟ عائشہ نے اس بابت کبھی ذکر نہیں کیا اور اگر کبھی کوئی استفسار کر بھی لیتا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیتیں، گویا یہ اہم نہیں تھا۔ غالباً، وہ ٹھیک تھیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہار کیسا تھا؟ یا کیا تھا؟ یا کھو کس مالیت کا تھا؟ یہ بس ایک ہار تھا جو لڑکیاں پہنا کرتی ہیں یا وہ پہننا چاہیں گی۔ لیکن، یہ صرف ایک ہار نہیں تھا۔ اس کی قیمت ہیروں اور موتیوں سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔ یہ ہار محمد ﷺ نے عائشہ کو شادی کے تحفہ میں دیا تھا۔

ہار کی گمشدگی اور اس واقعہ کے نتیجے میں پیش آنے والی فضیحت اور نالش کو 'گمشدہ ہار کا واقعہ' کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس زمانے میں یہ منہ در منہ چلنے والی ایسی کہانی ہے جو ہر زبان پر ایک یا دوسری دوسری صورت عام رہی۔ عام فہم میں یوں کہیے کہ بے تکلف داستانوں میں سے ایک تھی جیسی پرانے زمانے میں ہوا کرتی تھیں، لوگ اس کا تذکرہ کرتے اور بار بار، کئی مواقع پر ایک دوسرے کو سناتے۔ پھر تاریخ نے پلٹا کھایا اور چھپائی کے ساتھ پڑھنا لکھنا عام ہو گیا تو اب یہ داستانیں، صرف پڑھنے کو ملتی ہیں۔ قصہ خوانی کا بہر حال معاملہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو اپنی حیثیت اور موقع محل کی مناسبت سے بنا کر پیش کرتے ہیں، لطف لیتے ہیں اور بسا اوقات، اصل قصے کو توڑ مروڑ دیتے ہیں۔ 'گمشدہ ہار کا واقعہ' ہی نہیں بلکہ کئی دوسرے تاریخی واقعات جیسے 'اہل بیت کا چوغہ'، 'قلم اور کاغذ کا واقعہ'، 'اونٹ کی لڑائی'، 'خفیہ خط' اور 'چیخ و چنگھاڑ کی رات' وغیرہ اور کئی دوسری ایسی مثالیں ہیں جو اسلامی تاریخ کی بنیاد بن گئیں۔ یہ ایسی تاریخ ہے جو داستان کی شکل میں بیان کی گئی ہے۔ اس طرح کی بیان کردہ تواریخ کے ساتھ ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا آیا ہے کہ اس میں تفاصیل تو موجود ہیں لیکن بسا اوقات حقائق مسخ ہو جاتے ہیں اور ایک ہی واقعے کے کئی رخ، اقوال کے مفہوم اور افعال کی تشریحات عام مل جاتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے پہلے سو برس، یہ کہانیاں اور قصے صفحے پر نہیں بلکہ لوگوں کی زبانوں پر عام تھے۔ وہ یہ واقعات کچھ یوں سناتے کہ جیسے انہوں نے سن رکھے ہوتے تھے۔ ان سے پہلے سننے والوں نے دل اور دماغ حاضر کرکے، اپنے کانوں سے یہ قصے ان لوگوں سے سن رکھے تھے جن کے ساتھ یا سامنے یہ تاریخی واقعات پیش آئے۔ چنانچہ، سالہا سال کی اس مشق سے ان واقعات کی تفصیل ایک قصے کی شکل اختیار کر گئی، جس میں افسانوی رنگ واضح تھا۔ لوگوں کی یہی یادداشتیں، مورخین کے لیے تاریخ کو مرتب کرنے کا خام مال بن گئیں۔ یہ تاریخ دان مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں سفر کرتے اور لوگوں سے ان کی یاد میں محفوظ کہانیوں کو جمع کرتے رہتے۔ اس کام میں وہ خاصی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یعنی ہر بیان کو اچھی طرح ٹٹولتے، جانچ کرتے اور اس کے ساتھ قصہ سنانے والے کا نام اور ماخذ سمیت نہایت اہم تفصیلات کو بھی ساتھ رقم کرتے جاتے۔ اس طرح، ہر روایت کی تہہ تک پہنچنے کو ممکن بنانے کی کوشش کرتے۔ اس مشقت کو 'اسناد' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب کسی بھی نسخے کے اصل ماخذ کا قرار واقعی معلومہ کا تعین کرنا ہے یا اس کی تصدیق مراد ہے۔ اس کام کو روایت بیان کرنے والے سے یوں منسوب کیا گیا ہے کہ مثلاً، "مجھے 'الف' نے بتایا، جس کو 'ب' نے بتایا تھا، خود 'ب' کو 'ج' نے یہ واقعہ سنایا تھا جو اس وقت وہیں موقع پر موجود تھا، جب یہ واقعہ پیش آیا یا بات کہی گئی"۔

ابن اسحاق کی لکھی، محمد ﷺ کی سوانح حیات، 'سیرت رسول'، ابو جعفر الطبری کی پر شکوہ 'تاریخ اسلام جس کی کل جلدیں انتالیس ہیں، ابن سعد کی جمع کردہ یادداشتوں کے مجموعے جن میں اکثر مزے دار واقعات بیان کیے گئے ہیں اور البلازری کی 'انساب الاشراف' جو عربوں کی تاریخ ہے، ان تمام نسخوں میں یہ طریقہ، یعنی 'اسناد' عام ملتا ہے۔ یہ ایک طرح سے بے مثال اور بیان کرنے کا نہایت عمدہ طریقہ کار ہے جس سے ہمیں نہ صرف تاریخ کے کونوں کھدروں میں بھی جھانکنے کا اچھی طرح موقع ملتا ہے بلکہ یوں ایک ربط بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان مورخین کا یہ طریقہ کار تاریخی واقعات اور حالات کو مرتب کرنے کا ایک انتہائی موثر طریقہ ہے۔ اسے ادب کی زبان میں 'راشومونی تاثیر' یا 'راشومون کا طریقہ' کہا جاتا ہے، جس کے تحت ایک واقعہ کے کئی رخ واضح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یوں کہ اگر ایک ہی واقعہ کے چھ عینی شاہد ہوں تو ان کے بیان کو علیحدہ علیحدہ جمع ریکارڈ کرنے سے ہمیں معمولی فرق کے ساتھ چھ مختلف بیانات مل جاتے

ہیں، جنہیں ہم جمع کر کے ایک ہی واضح روایت بنا سکتے ہیں۔ یوں، تاریخ صرف ایک یادداشخاص کا بیان، یا کہیے دوسری صورت میں صرف چند لوگوں یا خود مورخ کے ذاتی احساسات و خیالات سے آلودہ نہیں ہو پاتے۔

الطبری خود سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی مرتب کردہ تاریخ شیعہ اور سنی، دونوں میں ہی مقبول ہے۔ دونوں ہی گروہ ان کی تصنیف و تالیف کو مستند جانتے ہیں۔ پھر، جس قدر تفصیل اور گہرائی سے کام لیا گیا ہے، وہ علیحدہ سند ہے۔ وہ ایک ہی واقعے، موقعے یا معاملے کا بار بار پیچھا کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو ایسے لگتا ہے کہ معاملات ان کے حواس پر چھا گئے ہیں۔ ان تفاصیل میں بیسیوں لوگ اپنی سمجھ اور یاد داشت کے مطابق بیان دیتے نظر آتے ہیں اور یوں ان تاریخی واقعات کی ایک ایسی شکل ابھر کر سامنے آتی ہے کہ پڑھنے والا پوری طرح معاملے کی طے تک پہنچ جاتا ہے۔ الطبری کا یہ طریق، حیران کن طور پر آج بھی مابعد جدیدیت کی انتہائی عمدہ شکل نظر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جدید رجحانات کو رد کرتے ہوئے، سابقہ روایات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ سادہ الفاظ میں، اپنے زمانے کے لحاظ سے حقائق کی جانچ اور پرکھ کا انتہائی کار آمد اور قابل اعتبار طریقہ تھا۔ یہی نہیں، الطبری کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ انسانی سچ، ہمیشہ ہی نقائص سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے کئی رخ ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ حقیقت کی کئی اشکال ہوتی ہیں اور ہر شخص اس ضمن میں مختلف رائے رکھتا ہے اور حقائق کو بیان کرنے یا انہیں سمجھنے اور سمجھانے میں کسی نہ کسی سطح پر بالضرور ہی جانبدار ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی بھی معاملے میں، معروضیت یا اصلیت کے جس قدر ممکن ہو، قریب پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور یہی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الطبری کئی اختلافی معاملات میں جب اپنی پوری سعی کر چکتے ہیں تو آخر میں تصفیہ بیان کرتے ہوئے ساتھ 'صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے'، ٹانک دیتے ہیں۔ یعنی، اس سے آگے، انسانی سطح پر سچ کی جانچ ممکن نہیں رہتی۔

ساتویں صدی عیسوی سے آتی یہ آوازیں، جو ہم تک اوائل دور کی تواریخ کے ذریعے پہنچی ہیں، پڑھنا شروع کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ کسی انگوری بیل کے گھنے جنگل میں بیٹھے ہیں اور چہار طرف

علم و عرفان کے خوشے بکھرے ہیں اور بس ہاتھ بڑھاؤ اور توڑ کر کھانا شروع کر دو۔ روایات کے یہ مجموعے اس قدر دلچسپ ہیں کہ پڑھتے ہوئے زمان و مکان کا فرق مٹ جاتا ہے اور ہم اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے، اس دور کی یاد کو ایسے تازہ کر دیتے ہیں جیسے خود وہاں موجود ہوں۔ بیان ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی کھو کر رہ جاتا ہے۔ انہوں نے کیا دیکھا انہوں نے کیا سنا، اس نے کیا کہا اور اس نے کیا جواب دیا۔۔۔ تفاصیل اس قدر واضح ہیں کہ جا بجا زبان انتہائی پر مغز ہوتی جاتی ہے۔ یہ تاریخ دانی کا اس قدر عمدہ نمونہ ہیں کہ مروجہ اصولوں کے مطابق، روایتی مورخین سے اس طرح کے کام کی عام طور پر توقع نہیں ہوتی۔ ان تواریخ میں زبان و بیان کے ساتھ سچائی کی چاشنی ہے۔ حقیقی لوگوں کے احوال ہیں جنہوں نے نہایت پر فتن دور میں زندگیاں بیتائی ہیں۔ پھر، تہذیب اور تمدن کا بھی پوری طرح دھیان رکھا گیا ہے اور یوں ہمیں ایسی واضح تاریخ مل جاتی ہے جس میں اس زمانے میں استعمال ہونے والی ہر طرح کی زبان، چاہے وہ کوسنے اور پھٹکار ہوں یا دعا اور خوش بیانی ہو، انتہائی بے تکلف انداز میں پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر یہ تواریخ ہر شخص چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، شیعہ یا سنی۔۔۔ سب کے لیے قابل قبول تو ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات میں یہی کوسنے اور خوش بیانی، حالات و واقعات کی روح کو بیان کرتے ہیں۔

ہار، مدینہ سے باہر ایک دن کی مسافت کے فاصلے پر گم ہوا۔ ماجرا یہ تھا کہ یہ محمد ﷺ کی عرب قبائل کو ایک ہی جھنڈے تلے یکجا کرے کی زور و شور سے جاری تحریک کی ایک مہم سے واپسی کا سفر تھا۔ اس طرح کی کئی مہمات ہوئیں، جو دنوں، ہفتوں اور اکثر مہینوں تک جاری رہتیں۔ اس طرح کے سفر پر محمد ﷺ ہمیشہ ہی اپنے ساتھ اپنی کسی نہ کسی بیوی کو ہمراہ رکھتے۔ عام طور پر عائشہ ان مہمات پر ساتھ جانے کے لیے ہمیشہ ہی تیار رہتیں اور انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتیں۔

ایسا ہونا قدرتی بھی تھا۔ عائشہ چونکہ ایک نو عمر شہری لڑکی تھیں، جو خوش باش اور تیز طرار بھی تھیں، ان کے لیے مضافات اور صحرائی دیہاتوں میں سفر پر جوش اور ہیجان خیز تجربہ رہا کرتا ہوگا۔ اگرچہ مدینہ ابھی تک ویسا شہر نہیں تھا جیسا کہ ہم آج شہری علاقوں کا تصور رکھتے ہیں، یہ اس وقت تک کئی قبائلی دیہاتوں کے

جمع ہو کر قصبے کا منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن، ہر گاؤں کی اپنی حدود اور حفاظتی فصیلیں ہوا کرتی تھیں۔ مدینہ ایک نخلستان تھا اور اس کے بیچوں بیچ بسے ہوئے فصیل دار گاؤں، ایک طرح سے کہیے تو خانہ بدوش صحرائیوں کے لیے شہر کا ہی درجہ رکھتا تھا اور اس کے زیادہ تر باسی صحرائی زندگی سے متعلق، مالیخولیا، یعنی ماضی کی یاد کو تازہ کرتے رہتے۔ صحرا کی زندگی میں سادگی ہوتی ہے، لوگ مخلص اور اصیل ہوتے ہیں۔ ان خصوصیات کو طویل نظموں میں سراہا جاتا۔ لیکن ساتھ ہی، یہ زندگی خاصی مشکل اور جفاکشی کی متقاضی بھی ہوتی ہے تو اس سختی کو صحرا کے باسیوں کی روحانیت پسندی، شرافت، جرات اور بہادری کی داستانوں میں خاص طور پر یاد کیا جاتا۔ کہا جاتا کہ یہ خاصیت اب شہری زندگی میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

عائشہ کے لیے ان مہمات کا حصہ ہونے میں خاصا رومان رہا کرتا ہو گا۔ مدینہ کے سرسبز نخلستان سے نکل کر خشک اور بیابان پہاڑوں میں ناہموار راستوں پر گزر، یہ پہاڑ مدینہ اور وسطی اور شمالی عرب کے لق ودق صحرا کے بیچ حائل رہتے۔ انہیں حجاز کہا جاتا، جس کا عربی میں مطلب رکاوٹ کے ہیں۔ ان پہاڑوں کے اس پار سات سو میل طویل صحرا کے بارانی میدان تھے جس کی دوسری حد پر دریائی علاقے تھے، جسے عراق کہتے ہیں۔ عراق، فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی نشیب کے ہیں۔

عائشہ کے لیے صحرا کی افسانوی بے آلائشی اور لطافت کو کھوجنے کا یہی موقع تھا۔ یقیناً، وہ ان سفروں سے بھرپور انداز میں محظوظ ہوتی ہوں گی۔ راستہ دکھانے والے کھوجی، ان کی مہارت قابل داد تھی۔ انہیں صحرا کی ہر چیز بارے خبر تھی۔ چشمے کہاں واقع ہیں، کتنی گہرائی میں پانی نکلے گا، کس چٹان کے پیچھے ٹھنڈا پانی ہے، کنوئیں کتنی دور ہیں اور کسی بھی موسم میں صحرا کی ترائیاں کس جگہ مل جائیں گی، جن میں بارش کا پانی ابھی بھی موجود ہو سکتا ہے؟ انہیں کسی قطب نما کی ضرورت تھی اور نہ ہی ان کے پاس نقشے ہوا کرتے تھے، لیکن پھر بھی وہ صحرا کے چپے چپے سے واقف تھے۔ زمین کا نقشہ اور طور ان کے ذہنوں پر نقش تھا۔ یہ کھوجی واقعی صحرا کے رازدان تھے۔

اونٹ پر لدی کاٹھی پر جمی پالکی میں بیٹھے، بلندی سے کیا عمدہ منظر آنکھوں کے سامنے رہتے ہوں گے؟ جہاں تک نظر جاتی ہو گی وہ شمال کے میدانی علاقوں میں، جہاں گھاس بکثرت ہوا کرتی تھی، اونٹ اور

گھوڑوں کے جتھے ہی جتھے دیکھتی ہوں گی۔ خیبر اور فدک کے نخلستان صحرا میں یوں لگتے ہوں گے جیسے خشک و بیابان وادیوں کے گھیرے میں سبز دمکتے ہوئے زمرد کے قیمتی پتھر ہوں۔ پھر یہاں کانوں سے سونا اور چاندی بھی نکلتا تھا، جو حجاز کی آمدن کا ایک بڑا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ بدو قبائل، جو فطرتاً خانہ بدوش اور سخت جان ہیں، جابجا ان کی بستیاں ہوں گی۔ ان قبائل سے تعلق رکھنے والے اونچے قد کے انتہائی مضبوط اور نک چڑھے جنگجو۔۔۔ یہ سب مناظر، کسی بھی شہری لڑکی کے لیے خاصے مسحور کن ہو سکتے ہیں۔ پھر، قبائل کے ساتھ کئی گھنٹے طویل مذاکرات جس محمد ﷺ اور اسلام کو ماننے سے انکاری ہوتے۔ امید یہ ہوتی کہ بالآخر پر امن نتائج برآمد ہوں گے، مگر وہیں یہ دھڑکا بھی لگا رہتا کہ بات ابھی بگڑی یا تب بگڑے گی۔ بات بگڑ گئی تو پھر مذاکرات منقطع ہو جائیں گے اور یوں فیصلہ بات چیت سے نکل کر تلوار کے ہاتھوں میں رہ جائے گا۔ مردوں کی آوازیں اونچی ہوتی جاتیں اور نتھنے پھولنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تلواروں کی ٹھن ٹھناہٹ، چیخ و پکار اور پھر خون کی بو پھیل جاتی۔

یہی مہمات تھیں، جن کے دوران عائشہ کو لڑائی کے بیچ رہ کر جنگ جدل اور خون ریزی کو آنکھوں کے سامنے برداشت کرنے کا تجربہ ملا۔ انہی مواقع پر عورتوں کے قدیم کردار، یعنی جنگجوؤں کو چیخ چیخ کر آگے بڑھنے اور لڑنے مرنے پر آمادہ رکھنے کا طریقہ سیکھنے کا موقع ملا۔ ساتویں صدی عرب کی عورتیں مثال جیسے آج کہا جاتا ہے، بنفشہ کا پھول نہیں ہوا کرتی تھیں جو سہمی اور سمٹی ہوئی رہا کرتی ہوں۔ بالخصوص عائشہ تو ایسی ہرگز نہیں تھیں، وہ بے باک، زبان کی تیز اور حاضر جواب تھیں۔ گھمسان کی جنگ میں، میدان کے وسط میں جم کر کھڑے رہتے ہوئے دشمن کو برا بھلا کہنے کی ہمت تھی، اپنے جنگجوؤں کو سراہنا جانتی تھیں اور مردوں کے لڑ کر مر جانے کے فن سے بخوبی واقف تھیں۔ کئی سالوں بعد وہ یہی کام انتہائی مہارت سے سر انجام دیں گی، جب ان کی سپہ سالاری میں لشکر علی کی فوجوں سے بھڑ رہا ہو گا۔ ان کی فوج کے سپاہی، قدموں میں کٹ کر مرتے جائیں گے لیکن وہ پیچھے ہٹنے پر راضی نہ ہوں گی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کی دشنام طرازی اور لعنت ملامت ہر لحاظ سے مخالفین کے حوصلے پست کرنے کے قابل تھی۔ وہ اس طرح ان کے چھکے چھڑا دیتیں، انتہائی تیز اور بلند بانگ انداز میں، بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ بھیانک اور دہشت پیدا کرنے کے انداز میں تقریر کرتیں۔ ان مواقع پر ان کی آواز انتہائی تیز، کانوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی

جو بلاشبہ عائشہ کی جوانمرد شخصیت کا خاصہ تھی۔ لیکن، اب ان کی یہی زبان درازی اور فہم فراست، انہیں دھوکہ دے گی۔

ہوا یہ کہ کامیاب مہم کے بعد، محمد ﷺ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ ابھی رات کی تاریکی تھی، جب انہوں نے خیمے اکھاڑنے شروع کر دیے۔ سورج چڑھنے سے صحرا تپ جاتا اور مشکل ہوتی، اس لیے ارادہ یہ تھا کہ صبح کے خنک موسم میں جس قدر ممکن ہو، سفر مکمل کر لیا جائے۔ ابھی منہ اندھیرا تھا، عائشہ قافلے کے خیموں سے نکل کر تقریباً سو گز دور، جھاڑیوں میں رفع حاجت کے لیے گئیں۔ آج بھی دنیا میں کئی جگہوں پر، جنگل بیلوں میں لوگوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ خیر، وہ واپس آکر اپنے اونٹ کی پالکی میں بیٹھ گئیں، قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھی ہی تھیں کہ انہیں محسوس ہوا کہ شاید کچھ کھو گیا ہے۔ انہوں نے ٹٹولا تو ان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ایک دم جیسے کسی خاص چیز کے گم ہو جانے پر ہوتا ہے، وہ بوکھلا سی گئیں۔ ان کا ہار، جو محمد ﷺ نے انہیں شادی کے موقع پر تحفے میں دیا تھا، غائب تھا۔

جس قدر پھرتی عائشہ نے دکھائی تھی، انہیں منکے تلاشتے اتنی ہی دیر لگ گئی۔ ظاہر ہے، صبح پو پھوٹنے سے پہلے کے اندھیرے میں، جھاڑیاں ایک سی ہی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر جب مطلوبہ جگہ پر پہنچ بھی گئیں تو جھاڑ پھونس تلے، ریت میں ایک ایک موتی تلاشنا جھنجھلا دینے کو کافی تھا۔ خیر، جب وہ جھاڑ اکھاڑتیں، ریت میں ٹٹولتیں، انگلیوں کو زخمی کر بیٹھیں تو منکے پورے ہو گئے۔ فوراً ڈوری میں پروئے اور واپس ہو لیں۔ لیکن کیا دیکھتی ہیں کہ قافلے کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ چکے تھے اور عائشہ صحرا کے وسط میں تن تنہا، پیچھے رہ گئی تھیں۔

ایسا کیونکر ہوا، یہ سمجھ میں آتا ہے۔ ان کی خادمہ، جو کہ ایتھوپیائی باندی تھی، اس نے عائشہ کو اونٹ کی پالکی میں سوار ہوتے تو دیکھا لیکن جب وہ ہار ڈھونڈنے نکلیں تو کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔ سب نے یہی سمجھا کہ عائشہ پالکی کے اندر ہیں کیونکہ، پردہ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب باقی ماندہ سفر میں، کسی طور بھی یہاں کسی کو مخل ہونا نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اسی گماں میں کہ وہ موجود ہیں، قافلہ ان کے بغیر ہی روانہ ہو گیا۔ یہاں تک تو سمجھ میں آتا ہے۔ جو زیادہ تر لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے، وہ اس کے بعد واقعہ ہوا، یا کہیے، جو واقعہ

نہیں ہوا۔

عائشہ نے قافلے کو نہ پا کر، اس کے پیچھے دوڑ نہیں لگائی۔ اگرچہ، راستہ واضح تھا اور صحرا میں ان کے لاپتہ ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ حتی کہ وہ پیدل بھی روانہ نہیں ہوئیں، حالانکہ یہ اتنی دور بھی نہیں پہنچا ہو گا۔ مال سے لدے اونٹوں کے قافلے خاصے سست رفتار ہوا کرتے ہیں، اگر وہ چاہتیں تو گھنٹے بھر کے اندر، صبح سویرے کی خنکی میں ہی جا لیتیں۔

بجائے، خود ان کے الفاظ یہ ہیں کہ، 'میں نے خود کو چادر میں لپیٹ لیا اور وہیں لیٹ گئی جہاں سے قافلہ نکلا تھا۔ میں جانتی تھی کہ جب وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں پائیں گے تو ضرور ہی ڈھونڈتے ہوئے یہاں واپس آئیں گے'۔

عائشہ کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ کسی نے بھی قافلے میں ان کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ ان کے خیال میں، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ انہیں غائب پاتے اور پھر بھی سفر جاری رکھتے۔ یقیناً، فی الفور قافلہ رک جاتا اور لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ آتے۔ وہ کوئی عام عورت نہیں تھیں، پیغمبر کی بیوی تھیں اور اس لحاظ سے انہیں خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ یوں، قافلے کے پیچھے دوڑ لگانا، انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔ کسی بدو لڑکی کی طرح، اونٹوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی وہ کیسی لگتیں؟ ویسے بھی، عائشہ نے تمام عمر اپنے لیے ایک امتیازی حیثیت اور رتبے پر زور دیا۔ دوسروں سے ممتاز رہنے کی یہ عادت ہمیشہ ہی بلا کی رہی اور مرتے دم تک قائم رہی۔

مثلاً، محمد ﷺ کے ساتھ شادی کی عمر کو ہی لے لیں۔ وہ کہا کرتیں کہ جب نکاح ہوا تو وہ ایک نو عمر لڑکی تھیں۔ اصرار رہتا کہ چھ سال کی عمر میں نکاح اور نو سال کی عمر میں رخصتی ہوئی۔ حالانکہ، یہ خلاف قیاس ہے اور ان کی زندگی میں بہت کم لوگ تھے، جو اس بات سے اختلاف کیا کرتے۔ بات یہ تھی کہ، لوگوں کو ان کی بات جھٹلانے کی ہمت نہیں تھی اور وہ کسی کو اس کی اجازت بھی نہیں دیا کرتی تھیں۔ کئی برسوں بعد اسلام کے ایک انتہائی طاقتور خلیفہ، معاویہ نے ان کے بارے کہا، 'کبھی کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ کسی

معاملے کو میں بند رکھنا چاہتا تو وہ اسے بند ہی رہنے دیتیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مسئلے کو کھولنا چاہتا تو وہ بند کر کے دم لیتیں'۔

لیکن، اگر عائشہ واقعی اتنی کم عمری میں بیاہی گئی تھیں تو یقیناً دوسرے لوگ اس کی تردید یا تائید تو کرتے، اور ایسا روایت میں جا بجا ملتا بھی ہے۔ کئی بیانات ایسے ہیں جن کے تحت، ان کی شادی نو سال اور رخصتی بارہ سال کی عمر میں طے پائی۔ کیونکہ، اس وقت بھی رسم یہ تھی کہ لڑکیوں کی رخصتی، بلوغت سے پہلے نہیں کی جاتی تھی۔ مگر، پھر وہی بات ہے کہ اگر عائشہ کی شادی عام لڑکیوں کی طرح، رسم اور رواج کے مطابق ہوا کرتی تو اس طرح ان کا شمار بھی عام لڑکیوں میں ہوتا، جو ظاہر ہے، عائشہ کو منظور نہیں تھا۔

زندگی کے آخری حصے تک وہ لوگوں کو اپنی حیثیت اور رتبے کی یاد دہانی کراتی رہیں۔ ویسے بھی، اس داستان میں، وہ اپنے ہم عصر کلیدی کرداروں میں تا دیر زندہ رہیں تو ان کی بات کا وزن لوگوں میں اس لیے بھی بڑھ کر تھا کہ ان کی کہی باتوں کی تردید اور تائید کرنے والا، محمد ﷺ کے زمانے کا کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا۔ جو بچے تھے، وہ زندگی کے اس مرحلے پر اختلاف سے احتراز برتا کرتے۔ عائشہ کی امتیازی حیثیت اس لیے بھی بڑھ کر تھی کہ وہ محمد ﷺ کی سب سے کم عمر اور چہیتی بیوی تھیں۔ بیویوں میں وہ واحد تھیں جو شادی سے پہلے نہ تو بیوہ تھیں اور نہ ہی طلاق یافتہ، بلکہ کنواری تھیں۔ سب سے اہم بات یہ باور کراتیں کہ وہ محمد ﷺ کی سب سے پسندیدہ تھیں۔ آپؐ انہیں 'حمیرا' کہہ کر بلاتے، جس کا مطلب 'سرخ بالوں والی' تھا۔ اگرچہ، قدرتی طور پر ان کے بال سرخ نہیں تھے، اگر وہ واقعی ہوتیں تو عرب، جہاں عام طور پر لوگوں کے بال سیاہ ہوتے ہیں، ایسی واحد فرد ہوتیں۔ چونکہ، وہ خاصی بے باک تھیں، اس لیے لاڈ سے یوں پکارے جانے پر بھی اترایا کرتیں۔ اسی لیے وہ زیادہ تر مہندی کی بوجھل تہوں سے بالوں کو گہرا سرخ رنگ دیے رکھتیں اور اس بابت شوخی برتا کرتیں۔ یہی مقصد تھا، یعنی اس طرح بھی انہیں جدا شناخت ملتی تھی۔

عائشہ محمد ﷺ کی نو بیویوں میں خدیجہ کے انتقال کے بعد نکاح میں آنے والی اولین بیویوں میں سے تھیں۔ ان کا رشتہ خود ان کے والد ابو بکر نے پیش کیا تھا، جو آپؐ کے دیرینہ دوست اور حامی تھے۔ وجہ یہ تھی کہ خدیجہ اور ابو طالب کے بعد سے محمد ﷺ غم سے نڈھال تھے۔ یوں، یہ بات خاصی موزوں بھی

معلوم ہوتی ہے کیونکہ عائشہ بے باک اور شوخ تھیں، جو آپ ؐ کو اس غم سے واپس لا سکتی تھیں۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ چونکہ وہ خاصی شوخ اور چنچل تھیں، ایک ذرا لحاظ نہ کرتیں اور اکثر محمد ﷺ کو چھیڑ دیتیں، تنگ کرتیں اور بجائے یہ کہ جھڑک دی جاتیں، ان کے بیچ محبت بڑھتی جاتی۔ دوسری جانب، شاید محمد ﷺ عائشہ کے ساتھ اس لیے بھی نرمی برتتے تھے کیونکہ وہ ابھی صرف ایک نوعمر لڑکی تھیں جس میں بچپنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ شرارتی، چنچل اور دل آویز شخصیت کی مالک تھیں۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ عائشہ خاصی سحر افسوں تھیں، وہیں یہ بھی ثابت ہے کہ ان کی طبیعت میں بے باکی اور شوخی تو بالضرور ہی تھی۔ بعض اوقات، کئی جگہوں پر یہ شوخی اس قدر بڑھ جاتی کہ اس پر آج جدید دور میں، بدتمیزی کا گماں ہوتا ہے۔ عائشہ نے بعد ازاں ازدواجی زندگی کے جو قصے روایت کر رکھے ہیں، اگرچہ قصہ خوانی کا مقصد اثر ورسوخ اور زندہ دلی کو واضح کرنا ہوتا تھا لیکن ان میں اکثر عجب رویے کا گماں ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جوان اور تیز طرار عورت اپنا راستہ کاٹنے والوں کو سبق سکھانے نکلی ہو۔ ایسے موقعوں پر عائشہ کی زندہ دلی میں سنگ دلی اور عجیب فطرت کا پتہ چلتا ہے۔

مثلاً، ایک موقع ایسا آیا کہ محمد ﷺ عائشہ کے علاوہ ایک دوسری بیوی کے پاس معمول سے زیادہ وقت گزارنے لگے۔ وہ بیوی، آپ ؐ کے لیے شہد ملا کر ایک مشروب تیار کیا کرتی تھیں، جسے 'شربت عسل' کہا جاتا ہے۔ انڈے کی سفیدی اور بکری کے دودھ میں شہد ملا دینے اور اچھی طرح پھینٹ دینے سے گاڑھا مشروب تیار ہو جاتا۔ محمد ﷺ کو یہ میٹھی غذا بہت بھاتی تھی اور وہ بہت شوق سے نوش کیا کرتے۔ بہر حال، ایک دن وہ اسی بیوی کے یہاں سے عائشہ کے کمرے میں آئے تو انہیں کچھ دیر ہو گئی۔ عائشہ نے استفسار کیا تو آپ ؐ نے تفصیل سے بیوی کے یہاں وقت گزاری اور مشروب بارے بتایا۔ عائشہ نے فوراً ہی ناک سکیڑ لی اور منہ موڑ لیا، جیسے سانس کی بو سے نالاں ہوں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ محمد ﷺ کو سانس میں بدبو سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ کہنے لگیں، 'لگتا ہے، شہد کی مکھیاں افسنتین کے کڑوے پھول کھاتی رہی ہیں'۔ انہوں نے جب کافی دیر تک یہی رٹ لگائے رکھی تو نتیجہ یہ نکلا کہ اگلی بار جب دوسری بیوی کے یہاں محمد ﷺ کو ان کا پسندیدہ مشروب پیش کیا گیا تو انہوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ وہ اب ان کے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے

تھے اور جلد ہی لوٹ آتے تھے۔

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ ہے، جب عائشہ حد سے گزر گئیں۔ محمد ﷺ نے ایک عیسائی قبیلے کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس نئے اتحاد کی اہمیت کے پیش نظر، قبیلے کے سردار کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے پر حامی بھر لی۔ سردار کی بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ جب، وہ عورت نکاح سے پہلے مدینہ پہنچی تو عائشہ نے اس کو خوبرانہ مشورہ دیا کہ اگر وہ نکاح کی رات مزاحمت کرے تو محمد ﷺ کی نظر میں اس کی قدر بڑھ جائے گی۔ اسے کہا کہ وہ ان سے کہے، 'میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔۔۔'۔ اس کو علم نہیں تھا کہ دراصل یہ کلمہ نکاح کو فسخ کرنے کے مترادف ہے۔ جوں ہی اس نے ایسا کہا تو آپؐ چونک گئے اور فوراً ہی وہاں سے چلے گئے۔ اگلے ہی دن سردار کی بیٹی کو واپس بھجوا دیا گیا۔

قصہ مختصر، عائشہ کو ہمیشہ ہی اپنی منوانے کی عادت تھی اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتی تھیں اور ان کی ہمیشہ ہی چلتی تھی، لوگ ان کی مانتے تھے، ان کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ اس صورتحال میں، جب وہ اس قدر بے باک، شوخ اور نتائج سے بے پرواہ ہوا کرتی تھیں تو یہ بات یقینی تھی کہ اب عائشہ اس قضیے کے عین مرکز میں، پھنس کر رہ جائیں گی۔ کئی لوگوں کو کسر نکالنے کا موقع مل جائے گا۔ یہاں یہی ہوا۔ یہ خلاف قیاس تھا کہ قافلے میں عائشہ کی غیر موجودگی محسوس نہیں کی جائے گی۔ پھر، یہ بھی سوچ سے باہر تھا کہ جب وہ انہیں ساتھ نہیں پائیں گے تو یوں ہی رواں دواں رہیں گے۔ وہ انہیں تلاش کرنے ضرور آئیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ سورج چڑھ آیا اور گرمی بڑھنے لگی۔ انہوں نے کیکر کے ایک درخت کے سائے تلے پناہ لی اور انہی سوچوں میں پریشاں رہیں۔ یقیناً، وہ جان لیں گے اور جب وہ جان لیں گے تو کوئی نہ کوئی انہیں لینے ضرور آئے گا۔ ویسے بھی، ان کا یوں قافلے کے پیچھے جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ محمد ﷺ صلعم کی پسندیدہ ترین بیوی تھیں، کیا وہ قافلے کے اونٹوں کے پیچھے ایک بدو، چرواہوں کی لڑکی کی مانند بھاگتی ہوئی اچھی لگتیں؟

خیر، بالآخر ایک شخص آ ہی گیا۔ جیسا کہ عائشہ کا خیال تھا، اسے آپ کی تلاش کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ اس کا تو یہاں سے اتفاقیہ گزر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ قافلے سے کسی کو بھی نہیں بھیجا گیا کیونکہ انہیں علم

ہی نہیں تھا کہ عائشہ ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ پہنچ گئے اور وہاں بھی کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ عائشہ قافلے کے ساتھ نہیں ہیں۔ قافلے کی آمد کے ساتھ ہی نخلستان میں گہما گہمی شروع ہو گئی اور ہر طرف شور و غل تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں اونٹوں پر لدا مال اتار کر سنبھالا جا رہا تھا اور کئی دنوں کی طویل مہم کے بعد واپس آنے والے جنگجو اپنی بیویوں اور رشتہ داروں سے میل ملاقات میں مصروف تھے۔ عائشہ کی غیر موجودگی کسی کو بھی محسوس نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ان کی خدمت پر مامور باندی نے بھی یہی گماں کیا کہ شاید وہ پالکی سے اتر کر اپنی والدہ سے ملنے چلی گئی ہیں۔ محمد ﷺ کا یہ کہ وہ اس وقت عائشہ کی بجائے کسی دوسرے معاملے بارے سوچ رہے ہوں گے، مدینہ واپس آتے ہی مشراء نے انہیں گھیر لیا ہو گا۔ الغرض ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ اگر عائشہ اس جگہ نہیں تو یقیناً وہیں کہیں دوسری جگہ پر ہوں گی۔

عائشہ کی خوش قسمتی تھی یا شاید بد قسمتی تھی کہ مدینہ کے انصار سے تعلق رکھنے والا ایک جوان جنگجو جو بوجوہ قافلے سے پیچھے رہ گیا تھا، اکیلا اور تن تنہا ہی صحرا میں گرمی کے بیچ ہی روانہ ہوا تھا، کہ اب وہ قافلے کو جا پہنچے۔ راستے میں کیا دیکھتا ہے کہ صحرا میں ایک عورت کیکر کے گھٹے ہوئے سائے تلے سمٹی ہوئی پڑی ہے۔

اس جنگجو کا نام صفوان تھا۔ بعد ازاں عائشہ نے اپنے سر کی قسم اٹھا کر کہا کہ جیسے صحرا بے داغ، صاف اور خالص ہوتا ہے، اسی طرح صفوان نے بھی انہیں پہچانتے ہی ایک دم اونٹ سے اتر آیا، نہایت عزت اور احترام سے انہیں سہارا دے کر اونٹ پر سوار کرایا اور پھر مہار ہاتھ میں تھامے، پیدل ہی بیس میل کا سفر جانور کے آگے چلتے ہوئے طے کیا۔ عائشہ جب مدینہ پہنچیں تو نخلستان کے باسیوں نے بھی یہی منظر دیکھا کہ محمد ﷺ کی پسندیدہ بیوی عائشہ شام ہونے سے پہلے اور قافلے کے پہنچنے کے کئی گھنٹے بعد، ایک اونٹ پر سوار ہیں، جس کی مہار ایک جوان جنگجو نے تھام رکھی ہے۔ عائشہ تو نہایت شان اور ٹھلے سے اونٹ پر بیٹھی ہیں جبکہ صفوان آگے آگے، سر جھکائے چل رہا ہے۔

لیکن ہوا کیا، عائشہ کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ معاملات میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ بجائے لوگ دوڑ کر ان کی خیر و عافیت سے مدینہ پہنچنے پر شکر ادا کرتے، آگے بڑھ کر خیر مقدم کرتے، وہ تو انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عائشہ نے یکدم ہی تاڑ لیا ہو گا کہ ہر شخص پیچھے ہٹتا جا رہا ہے اور مجمع میں چہ مہ گوئیاں شروع

ہو گئی تھیں۔ وہ دیکھ رہی ہوں گی کہ کیسے راستے کے دونوں اطراف میں لوگ جمع ہو رہے ہیں اور ان کو دیکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ وہ چاہے جتنا سر اونچا رکھتیں، اونٹ پر سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کرتیں یا لوگوں کی اس حرکت پر انہیں غصہ ناک نظروں سے دیکھتیں، اب بات ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے لوگوں کو کھسر پھسر کرتے دیکھ رہی تھیں اور کانوں سے اونٹ کے آگے دوڑتے ہوئے بچوں کو شور مچاتے ہوئے سن سکتی تھیں۔ وہ جان گئیں کہ لوگ کیا کہتے پھر رہے ہیں؟

لوگوں کے لیے یہ منظر نہایت ہی عجیب و غریب تھا۔ پیغمبر کی سب سے پسندیدہ اور نوجوان بیوی اونٹ پر سوار ہے، جس کی مہار ایک جوان، خوش شکل جنگجو نے تھام رکھی ہے۔ وہ ایک لمبا سفر تن تنہا اس کے ساتھ طے کر کے اب مدینہ پہنچ چکی تھیں اور نخلستان کے بازاروں اور گلی کوچوں میں یوں روانہ تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟ مدینہ کا نخلستان، آٹھ میل رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ خبر گھنٹوں کے اندر ہی پھیل گئی۔ پھر کیا تھا، جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ جیسے، لوگ کہتے پھر رہے تھے، ظاہر ہے۔۔۔ ہار تو ایک بہانہ ہے۔ ایک نوعمر لڑکی سے کوئی کیا گماں رکھے گا، جب وہ ایک ادھیڑ عمر شخص سے بیاہی گئی تھی؟ لق دق صحرا میں پورا دن؟ وہ بھی تن تنہا؟ ایک جوان جنگجو کے ساتھ؟ آخر عائشہ وہیں کیوں رکی رہیں، جبکہ وہ چاہتیں تو گھنٹے بھر میں قافلے کو پہنچ سکتی تھیں؟ کیا ان دونوں کے بیچ یہ پہلے سے طے شدہ ملاقات تھی؟ کیا پیغمبر کو ان کی شوخ، چنچل اور پسندیدہ بیوی نے دھوکہ دے دیا؟ یعنی، جس کا جو جی چاہتا، ہانکتا پھرتا تھا۔

کیا لوگ واقعی ایسا سوچتے تھے؟ یہاں اصل نکتہ یہ نہیں ہے۔ جیسا آج ہوتا ہے، ساتویں صدی عیسوی میں بھی اس طرح کی تہمت تراشی اور رسوائی میں عام لوگ لذت حاصل کرتے تھے، بالخصوص جب معاملہ کسی نامی گرامی شخصیت کا ہو اور پھر بات بھی جنسیت سے بھرپور ہو، افواہیں زور پکڑ ہی لیتی ہیں۔ اہم بات یہ تھی کہ اس الزام تراشی سے نخلستان کے سیاسی منظر نامے پر گہرا اثر تھا۔ عائشہ اور صفوان کے بیچ جو بھی معاملہ رہا ہو، جیسا کہ عائشہ نے قسم اٹھائی یا لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہو رہی تھیں، جو بھی کہا جاتا تھا، اہم نہیں تھا۔ یہ تو محمد ﷺ کی ساکھ کا معاملہ تھا، ان کی سیاسی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی۔

عائشہ پر تہمت دراصل ان کے پورے گھرانے کی بدنامی تھی۔ خاص طور پر ان دو اشخاص کے لیے بگاڑ

تھی، ایک وہ جس نے عائشہ کو بیاہ کر دیا اور دوسرا وہ آدمی جس سے عائشہ کا نکاح ہوا۔ یعنی، ابو بکر اور محمد ﷺ کی ساکھ اور عزت داؤ پر لگ چکی تھی۔ ابو بکر آپؐ کے دیرینہ ساتھی تھے۔ وہ مکہ سے ہجرت کی رات محمد ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے اور انہوں نے ہی اس سفر کا اسباب کیا۔ یوں، مکہ کے وہ لوگ جو مدینہ ہجرت کر چکے تھے، ان کے یہاں ابو بکر کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی۔ ویسے بھی، ابو بکر ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے، جن کی مدد سے محمد ﷺ مدینہ کو حجاز کا نیا سیاسی مرکز بنانے کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ مہاجرین، یعنی مکہ سے ہجرت کرنے والے لوگ، جو بعد میں بھی یہی کہلائے جاتے رہے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ کے لوگ، یعنی انصار انہیں بدستور غیر سمجھ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ لوگ خارجی تھے۔ اگرچہ انصار بوجوہ ان کی عزت کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر انہوں نے مہاجرین کو قبول نہیں کیا تھا۔ مدینہ کی اکثریت، مہاجرین سے خواہ مخواہ کی بیر رکھتی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مکہ کے یہ لوگ باہر سے وارد ہو کر اب مدینہ کے سیاہ و سفید کے مالک بن چکے ہیں اور آہستہ آہستہ نخلستان کی مقامی آبادی پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے مطابق، انہوں نے تو صرف محمد ﷺ کو بطور ثالث مدعو کیا تھا، ان کے یہ ساتھی تو بغیر کسی حیل و حجت کے اب ان کے سروں پر سوار تھے۔ مدینہ کے اس نظریے کے لوگوں کے لیے عائشہ کے ساتھ پیش آنے والا گمشدہ ہار کا واقعہ خصوصی دلچسپی کا حامل تھا۔ ساتویں صدی میں مدینہ کی سیاست بھی آج کی ہی دنیا کی طرح اس مقولے پر چلتی تھی کہ، 'بد سے بدنام برا۔۔' یعنی یہ کہ معاملے کی حقیقت بھلے کچھ نہ ہو، افواہیں خوب چلتی تھیں۔

یہ تو انصار کا معاملہ تھا۔ مہاجرین کے گروہ میں بھی پھوٹ تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابو بکر کے گھرانے کو کھونٹی سے باندھنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص عائشہ کو تو ضرور ہی سبق سکھایا جائے جو عجب نک چڑھی لڑکی ہے، محمد ﷺ کے علاوہ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، خود کو دوسرے ہر شخص سے بہتر سمجھتی ہے۔ عورتوں کے بیچ تو عائشہ کے لیے بے انتہا حسد اور جلن پائی جاتی تھی۔ آپؐ کی بیٹیاں تو ایک طرف، دوسری بیویاں بھی عائشہ کی دانستہ امتیازی کوششوں سے اچاٹ تھیں۔ عائشہ جو کہ اب تک اپنی حیثیت بڑھانے میں کامیاب ہوتی چلی آ رہی تھیں، جو محمد ﷺ کے انتہائی قریب ہو چکی تھیں اور کسی بھی طرح دوسروں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں، اب پہلی بار انتہائی گھمبیر صورتحال میں پھنس چکی تھیں۔ لوگوں کو

کسر نکالنے کا واقعی موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عائشہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے، سراسر بے بنیاد تھے۔ وہ نو عمر اور منہ زور ضرور تھیں لیکن ہر گز احمق نہیں تھیں۔ انہیں سیاست، اپنے اور محمد ﷺ کے رتبے کا بخوبی علم تھا۔ کیا وہ صرف اس وجہ سے اپنی اور ابو بکر کی حیثیت اور ساکھ کو داؤ پر لگا دیتیں؟ ظاہر ہے، اس کا سوال ہی نہیں۔ پھر، وہ محمد ﷺ کی پسندیدہ ترین بیوی تھیں، کیا وہ ایک ایسے شخص کے لیے پیغمبر کو دھوکہ دے دیتیں، جو صرف ایک جنگجو ہے اور مدینہ کے کسی نامی گرامی خاندان سے تعلق بھی نہیں رکھتا؟ عائشہ ہر گز، ہر گز ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ صفوان نے بھی عائشہ کو صحرا کے بیچ تن تنہا پا کر ویسا ہی ردعمل ظاہر کیا، جیسا عائشہ کو توقع تھی۔ مثال، جیسے کہا جاتا ہے کہ ایک جواں مرد سورما اپنی مالکن کی مدد کو جھک گیا۔ صورتحال کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ واقعات وہی رہے ہوں گے جیسے کہ عائشہ نے روایت کیے، اس سے بڑھ کر معاملات کو رنگ دینا بلاشبہ ایک انتہائی گھٹیا چال تھی۔ آخر، کوئی بھی شخص ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟

جیسا کہ تاریخ میں درج ہے، محمد ﷺ نے ہر گز ایسا نہیں سوچا تھا۔ اگر انہیں کوئی خفت تھی تو وہ اس بات کی تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ بیوی کو صحرا میں اکیلا چھوڑ آئے تھے۔ افواہوں پر انہوں نے پہلے پہل تو سرے سے کان ہی نہیں دھرے، ان کا خیال تھا کہ یہ اپنی موت آپ ہی مر جائیں گی لیکن ظاہر ہے، ایسا نہیں ہوا۔ واضح طور پر آپؐ نخلستان کی سیاسی فضا میں جاری کشمکش کو پڑھنے میں ناکام رہے تھے۔

رات کی رات میں ہی نخلستان کے شعراء اپنے کام میں جت گئے۔ پھر، وہاں فضول گو اور تھڑے ہوئے خبریں پھیلانے والے بھی تھے، اس وقت کے حساب سے کہیے تو زرد صحافی، گرے ہوئے اداکار اور گھٹیا قصے گھڑنے والے قصہ گو سب ہی حرکت میں آ گئے۔ یہ تمام لوگ بیک وقت ہی عجب رنگ اختیار کر گئے، ان کا مزاج بدل گیا اور انہوں نے عربی ادب کی مشہور و معروف صنف، یعنی ہجو اور طنز و مزاح پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیے۔ شاعری، نثر، نظمیں اور رباعیاں منظر عام پر آ گئیں جن میں ذو معنی باتیں کہی گئی تھیں، عامیانہ طنز کسے گئے تھے اور فحش گوئی سے کام لیا گیا تھا۔ یوں، دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف ایک ایسا

ماحول بن گیا جس میں قافیوں کی مدد سے پہلے تو ایک عورت کی عصمت پر نشتر لگائے گئے اور پھر منہ زبانی، کلامی حملوں سے محمد ﷺ کی بصیرت اور ساکھ کو نشانہ بنایا گیا۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں دوستی اور اتحاد ایک وعدے اور مصافحہ سے طے پا جاتے ہوں، وہاں کسی شخص کی عزت اور عظمت اور سیاسی و معاشی حیثیت، غیرت سے جڑی ہوئی ہو، اب سب کچھ داؤ پر لگ گیا۔

جلد ہی مدینہ کا نخلستان اور مضافات اس تحقیری مہم کی لپیٹ میں آگئے۔ کنوؤں پر، کھیت کھلیانوں میں، کھجور کے باغات، قصبوں کے سرائے، بازاروں اور گلی کوچوں اور اصطبلوں، یہاں تک کہ مسجد کے اندر بھی ہر وقت چہ مہ گوئیاں جاری رہتیں۔ لوگ نخلستان کے چپے چپے پر مزے لے لے کر باتیں کرتے، افواہیں اڑاتے، قصے گھڑتے اور جس کا جو جی چاہتا واقعات کو ویسی ہی شکل دے دیتا۔ معاملے کا عجب رنگ ہو گیا، پہلے گھنٹے اور پھر دن گزر گئے اور یوں معاملے کے سو پر نکل آئے۔

محمد ﷺ نے معاملے کو نظر انداز کرنے کی بہتیری کوشش کرلی، لیکن افواہیں تھیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ بالآخر، بات ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ جانتے تھے کہ عائشہ بے قصور ہیں لیکن یہاں مسئلہ یہ نہیں تھا، عوام کو بھی تسلی ہونی چاہیے تھی کہ عائشہ واقعی بے قصور ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خود ان کا دائرہ اختیار اور مدینہ میں ان کی شخصیت کا سحر اور اثر اس معاملے کو سلجھانے کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ مدینہ میں ابھی تک ان کی پوری طرح دھاک نہیں بیٹھی تھی، جنوب میں مکہ کے ساتھ بھی معاملات ابھی تک کشیدہ تھے اور دو بڑی لڑائیاں لڑنے کے باوجود بھی، معاملات سنبھلنے میں ابھی وقت باقی تھا۔ اب اس معاملے کی بھنک بھی انہیں پڑ چکی تھی اور روز نئی شاعری صحرا میں پھیل کر قریش کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہاں، ان کے دشمنان یہ خبریں سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

محمد ﷺ گویا دو دھاری تلوار پر سوار تھے۔ اگر وہ عائشہ کو طلاق دے دیتے ہیں تو یہ اس بات کی تصدیق ہوتی کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف اگر وہ سب کو نظر انداز کر کے انہیں اپنے پاس رکھتے تو لوگوں کو نئی کہانی مل جاتی۔ یعنی، وہ کہتے پھرتے کہ شاید ایک پکی عمر کا شخص، نو عمر لڑکی کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ ہر دو صورت، آپ ؐ کا مدینہ میں اختیار اور ساکھ برباد ہو کر رہ جاتی۔ یہی نہیں بلکہ خود اسلام کی

تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہتا جس کا کسی بھی صورت ازالہ ممکن نہیں تھا۔ یہ بات سننے میں نہایت عجیب لگتی ہے مگر صورتحال یہی تھی کہ اس نئے دین کا مستقبل ایک نوعمر لڑکی کی نیک نامی کے ترازو میں جھول رہا تھا۔

اسی دوران، حالات کے پیش نظر محمد ﷺ نے عائشہ کو مسجد کے احاطے میں واقع ان کے کمرے سے نکال کر اپنے والد، یعنی ابو بکر کے یہاں روانہ کر دیا۔ وہاں، وہ گھر کے اندر بند رہ سکتی تھیں اور وہیں رہیں، تا کہ لوگوں کی تاک جھانک اور طنز و طعن سے دور رہیں۔ کہا گیا کہ انہیں اپنے والد کے یہاں جانا پڑا کیونکہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ افواہیں پھیلانے والوں نے اس وجہ کو خاطر میں نہ لایا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اس بات پر بھی خوب پروپگنڈا کیا۔ جان بوجھ کر کہتے، 'جی ہاں، بیماری کی ہی وجہ سے گئی ہیں۔ منہ چھپا رہی ہیں، شرم سے پانی پانی ہیں۔۔۔'

اپنی زندگی میں پہلی بار عائشہ کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جیسا کہ اوائل دور کے ایک مورخ نے لکھا، 'انہوں نے تو بہت کچھ کہا۔۔۔' لیکن، یہ ہرگز کافی نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ لیتیں، ہزار صفائیاں دیتیں یا بار بار اپنی پاک دامنی کا یقین دلاتیں، فرق پڑنے والا نہیں تھا، سو نہیں پڑا۔ انہوں نے ہزار حیلے کر کے دیکھ لیے۔ برہم ہو جاتیں، طیش سے لال پیلی ہو کر صلواتیں سناتیں، انتہائی ترشی اور غرور سے جھٹک دیتیں، افواہیں پھیلانے والوں کو بد دعائیں دیتیں اور جو سامنے بولنے کی جرات کرتا، اسے تو وہیں دھو ڈالتیں۔ لیکن، ظاہر ہے یہ سب بے سود تھا۔ وہ لوگوں کے منہ بند کرنے سے قاصر تھیں۔ کئی برسوں بعد بھی وہ ان دنوں کو یاد کرتیں تو جیسے جھرجھری آجاتی۔ لیکن، تب وہ کہا کرتیں کہ صفوان تو کمزور اور نامرد تھا۔ اس نے تو کبھی، عائشہ کے الفاظ میں 'کسی عورت کو بھی چھوا تک نہیں تھا۔۔۔'۔ خیر، یہ ایسی بات تھی، جس کی تصدیق یا تردید ممکن نہیں تھی۔ خود صفوان بھی عائشہ کے اس دعویٰ پر کہنے کو موجود نہیں تھا، وہ عرصہ پہلے ایک جنگ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تب تک وہ اپنی مردانگی کا دفاع کرنے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا۔

جب کچھ نہ بن پڑتا تو عائشہ کا بھی وہی حال ہوا جو ایسے معاملے میں ایک نوعمر، نادان لڑکی کا ہو سکتا ہے۔

وہ رونے لگتیں۔ اگر روایت میں عائشہ کے الفاظ، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے بڑھائے چڑھائے محسوس ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ جس قدر دباؤ اور تناؤ کی یہ کیفیت ہوتی ہے، ایک نو عمر لڑکی کے لیے خاصی پریشانی کا سامان ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہا کرتیں، 'مجھے خود بخود رونا آتا، میں ہر وقت روتی رہتی۔ اس قدر روتی کہ اکثر لگتا، میرا کلیجہ پھٹ جائے گا'۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو محض اتفاق کی بات ہے کہ ہار کا گم ہو جانا، اتنے بڑے قضیے کا سبب بن گیا۔ اکثر لوگ تو ایک دوسری منطق بھی پیش کرتے ہیں۔ جیسے، آج بھی قدامت پسند علماء اس واقعے کا حوالہ دے کر کہا کرتے ہیں کہ جب عورتیں گھروں میں رہنے کی بجائے عوامی سطح پر دنیاداری کرنے کا سوچتی ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ حالانکہ، یہ نرالی بات ہے، کئی دوسرے لوگ اس منطق کو جنسیت کا پرانا طریقہ واردات گردان کر رد کر دیتے ہیں۔ ان کا نکتہ یہ ہے کہ ایسے تو ہر کہانی میں عورت ہی مورد الزام ٹھہرا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دلیل یہ ملتی ہے کہ سارا قضیہ ہی عائشہ کی وجہ سے شروع ہوا۔ اول تو ان کی شخصیت ہی ایسی تھی، پھر وہ محمد ﷺ کی پہلی بیوی، یعنی خدیجہ کے ساتھ خدا واسطے کا بیر رکھتی تھیں۔

خدیجہ ایک دولت مند بیوہ تھیں۔ محمد ﷺ نے جب ان سے شادی کی تو خدیجہ کی عمر چالیس اور آپؐ پچیس برس کے تھے۔ ان کا یہ ساتھ تقریباً چوبیس برس پر محیط ہے، جس دوران ان دونوں کے بیچ بیش بہا محبت رہی اور ان کے بعد بھی محمد ﷺ خدیجہ کی یاد سے ہمیشہ ہی جڑے رہے۔ یہ خدیجہ ہی تھیں جنہوں نے آپؐ پر اپنے کاروبار میں بھروسا کیا تھا۔ پہلی وحی کے بعد جب محمد ﷺ خوف اور بے یقینی کا شکار تھے، انہوں نے سنبھالا دیا تھا۔ خدیجہ نے انہیں تسلی دی تھی اور یقین دلایا تھا کہ وہ امید رکھتی ہیں کہ آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ خدیجہ کے بعد محمد ﷺ نے چاہے جتنی بار بھی شادی کی، وہ کبھی بھی خدیجہ کی یاد کو دل سے اتار نہیں سکے۔ وہ ہمیشہ ان کی محبت سے جڑے رہے۔

ایک نوجوان لڑکی کو کیا پڑی تھی کہ وہ مر جانے والی ایک عورت کی یاد سے مقابلہ کرتی؟ لیکن، ظاہر ہے ایک کم عمر لڑکی، جس کی طبیعت میں بچپنا ہو، وہی ایسا کر سکتی ہے، وہ نہیں تو اور کون کرے گا؟

'میں آپؐ کی کسی بیوی سے کبھی جلن کا شکار نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی حسد نہیں ہوا، سوائے خدیجہ کے۔۔۔ حالانکہ، میں ان کے بعد آئی تھی'۔ کئی سال بعد عائشہ کہا کریں گی۔ حالانکہ، تاریخ میں ایسے حوالے جابجا ملتے ہیں کہ عائشہ دوسری بیویوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک رکھتی تھیں جیسا کہ وہ خدیجہ کے بارے سوچتی ہیں۔ روایات ہیں کہ اکثر، جب کسی دوسری بیوی کی خوبصورتی کا ایک سے زائد بار ذکر ہوتا تو وہ بھنا جاتیں۔ یہ بات درست ہے کہ وہ خدیجہ کے ساتھ بالخصوص ہی حسد میں مبتلا رہتی تھیں۔ شاید، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کی پہلی بیوی، جواب حیات نہیں تھیں، اب ان کا محمد ﷺ پر اثر کا توڑ ممکن نہیں رہا تھا۔ خود آپؐ بھی اس بات کا بارہا اعادہ کرتے اور اکثر عائشہ کو ٹوک دیا کرتے۔ ایک دفعہ تو یوں ہوا کہ عائشہ حد سے بڑھ گئیں اور آپؐ کو ان کے منہ سے بات چھین کر روک لگانی پڑی۔ وہ خدیجہ کے بارے، اگرچہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہی تھیں لیکن مقصد محمد ﷺ پر اپنی دلربائی ظاہر کرنا تھا۔ یہ ایسا سوال تھا، جو ایک کم عمر اور نادان لڑکی ہی پوچھ سکتی تھی اور یہ ایسا سوال تھا جس پر کئی سال بعد جب وہ ادھیڑ عمری میں تھیں، پوچھنے پر اکثر پشیمانی ظاہر کرتیں۔ کسی دوسرے میں اس قدر زبان درازی کی جرات نہیں تھی، وہ آپؐ سے کہنے لگیں، ' آخر، آپؐ اس پوپلے منہ والی بوڑھی عورت کی یاد سے کیونکر جڑے رہ سکتے ہیں جبکہ خدا نے انہیں کہیں بہتر بیوی سے نواز رکھا ہے۔۔۔'

صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک دلربائی کے انداز میں محمد ﷺ کا دل موہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں، ان کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟ جو بھی تھا، یہ مناسب بات نہیں تھی۔ اس سے عائشہ کا بچپنا اور مرنے والی کی بے توقیری صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اگر عائشہ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح وہ خدیجہ پر فوقیت حاصل کر سکتی ہیں، محمد ﷺ کے دل میں جگہ بنالیں گی تو یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ محمد ﷺ نے انہیں وہیں روک لگا دی اور سختی سے کہا، 'بے شک نہیں۔ خدا نے خدیجہ کو بہتر سے نہیں بدلا'۔ پھر حتمی انداز میں زور دے کر کہا، 'خدا نے مجھے خدیجہ سے اولاد عطا کی ہے جب کہ دوسری عورتوں پر مزید اولاد کو روک لگا دی ہے'۔

آپؐ نے قصہ ہی ختم کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ خدیجہ ہر قسم کی تنقید اور دشنام طرازی سے بالاتر تھیں بلکہ

انہوں نے تو خود عائشہ کی لاولدی کو ان کے خلاف استعمال کر لیا۔ وہ بے شک، ان کی دل پسند رہی ہوں، جب شادی ہوئی تو وہ کنواری ہوا کرتی ہوں لیکن ایک ایسے معاشرے میں، جہاں مردوں کے لیے ہر چیز کا پیمانہ غیرت اور عورتیں مامتا کے ترازو میں تولی جاتی ہوں، عائشہ کچھ بھی کر لیں، وہ اس تول میں پورا نہیں اترتی تھیں۔ وہ کبھی بھی پورا نہیں اتر پائیں گی۔

کیا یہی موقع تھا جب عائشہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ، ویسی ہی بن جائیں گی جیسا کہ آج ہم انہیں جانتے ہیں؟ یا ان کا یہ ارادہ ہمیشہ سے تھا کہ وہ بالآخر ہر ایک سے بالاتر ہوا کریں گی، کسی کو خاطر میں نہیں لائیں گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ ریاست کی سیاست میں انتہائی اہم کردار ادا کریں گی۔ لوگ ان سے مشورہ لیا کریں گے اور آج ہم ان سے منسوب ہزاروں احادیث حوالہ کریں گے؟ اگرچہ، ساری ہی بیویاں امہات المومنین، یعنی ماننے والوں کی مائیں قرار پائیں گی لیکن یہ صرف عائشہ ہی ہوں گی جو واقعی اپنی حیثیت ایسی منوا کر رہیں گی۔ ایسا محسوس ہوا کرے گا کہ جیسے عائشہ سب 'امہات المومنین' کی طرف سے بول رہی ہیں۔ لوگ انہیں، 'امی عائشہ' کہا کریں گے۔ یہ ایسی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنے وقت کے انتہائی زور آور اور مضبوط ترین حکمرانوں کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گی۔ یہ ایسا حق، خطاب ہے کہ جس کے زور پر ان کا دائرہ اختیار، مثال لا محدود ہو جائے گا۔ کسی مائی کے لعل کو ان کے سامنے بات کرنا تو دور، آنکھ اٹھانے کی جرات نہیں ہو گی۔ وہ کسی بچے کی ماں نہیں بن پائیں لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا وہ بلا شبہ تمام ماننے والوں کی ماں بن کر ابھریں۔

بے خوف، مضبوط اعصاب کی مالک اور بے باک عائشہ، ان کی یہی عادات اور خصلتیں کئی موقعوں پر ان کے خلاف استعمال ہوئیں، لیکن اس داستان میں عائشہ مرکزی کردار بن کر ابھریں گی۔ اس کہانی کے پلاٹ میں، ان کا اس قدر گہرا نام ہے کہ کوئی شخص ان کے اثر سے بچ نہیں پایا۔ ہر آدمی، ہر خلیفہ اور ہر نامی گرامی ان کے سامنے پانی بھرتا رہا۔ سوائے ایک شخص کے، جس سے اب محمد ﷺ 'گمشدہ ہار کے واقعہ' میں، جب عائشہ پر عجب وقت آن پڑا تھا، مشورے کے لیے رجوع کریں گے۔

باب 3

اگر کوئی ایک شخص جس کے بارے وثوق سے، لیکن بوجوہ کہا جا سکتا ہے کہ بالآخر محمد ﷺ کا وارث ہو گا، وہ علی تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی ہاشم میں، وہ آپؐ کے سگے چچازاد تو تھے، اس کے علاوہ اس خاندان کے محمد ﷺ کے بعد اصلاً چشم وچراغ بھی مانے جاتے ہیں۔ علی کو ہی بعدازاں شیعہ اپنا رہبر مان لیں گے۔ یہ پیروکار اس وقت اور آج بھی علی کے کٹر ماننے والے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عربی میں انہیں 'شیعۃ علی' اور مختصراً 'شیعہ' کہا جاتا ہے۔ شیعہ کے معنی فدائی یا دوست کے ہیں۔

علی اسلام قبول کرنے والے پہلے مرد تھے۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس تھی لیکن عرصے بعد بھی انہیں اس روز کے واقعات زبانی یاد تھے۔ جس طرح وہ اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں، صاف لگتا ہے کہ جیسے یہ ان کی زندگی کے اہم ترین مواقع میں سے ایک رہا تھا۔ یہ محمد ﷺ پر وحی کے نزول کے ابتدائی دور کا قصہ ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی آپؐ کا سامنا جبرائیل سے ہوا تھا اور بعد اس کے انہیں خدیجہ نے خوف کی حالت میں سہارا دیا تھا، تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ 'یہ یقیناً ایک فرشتہ ہے اور شیطان نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپؐ خدا کی طرف سے لوگوں پر پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں'۔ اب، محمد ﷺ نے اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کو جمع کیا تھا اور ان سے حمایت طلب کی تھی۔ سب کو مخاطب کر کے کہا، 'تم میں سے کون ہے جو اس مقصد میں میری مدد کرے گا؟'

علی بتاتے ہیں کہ، 'وہ تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ جبکہ میں، حالانکہ میں ان سب سے چھوٹا تھا، میری نظر بھی درست نہیں تھی، جسم بھی موٹا، فربہ سا تھا جبکہ ٹانگیں کمزور اور پتلی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے آگے بڑھ کر کہا، 'میں۔ اے اللہ کے پیغمبر، میں آپ کا اس معاملے میں پورا ساتھ دوں گا'۔

کمزور نظر؟ موٹا، فربہ جسم؟ پتلی اور کمزور ٹانگیں؟ کیا علی مذاق کر رہے تھے؟ انہوں نے خود اپنے یہ کوائف بیان کیے ہیں۔ یہ کسی بھی طور ان رنگین پوسٹروں میں عام ملنے والی شبیہ سے میل نہیں کھاتے، جس میں انہیں ایک جوانمرد، جری جنگجو اور بڑی روشن آنکھوں والا خوبرو جوان دکھایا گیا ہے۔ یہ پوسٹر شیعہ

لوگوں کے یہاں بہت مقبول ہیں۔ اگرچہ سنی تو اس دور کے کسی بھی شخص کی شبیہ بنانے کی سختی سے ممانعت کرتے ہیں لیکن شیعہ اکثریتی علاقوں میں ایسے پوسٹر اخبار کے سٹینڈ، کھوکھے اور ہاکروں کے پاس وافر تعداد میں مل جاتے ہیں۔ لبنان سے لے کر جنوبی ایشیا کے کٹر شیعہ علاقوں میں بنائی جانے والے ان پوسٹروں میں علی ایک بے ڈھب لڑکا نہیں بلکہ چالیس کے پیٹے میں انتہائی خوبرو شخص نظر آتے ہیں۔ چہرے پر ایک متانت تو ہے ہی، جبڑا اچھی طرح اپنی جگہ پر ایک خط میں بیٹھا ہوا ہے، جس پر قلمی داڑھی تراشی ہوئی دکھتی ہے۔ ابرو جیسے جھالر ہوں اور خاصی بڑی روشن آنکھیں، جو اوپر کو ہوئی نظر آتی ہیں۔ پہلی بار نظر پڑنے پر علی کی یہ تصویر عیسیٰ کی روایتی شبیہ معلوم ہوتی ہے۔ جسمانی ہئیت میں فرق صرف اتنا ہے کہ علی علیہ السلام، عیسیٰ کی نسبت خاصے مضبوط اور قوت حیات سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ، علی کی تصویر میں تلوار لازم ہوتی ہے۔ بعض جگہوں پر یہ میان میں بندھی، کمر کے ساتھ لٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کئی جگہوں پر ان کی جھولی میں ننگی رکھی ہوئی ملتی ہے۔ علی کی تلوار کا عالم اسلام میں خاصا چرچا رہا ہے۔ اتنا زیادہ کہ شاید عیسائیت کے مشہور و معروف کردار شہنشاہ آرتھر کی تلوار کی بھی کبھی اس قدر دھوم نہیں رہی۔ آرتھر کی ہی طرح علی کی تلوار بارے بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عجب خصوصیات کی حامل تھی۔ اس کے بارے فوق الفطرت قصائص مشہور ہیں۔ جیسے آرتھر ویسے ہی علی کی تلوار کا بھی ایک نام، پورا تعارف ہے۔ علی کی تلوار کو 'ذوالفقار' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک دودھاری تلوار ہے جس کی پشت تو سیدھی ہے مگر نوک پر پہنچ کر یہ دوسانگی ہو جاتی ہے۔ دور سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے، جیسے سانپ کی زبان ہو۔ کئی روایات میں مشہور ہے کہ دراصل تلوار دوسانگی نہیں تھی بلکہ یہ اس کی ساخت تھی، جس کی وجہ سے اس کی دھار بہت تیز ہو گئی تھی۔ جس پر ضرب لگتی، اس کا گوشت چر جاتا۔ اسی وجہ سے یہ چاپڑ یا کاٹ کر رکھ دینے والی، یعنی 'ذوالفقار' مشہور ہو گئی۔

ایک روایت کے مطابق، یہ محمد ﷺ کی ذاتی تلوار تھی جو مشہور ہے کہ انہوں نے احد کی لڑائی میں اس وقت، جب علی کی اپنی تلوار ٹوٹ گئی تو یہ ان کو تھمادی تھی۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ علی کو محمد ﷺ کی طرف سے مثال، وراثت کی صورت ملی تھی۔ بہرحال، علی نے اس تلوار سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ تاریخ میں

جا بجا ان کے جنگی کارناموں کا ذکر مل جاتا ہے۔ اسی طرح ان جھڑپوں اور جنگوں میں خود انہیں بھی کئی زخم آئے۔ لیکن اس کے باوجود، علی کو آپؐ نے 'اسد اللہ' کا خطاب دیا تھا۔ جس کا مطلب، 'اللہ کا شیر' ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر جن پوسٹروں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں، جن میں ایک قوی اور بھاری بھرکم شیر علی کے قدموں میں سر اٹھائے، انتہائی غرور سے بیٹھا ہوا نظر آجاتا ہے۔ وہ تصویر کے اندر سے ناظر کو قدرے پرسکون مگر انتہائی کٹھور نظر سے تاڑ رہا ہوتا ہے۔ اس انداز پر اس کی بے پناہ طاقت کا پتہ ملتا ہے۔

علی کا یہ خطاب، یعنی 'خدا کا شیر' مادی نہیں رہا۔ اس کا مقصد روحانی اور جسمانی، دونوں ہی حالتوں میں طاقتور ہونے کا پیغام دینا تھا۔ شیعہ گھرانوں میں ٹنگے ان پوسٹروں سے بھی ان کی نظر آنے والی شخصیت پر یہی گماں ہوتا ہے۔ ابھرے گال، سرمے میں کجل آنکھیں اور سر پر بدوی عربوں کی طرح ہرے رنگ کی پوشاک، یعنی 'کفیہ'، شانوں پر ڈھلکا ہوتا ہے۔ ہرا رنگ، محمد ﷺ کے کنبے کے جھنڈے کا ہوا کرتا تھا۔ یعنی، اس سے نہ صرف علی کی آپؐ سے نسبت کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کے ساتھ خالص صحرائی اور قدیم عرب روایت سے تعلق واضح کرنا بھی مقصود ہے۔ قصہ مختصر، ان تصاویر میں علی کو ایک معتبر اسلامی شخصیت کے طور پر اجاگر کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔

تو کیا ہوا اگر تیرہ برس کی عمر میں علی ایک کمزور نظر، پتلی ٹانگوں والے، فربہ دھڑ کے مالک نوعمر لڑکا ہوا کرتے تھے۔ شیعہ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ علی کی اصل تصویر نہیں ہے بلکہ ان کا نقش یا کہیے، صرف ایک خاکہ ہے۔ ان شبیہوں سے تو صرف اور صرف علی کو محسوس کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لوگوں کو یاد رہتا ہے کہ علی علیہ السلام، ان کے لیے کیا معنی رکھتے ہیں۔ ورنہ علی تو وہ ہیں جن کا کوئی بدل نہیں۔ ان کی پرورش اور تربیت خود محمد ﷺ نے کی، انہیں ہمیشہ اپنے سائے تلے رکھا، انہیں اندرون تک رسائی دی، یعنی اسلام کی اصل روح ان میں پھونک دی۔ علی کو دین کی وہ سمجھ تھی، اتنی ذہانت، فہم اور فراست تھی کہ کسی بھی دوسرے شخص کے پاس نہ ہے، نہ تھی اور نہ ہو گی۔ یعنی، علی ہر شخص سے بڑھ کر ہیں، ممتاز اور ان کا مقام عالی ہے۔ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ علی اپنی زندگی میں دنیا کے سب سے وجیہہ اور خوبرو مرد نہیں ہوا

کرتے تھے؟ یہ روحانیت ہے جہاں ان کا پڑاؤ ہے، یہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی روح جاوداں ہے اور یہ علی کی روحانی تاثیر ہے جو آج بھی اتنی ہی پراثر ہے جتنی کہ شاید وہ اپنے زمانے میں بھی نہیں رہی ہوگی۔ مطلب یہ کہ علی کا مقام اور عزت واکرام تو آج ہمیشہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہر نئے زمانے میں یہ رتبہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر نئے دور کو ان کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت رہتی ہے۔

شیعہ سے پوچھیں تو ان کے مطابق، علی کا یہ مقام آپؐ اسی وقت جان گئے تھے جب رشتہ داروں کے مجمع میں علی نے آگے بڑھ کر حمایت کے الفاظ کہے۔ اتنے بڑے موقع پر واحد انہوں نے ساتھ کی یقین دہانی کرائی۔ 'محمد ﷺ نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں' علی سے روایت ہے، 'اور کہا، 'یہ ہے میرا بھائی، میرا امین اور متولی۔۔۔ تو، تم سب اس کی بات مانو اور جو حکم دے، تعمیل کرو'۔ اس محفل میں محمد ﷺ کی یہ بات سنتے ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان دونوں کا مذاق اڑانے لگے، علی کے والد ابو طالب سے کہنے لگے، 'محمد ﷺ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی بات سنو اور اس کے حکم کی تعمیل کرو'۔ لوگ دیر تک ہنستے رہے، ٹھٹھے اڑاتے رہے۔

اگر علی سے منسوب اس روایت کو یوں دیکھا جائے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے تو ایک بات صاف نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ نہ صرف علی کا مقام محمد ﷺ کی جانشین کے طور پر واضح ہے بلکہ ساتھ یہ بھی کہ آگے چل کر بڑے منظر نامے پر اسلام کا واقعی مطلب کیا ہوگا؟ یعنی، نئی ریت یہ ہوگی کہ روایتی طور پر باپ کو بیٹے پر اختیار کا نظام اب اتھل پتھل ہو جائے گا۔ کوئی ایک قبیلہ، دوسرے پر حاکم نہیں ہوا کرے گا۔ ایک قبیلے کے اندر کوئی کنبہ دوسرے کا حق غصب کر سکے گا اور نہ ہی کوئی ایک خاندان باقی سب سے ممتاز ہوا کرے گا۔ ایک خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہوں گے اور ہر شخص اس نئے معاشرے میں عزت کا حقدار ہوگا۔ یہ نیا معاشرہ، امہ کہلائے گا۔

بہر حال، علی سے یہ روایت منسوب ہونے کے باوجود، اسے عام طور پر اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا واقعی جانشینی کی بات ہو رہی تھی یا پھر محمد ﷺ اس محفل کے مزاج کے عین مطابق ایک نکتہ واضح کر رہے تھے؟ علی بمشکل تیرہ برس کا مخنی سا، کمزور اور بیمار لڑکا

تھے۔ وہ تو ابھی صحیح طریقے سے تلوار پکڑنے لائق بھی نہیں تھے، کہاں 'ذوالفقار' کا خطاب، روحانی تاثیر اور کیسی جانشینی؟ یہ تو علی کا حال تھا، دوسری طرف محمد ﷺ بھی خود اپنے بل بوتے پر ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ ایک یتیم لڑکا ہوا کرتے تھے جس نے پہلے ایک بدو گھرانے، پھر دادا اور زیادہ تر اپنے چچا کے ہاں گزارہ کیا تھا۔ ان کے پاس جو دولت اور مال و اسباب تھا، وہ بھی ان کی دولت مند بیوی خدیجہ کے مرہون منت تھا۔ وہ ایک ماہر آڑھتی ضرور تھے لیکن وہ ان کا ہنر تھا، جسے ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص استعمال میں نہیں لا سکتا تھا۔ چنانچہ، اس وقت تک محمد ﷺ اپنے ناطے داروں کے لیے ایک عام شخص کے سوا کچھ بھی نہیں تھے۔ ان کے ناطے داروں کو یہ ہضم نہیں ہو رہا تھا کہ ایک دم سے، یہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور خود کو خدا کا پیغمبر قرار دے رہا ہے؟ محمد ﷺ کا یہ دعویٰ سننے والوں کے لیے ایک معما تھا، کیونکہ یہ ابھی پوری طرح واضح نہیں تھا۔ ایسے میں، ایک جانشین کی تقرری تو بہت دور کی کوڑی کہلائی جائے گی۔ قصہ مختصر، محمد ﷺ کے پاس اس وقت تک صحیح معنوں میں ایسی کوئی شے نہیں تھی جس کے لیے وہ جانشین کی تقرری کرتے۔ یہ شروع کا دور تھا، ابھی اسلام کے ماننے والے صرف اور صرف تین لوگ تھے۔ محمد ﷺ، خدیجہ اور علی علیہ السلام۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ نیا دین جلد ہی ایک تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا اور پھر آگے چل کر دنیا میں تیسرا بڑا مذہب قرار پائے گا۔ یہ عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے والا نظریہ ثابت ہوگا اور بالآخر، اسی کے بل بوتے پر ایک بڑی سلطنت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ سب تو ہو کر رہا لیکن اس وقت، یعنی جب یہ واقعہ پیش آیا۔۔۔ محمد ﷺ ایک ایسا شخص ہیں، جن کے ہاتھ میں کچھ تھا اور نہ ہی ان کے پاس وراثت بانٹنے کے لیے کوئی شے ان کے نام تھی۔

محمد ﷺ کے یہ حالات اگلی دو دہائیوں میں مکمل طور پر تبدیل ہو جائیں گے۔ جیسے جیسے اسلام کا آفاقی پیغام پھیلا، محمد ﷺ کے اختیار میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا قبیلہ، قصبے، نخلستان، شہر اور بڑی آبادیاں اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو چکیں تو ایک باقاعدہ ریاست نے جنم لیا۔ اس ریاست میں، یہ نئے پیروکار اور امہ کا دوسرا حصہ یعنی جو لوگ ایمان نہیں لائے تھے، وہ بھی باقاعدگی سے ریاست کو ٹیکس دینے لگے۔ اس ٹیکس کو زکوۃ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، جنگوں میں بے بہا مال غنیمت جمع ہوتا رہا اور قبائلیوں نے اپنی حمایت اور اتحاد کا یقین دلانے کے لیے امہ کے مال خانوں میں دولت کا انبار لگا دیا۔ یوں، امہ نہ

صرف پھیلتی رہی بلکہ وقت کے ساتھ اس کی طاقت اور مال دولت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ محمد ﷺ کے انتقال کے وقت، حال یہ تھا کہ تقریباً پورا جزیرہ عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا اور اب وہ ایک شناخت، یعنی واقعی عرب کہلائے جانے لگے تھے۔ اس سالہا سال کی تحریک میں محمد ﷺ نے بارہا، وقتاً فوقتاً کئی اہم موقعوں پر باور کرایا تھا کہ وہ علی کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک، علی وہ واحد ہستی تھے جنہوں نے تب، جب وہ خود لڑکپن میں ایک کمزور سا، لاغر لڑکا ہوا کرتے تھے، تب ان کے ساتھ کھڑا ہونے کو ترجیح دی تھی، جب محمد ﷺ کے قریبی رشتہ دار بھی نخوت سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

'میں علی سے ہوں اور علی مجھ سے ہے۔ وہ میرے بعد مومنوں کا والی ہے'۔ محمد ﷺ کہا کرتے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ علی کی مثال ان کے لیے ویسی ہی ہے جیسی، 'ہارون کی موسیٰ' کے لیے ہوا کرتی تھی۔ آپؐ واضح الفاظ میں کہا کرتے تھے۔ 'صرف پکے ماننے والے ہی علی سے محبت کرتے ہیں۔ علی سے مرتدوں کے علاوہ کوئی نفرت نہیں کر سکتا۔۔' اسی طرح ایک انتہائی مشہور روایت، بالخصوص صوفیاء تو اس کا خوب پرچار کرتے ہیں۔ اس روایت میں، علی علم اور عرفان کے ولی، سرپرست قرار دیے گئے ہیں۔۔ محمد ﷺ سے منسوب ہے کہ انہوں نے کہا، 'میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہے۔۔۔'۔

شیعہ عالم خاصی شد مد سے ان روایات اور اقوال کا حوالہ دیتے ہیں اور کہا یہ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ کی منشا بھی یہی تھی کہ علی ان کے جانشین ہوا کریں گے۔ لیکن، ان تمام روایات میں، کسی بھی ایک موقعہ پر صاف صاف یہ نہیں ملتا کہ محمد ﷺ نے واضح طور پر ایسا کہا ہو۔ کہیں بھی، لفظ 'جانشین' نہیں ملتا۔ ان میں سے کسی قول میں کلی یہ نہیں کہا گیا کہ، 'یہ وہ آدمی ہے جسے میں اپنے بعد تمہاری رہبری کے لیے نامزد کرتا ہوں'۔ تمام روایات میں ایسا بظاہر کہا گیا یا کہیے، اشارتاً بات کی گئی۔ کہیں بھی کھلے عام کچھ نہیں کہا۔ یہی وجہ ہے کہ تب اور آج بھی جہاں یہ اشارے اور کنایے بعض لوگوں کے لیے علی کی جانشینی کا ناقابل تردید ثبوت ہیں تو دوسری جانب باقی لوگوں کے لیے یہ غیر واضح، مبہم یا مہمل بیانات ہیں۔

خیر، ایک چیز ایسی ہے جو کسی بھی طرح سے غیر یقینی یا مشتبہ نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص، چاہے وہ سنی ہو یا شیعہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ علی اور محمد ﷺ کے بیچ بے انتہا قربت تھی۔ وہ دونوں ایک

دوسرے کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور ان کا آپس میں تعلق مثالی تھا۔ بلکہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ آپؑ اور علی کے بیچ اتنی مشابہت پائی جاتی تھی کہ محمد ﷺ کی زندگی کے ایک انتہائی خطرناک موڑ، یعنی ہجرت کی رات علی کو قریش کو دھوکہ دینے کے لیے ان کے متبادل کا کردار سونپا گیا تھا۔

جب مکہ کے سرداروں نے مل کر محمد ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سے پہلے کہ قاتل ان کے سر پر پہنچتے، وہ اسی شام مدینہ کے لیے نکل گئے۔ قریش کے منجھے ہوئے جنگجو آپؑ کے مکان کے باہر ان کے نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس زمانے میں قبائلی رواج کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس نازک مرحلے پر بھی قاتل عرب روایت کی پاسداری کرتے تھے۔ یعنی کسی کو اس کے گھر کے اندر قتل کرنے سے باز آرہے تھے۔ ایسے میں، جب محمد ﷺ پہلے ہی ابو بکر کے ساتھ نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مکان کے اندر، یہ علی تھے جو رات کو محمد ﷺ کا لباس زیب تن کر کے، ان کے بستر پر سوئے رہے۔ قاتلوں کو گماں ہوا کہ شاید محمد ﷺ گھر کے اندر ہی موجود ہیں۔ اگلی صبح، علی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر باہر نکلے تو سارے قاتل انہیں محمد ﷺ سمجھ کر حملے کے لیے آگے بڑھے، لیکن انتہائی قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ محمد ﷺ نہیں بلکہ علی تھے اور وہ اس مماثلت کے ہاتھوں، ان کے لیے ایک نیا قضیہ پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سنی اور شیعہ، دونوں ہی متفق ہیں کہ یہ علی کی دیدہ دلیری تھی، ان کی محمد ﷺ سے انسیت اور محبت تھی۔ علاوہ ازیں یہ ان دونوں کے بیچ غیر معمولی مشابہت تھی، جس کی وجہ سے اس رات قریش کو دھوکہ ہوا اور آپؑ نہایت آسانی سے مکہ کی حدود پار کر گئے۔ بعد ازاں، علی تن تنہا ہی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور دونوں شہروں کے بیچ صحرا کا کٹھن سفر انہوں نے پیدل ہی طے کیا۔

ایک لحاظ سے یہ بھی ہے کہ ایسا ہونا مشیت ایزدی تھی، تقدیر کا لکھا کہیے کہ ہر لحاظ سے صرف علی ہی تھے جو محمد ﷺ کا متبادل ثابت ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ ہے۔ اگرچہ ان چچازادوں کی عمروں میں انتیس سال کا فرق تھا لیکن اس کے باوجود دونوں کے تعلق میں ایک عجب رنگ تکافو تھا۔ مطلب یہ کہ ان کی تقدیر میں بھی زبردست مماثلت تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر رہے تھے۔ وہ یوں کہ، دونوں نے ہی بچپن اور پھر لڑکپن میں پرورش پانے کے لیے ایک دوسرے کے گھر میں پناہ لی تھی۔ جیسے،

محمد ﷺ نے یتیمی کے بعد اپنے چچا ابو طالب کے گھر میں پناہ لی تھی۔ یہ علی کی پیدائش سے کافی پہلے کا واقعہ ہے اور پھر کئی برسوں بعد جب ابو طالب پر برا وقت آیا، یعنی ان کی معاشی حالت بہت بگڑ گئی تو تب محمد ﷺ اور خدیجہ نے آگے بڑھ کر علی کو گود لے لیا۔ اس وقت، محمد ﷺ ایک کامیاب آڑھتی بن چکے تھے اور ان کے گھر میں خوشحالی تھی۔ علی نے محمد ﷺ کے زیر سایہ ان کی چار بیٹیوں کے ساتھ پرورش پائی۔ آپؐ کے یہاں، علی کا مقام اس بیٹے کا تھا جو محمد ﷺ اور خدیجہ کو کبھی مل نہیں سکا تھا۔ یوں، پیغمبر ان کے دوسرے والد اور خدیجہ ان کی دوسری ماں جیسی تھیں۔

وقت کے ساتھ، ان دو اصحاب کے بیچ تعلق گہرا ہی ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ علی کو محمد ﷺ کا تقریباً لے پالک، بلکہ حقیقی بیٹا سمجھنے لگے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا، آگے چل کر ان کے بیچ نسبت اور بھی گہری ہو جائے گی۔ ایسا لگے گا جیسے محمد ﷺ کو احساس ہوا ہو کہ اس قدر گہرا تعلق بھی کافی نہیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھیں گے اور خود ہی اپنی سب سے بڑی بیٹی فاطمہ کا رشتہ علی سے طے کر دیں گے۔ حالانکہ، فاطمہ سے نکاح کے کئی دوسرے لوگ بھی خواہاں تھے۔

ان دوسرے لوگوں میں سب سے نامی گرامی دو اشخاص وہ ہیں جن کے مقابل علی کو محمد ﷺ کے بعد جانشینی منوانے کی طویل اور صبر آزما مشقت کرنی پڑے گی۔ یعنی، پہلے تو عائشہ کے والد ابو بکر تھے۔ ابو بکر، محمد ﷺ کے دیرینہ ساتھی تھے جو ہجرت کے پر خطر سفر پر آپؐ کے ساتھ رہے۔ دوسرے آدمی، حفصہ کے والد، زیرک جنگجو عمر تھے۔ بعد ازاں، ہم دیکھیں گے کہ عمر وہ شخص ہیں جو اسلام کو جزیرہ عرب سے باہر پورے مشرق وسطیٰ میں پھیلا دیں گے۔ لیکن، جہاں ابو بکر اور عمر نے اپنی بیٹیوں کو محمد ﷺ کے نکاح میں دیا تھا، محمد ﷺ نے انہیں فاطمہ کا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مطلب واضح ہے، یعنی ایک ایسے معاشرے میں جہاں 'دینے والا ہاتھ، لینے والے ہاتھ' سے برتر ہوتا ہے، چنانچہ، وہ شخص جو اپنی بیٹی کا رشتہ دیتا ہے، وہ جسے رشتہ دیا جائے، اس کو انتہائی عزت دینے کے مترادف ہے۔ یہاں، ابو بکر اور عمر، دونوں نے ہی اپنی اپنی بیٹیوں کا ہاتھ محمد ﷺ کو دیا تھا لیکن، محمد ﷺ نے جواباً انہیں یہ عزت نہیں دی بلکہ انہوں نے ان دونوں کی بجائے علی کو ترجیح دی۔

یہ اس معاملے میں واحد امتیاز ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد ﷺ اس رشتے کو کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ وہ فاطمہ اور علی کی شادی کو کس قدر اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ، وقت آیا تو نہ صرف محمد ﷺ نے خود ان دونوں کا نکاح پڑھوایا بلکہ علی کے لیے شرط رکھی کہ فاطمہ سے نکاح کے بعد، یہ نویلا جوڑا محمد ﷺ اور خدیجہ کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے، یک زوجگی کی شادی برقرار رکھے گا۔ یوں، کہا جا سکتا ہے کہ اب علی اور فاطمہ، نئے محمد ﷺ اور خدیجہ ہوا کریں گے۔ علی اور فاطمہ کے یہاں، وہ بیٹے پیدا ہوں گے جو محمد ﷺ اور خدیجہ کے یہاں جانبر نہیں ہو پائے تھے۔

ایسا ہو بھی گیا، وہ شخص جس کے یہاں اولاد نرینہ بچ نہیں پائی، جلد ہی دو خوبصورت نواسوں کا نانا بن گیا۔ یہ دو بچے، حسن اور حسین علیہ السلام تھے۔ ان دونوں کی عمروں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ جلد ہی حسن اور حسین علیہ السلام، محمد ﷺ کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سود، اصل سے پیارا ہوتا ہے۔ نانا اور نواسے، دادا اور پوتے کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ، دنیا میں اس سے کہیں بڑھ کر، سچی اور خالص محبت دوسری نہیں ہوتی۔ محمد ﷺ بھی ان دونوں بچوں سے بہت محبت رکھتے تھے، اس قدر قربت تھی کہ ان کی موجودگی میں ان کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ لوگوں نے پہلی بار محمد ﷺ کو کھل کر مسکراتے، یہاں تک کہ کئی موقعوں پر ہنستے ہوئے دیکھا۔ ان کی چھاتی فخر سے چوڑی رہا کرتی اور وہ ان بچوں کے ساتھ کھیل میں گم ہو جاتے۔ کئی کئی گھنٹے، یہ بچے آپؐ کی گود میں دبکے رہتے۔ محمد ﷺ ان کو چومتے، ان سے کھیلتے، باتیں کرتے رہتے۔ روایت ہے کہ وہ اکثر اپنے ارد گرد لوگوں اور محافل سے بھی بے خبر ہو جاتے۔ کئی موقعے تو ایسے آئے کہ جب محمد ﷺ، حسن اور حسین علیہ السلام کی وجہ سے اپنے رتبے کا بھی خیال نہ کیا۔ زمین پر ہاتھ پیر رکھ کر، جھک جاتے اور یہ ان کی پشت پر سوار ہو کر، گویا گھوڑے پر چڑھے بیٹھے ہوں، یہاں وہاں اٹھکیلیاں کرتے رہتے۔ شیعہ کے مطابق، یہ دو لڑکے محمد ﷺ بلکہ اسلام کا بھی مستقبل تھے۔ علی جو حسن اور حسین علیہ السلام کے والد تھے، خدیجہ کے بعد محمد ﷺ کے انتہائی قریبی اور خیر خواہ تھے، ان کی وجہ سے یہ مستقبل ممکن ہوا تھا۔

جب خدیجہ کی وفات ہوئی، جو ہجرت سے دو سال پہلے کا واقعہ ہے، علی نے بھی ان کا یوں ہی غم منایا

جیسے محمد ﷺ خود رنجیدہ تھے۔ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ وہ اس لیے کہ خدیجہ نے علی کو اپنے سگے بیٹے کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اپنے سارے ارمان، جو اپنا بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے خدیجہ کے دل میں اٹھتے تھے، علی پر پورے کیے تھے۔ بعد ازاں، خدیجہ علی کی ساس بھی ہوں گی۔ علی جس قدر محمد ﷺ پر جان نثار کرتے تھے، ویسے ہی ان کے دل میں خدیجہ کی قدر و منزلت تھی۔ وہ ان دونوں، یعنی محمد ﷺ اور خدیجہ کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کے بیچ محبت اور انسیت سے خوب واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی کو پورا علم تھا کہ خدیجہ کے بعد آپؐ چاہے جتنی بار شادی کر لیں، وہ خدیجہ کی یاد کو زائل نہیں کر پائیں گے۔ کوئی بھی عورت خدیجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کسی کا رتبہ خدیجہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔۔۔ بالخصوص، وہ تو ہرگز نہیں جو ہر وقت خود کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔

ہار کی گمشدگی سے بہت پہلے، یعنی اس واقعہ کے نتیجے میں اٹھنے والے طوفان سے بھی بہت پہلے، علی عائشہ کے افسوں، چنچل پن اور سحر سے سخت نالاں رہا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں، محمد ﷺ کی سب سے چھوٹی بیوی کسی بھی صورت خدیجہ کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔ یہی نہیں، وہ سمجھتے چلے آ رہے تھے کہ یہ خدیجہ کے ساتھ ناانصافی ہے، عائشہ کسی بھی طرح ان کی جگہ لینے کی اہل نہیں تھیں۔ یہ بیر، یک طرفہ نہیں تھا۔ عائشہ بھی علی سے شاکی رہتی تھیں۔ ان کے نزدیک، علی کا خدیجہ کی یاد سے یوں جڑا رہنا خاندان میں سب کے لیے، بالخصوص محمد ﷺ کے لیے یاد دہانی تھی کہ وہ تمام عورتوں سے بہتر ہوا کرتی تھیں۔ خود عائشہ کو ہر وقت یہ خیال رہتا کہ خدیجہ واحد رقیب ہیں، جنہیں وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی زیر نہیں کر سکتیں۔ پھر، علی کے بیٹے تھے۔ یہ دونوں بیٹے، عائشہ کو روز یاد دلاتے کہ وہ خود کبھی نرینہ اولاد پیدا نہیں کر سکیں گی۔ عائشہ کو گلہ تھا کہ یہ لڑکے کیوں محمد ﷺ کی آنکھ کا تارا ہیں؟ انہیں تو عائشہ سے محبت ہونی چاہیے تھی، محمد ﷺ کو ان کے سوا کوئی دوسرا کیوں دکھتا ہے؟ وہ دیکھ سکتی تھیں کہ کیسے آپؐ حسن اور حسین علیہ السلام کے ساتھ انتہائی خوش باش نظر آتے، کھلکھلاتے رہتے۔ انہیں غم تھا کہ یہ لڑکے، آپؐ کو ان سے کہیں زیادہ عزیز تھے، محمد ﷺ کی اصل خوشی تھے۔ چلو، وہ تو بچے تھے۔ یہ علی اور فاطمہ کو کیا ہوا؟ فاطمہ جو بادامی رنگت والی منکسر مزاج والی تھیں، جبکہ علی جو محمد ﷺ کو انتہائی عزیز تھے، ان کا رتبہ بھی اچھا خاصا تھا۔۔۔ لیکن، ان دونوں نے بھی تو، عائشہ کے خیال میں انہیں وہ عزت کبھی نہیں دی جس کی وہ حقدار تھیں۔ باقی لوگ تو ان کی

امتیازی حیثیت بلا چوں وچراں مانتے تھے، اگر کوئی اس کا قائل نہیں تھا تو وہ صرف یہی لوگ تھے۔ فاطمہ اور علی تھے، اب ان کے بچے بھی ان سے محمد ﷺ کو چھینتے جا رہے تھے؟

ایک دفعہ تو محمد ﷺ نے عائشہ کو خدیجہ کی بد خواہی کرنے پر سختی سے ٹوک دیا تھا۔ اس بات کا انہیں خاصا دکھ تھا۔ چونکہ، عائشہ معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھیں، نہ ہی وہ آسانی سے کوئی بات بھولتی تھیں، وقت نے بھی اس دکھ کا مداوا نہیں کیا۔ بلکہ، جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، عائشہ کے دل میں یہ گھاؤ گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔ بعد اس کے، وہ اب خدیجہ پر کسی بھی طرح سے بات کرنے، تنقید سے روک دی گئیں۔ یہ تو ماضی کی بات تھی، یعنی وہ کسی بھی طرح خدیجہ کی یاد کو محو نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن، حال اور بالخصوص مستقبل کا احوال یہ تھا کہ وہ ایک بنیادی لیکن انتہائی اہم معاملے میں محروم رہ جائیں گی۔ مطلب یہ کہ محمد ﷺ کا سلسلہ شجرہ، عائشہ کے یہاں آگے نہیں بڑھے گا بلکہ یہ اعزاز بالآخر علی کے گھرانے کو نصیب ہو گا۔ چنانچہ، اب عائشہ کی اس بابت خفگی اور دلی آزردگی خدیجہ کی سب سے بڑی بیٹی، فاطمہ کی طرف مڑ گئی۔

فاطمہ کا عائشہ کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کی مثال دو انتہاؤں کی طرح تھی۔ فاطمہ انتہائی منکسر المزاج، چپ سادھ کر بسر کرنے والی، عاجز اور پس منظر میں زندگی بسر کرنے والی شخصیت تھیں۔ عائشہ کی طرح نہ تو وہ تنومند تھیں اور نہ ہی ان کی طرح زندہ دل اور شوخ یا چنچل ہوا کرتی تھیں۔ اگرچہ وہ پندرہ برس بڑی تھیں لیکن ایسا لگتا جیسے ان پر چھایا گھری ہو، رنگت بجھ کر گندمی ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا، جیسے بیمار ہیں، خون کی کمی کا شکار ہوں۔ پھر، ان کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ محمد ﷺ کو اپنی خوش دلی سے ہنسا نہیں سکتی تھیں، بلکہ وہ تو ان کے سامنے ایسی باادب اور خاموش ہو جاتیں کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ اپنی مرضی سے بات بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب سے حسن اور حسین علیہ السلام دنیا میں آئے تھے، اس کے بعد وہ کچھ کھل کر بات کر لیتیں ورنہ اس سے پہلے تو وہ چھپ کر رہا کرتیں۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ ہوا کہ ان کی جگہ عائشہ نے لے لی تھی۔ فاطمہ کبھی بھی عائشہ کی طرح زندہ دل اور ہنس مکھ نہیں رہیں۔ اس سے ہوا یہ کہ محمد ﷺ کی توجہ بھی ان پر کبھی سیدھی مرکوز نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ، وہ پس منظر میں چلی گئی تھیں لیکن اب، حسن اور حسین علیہ السلام نے توجہ دوبارہ ان کے

گھرانے کی طرف مبذول کروادی تھی۔ دوسری طرف عائشہ کا معاملہ یہ تھا کہ محمد ﷺ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ سے وہ فاطمہ کو اپنا مد مقابل سمجھتی چلی آرہی تھیں، لیکن فاطمہ اپنی طبیعت کے باعث کسی طور بھی عائشہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔

مدینہ بھر میں مشہور تھا کہ اگر محمد ﷺ سے کوئی رعایت درکار ہو تو بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب آپؐ عائشہ کے یہاں سے ہو کر آئے ہوں۔ اس وقت آپؐ کی طبیعت میں نرمی ہوتی ہے، وہ خوش اور طبیعت ہشاش بشاش ہوتی ہے۔ بلاشبہ عائشہ کا اثر ورسوخ تھا اور ایک یا دوسری صورت، وہ اس اختیار کو یوں استعمال میں لاتیں کہ دوسروں کے لیے سبکی اور حقارت کا سامان ہو جاتا۔ یہ ایسی بات تھی، جس کا فاطمہ کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ حالات بالآخر اس نہج پر پہنچ گئے کہ ایک دفعہ محمد ﷺ کی دوسری بیویوں نے فاطمہ سے کہا کہ وہ اپنے والد سے بات کریں۔ وہ عائشہ سے خواہ مخواہ التفات برتتے ہیں۔ انہیں ہم پر فوقیت دیتے ہیں، اتنی ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں؟ وہ جانتی تھیں کہ محمد ﷺ سے بات کرنے کا فائدہ نہیں تھا، لیکن بات کرنی بھی ضروری تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر وہ بات کریں گی تو جس طرح کی صورتحال ہے، شاید انہیں سبکی اٹھانی پڑے۔ پھر، ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی فاطمہ نے بات شروع کی، آپؐ نے انہیں ٹوک دیا۔

'اے میری پیاری بیٹی!' محمد ﷺ نے کہا، 'کیا تم اس سے محبت نہیں کرتیں، جس سے میں محبت کرتا ہوں؟' ظاہر ہے، اس سوال پر فاطمہ کے پاس آپؐ کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

محمد ﷺ کا یہ سوال، ایک طرح سے کہیے تو بس ایک بات معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ باپ اور بیٹی کے بیچ ایک واجبی سا مکالمہ ہے۔ لیکن، روایت میں جس طرح کی روداد درج ہے، آپؐ کی بے صبری صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی یہ خواہش کہ کسی طرح ان کے پیاروں کے بیچ، بالخصوص گھر کی عورتوں کے مابین جاری کشمکش اور کھینچا تانی ختم ہو اور انہیں ریاست کے اہم امور پر توجہ مرکوز کرنے کا وقت مل سکے۔ ساتھ ہی ان کی یہ تمنا بھی نظر آتی ہے کہ قریبی لوگ آپس میں ویسی ہی محبت رکھیں جیسی وہ ان کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اسی طرح، ان کے اس بیان پر یہ گماں بھی ہوتا ہے کہ جیسے وہ باور کراتے ہوں کہ ان کی عائشہ سے محبت کے

سامنے، باقی سب ہیچ ہے۔

خیر، جب فاطمہ واپس گھر پہنچیں تو یقیناً علی نے آخری بات ہی سنی اور سمجھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ فاطمہ رو رہی ہیں اور شرمندگی سے بے حال ہیں۔ علی کی نظر میں یہ نہ صرف فاطمہ بلکہ خود ان کی تضحیک تھی۔ بلکہ، یہ ان کے گھر کے ہر فرد کے لیے بے عزتی کی بات تھی۔ محمد ﷺ خدیجہ کو بھی بھول گئے؟ یہ سوچ کر ہی علی غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ سیدھے ان کے پاس جا پہنچے اور اس بابت استفسار کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ علی کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور وہ محمد ﷺ سے خونی رشتوں کی اس طرح بے عزتی کرنے پر پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ 'کیا آپؐ کے لیے یہ کافی نہیں تھا کہ عائشہ پہلے ہی ہماری عزت نہیں کرتیں۔۔۔ خاطر میں نہیں لاتیں' علی نے کہا، 'لیکن، اب آپؐ نے فاطمہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ صرف عائشہ ہی آپؐ کی چہیتی ہیں؟' محمد ﷺ فاطمہ کو تو نظر انداز کر سکتے تھے لیکن علی کو ٹالنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ، وہ اپنی اس بات کی تلافی کریں گے۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک موقع کا خوب استعمال کیا۔ بازنطینی سلطنت کی جڑیں آہستہ آہستہ عرب کے صحرا میں بھی پھیل چکی تھیں۔ نجران کا شہر جو تجارتی راہداری میں، جنوب کی جانب مکہ اور یمن کے بیچ واقع تھا، جزیرہ عرب میں عیسائیت کا گڑھ تھا۔ قرانی پیغامات میں عرب عیسائیوں کو بالخصوص مخاطب کیا تھا اور کئی موقعوں پر ان کے لیے انتہائی پر اثر، واضح آیات کا نزول دیکھنے میں آیا تھا۔ عرب میں بسنے والے ان عیسائیوں کی مثال ان یہودیوں کی طرح ہی تھی جو کئی صدی پہلے فلسطین سے رومیوں کے خلاف بغاوت ناکام ہونے کے بعد جزیرہ عرب میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جس طرح، اب وہ یہودی عربوں کی روایات اور رسم و رواج میں ڈھل چکے تھے، نجران کے عیسائیوں اور عربوں میں بھی اب امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ عربوں میں قبائلی شناخت تو بہر حال ہمیشہ سے ہی رہی تھی لیکن اب اسلام کا دور آ چکا تھا۔ اسلام کی تو بنیاد ہی لوگوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے پر قائم تھی۔ اس تحریک کی اصل روح، قدیم دین ابراہیمی کا پرچار تھا۔ عربوں میں یہ مقبول عام تھا کہ کعبہ کو پہلی بار آدم نے تعمیر کیا تھا اور پھر دوبارہ اس کی تعمیر نو کا سہرا ابراہیم کے سر جاتا ہے۔ عرب، ابراہیم کے بیٹے اسماعیل کی اولاد ہیں، یعنی ابراہیم ان کے بھی

جدامجد ہیں۔ اسلام، دوسرے مذاہب کی نفی نہیں بلکہ ان میں ایک نئی روح پھونکنے کی تحریک ہے۔ اب کی بار، اسے عرب شناخت مل رہی تھی اور اس جھنڈے تلے اسلام کے پیروکار، یہودی اور عیسائی۔۔۔ حتی کہ ہر شخص امہ کا حصہ قرار دیا جارہا تھا۔

اتنے واضح پیغام کے باوجود بھی نجران کے عیسائی منقسم تھے۔ وہ جو اسلام قبول کرنے کے حامی تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ مقدس روح یا 'شافع' ہیں، جن کی بابت عیسیٰ نے انجیل میں پہلے ہی پیشن گوئی کررکھی تھی۔ دوسری طرف، جو مخالفین تھے، ان کا ماننا یہ تھا کہ جس روح القدس کی غیبی خوش خبری عیسیٰ نے سنا رکھی ہے، اس کے یہاں تو اولاد نرینہ کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں تو ایک بھی بیٹا جانبر نہیں ہو سکا، چنانچہ آپ کسی طرح سے بھی اس شرط پر پورے نہیں اترتے۔ یعنی، وہ شافع نہیں ہیں۔ بہر حال، فیصلہ یہ ہوا کہ بجائے وہ آپس میں الجھتے رہیں، بہتر یہ ہے کہ ایک وفد مدینہ روانہ کیا جائے جو ان کے ساتھ مناظرے کا اہتمام کرے۔ یہ اس زمانے میں مکالمے کا رائج طریقہ کار تھا۔ اس طرف، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوبت مناظرے تک آنے ہی نہ دی۔ بجائے اس کے، وہ مکالمے کے لیے اپنے مشیروں کے ساتھ موجود ہوتے، انہوں نے اپنے ساتھ خون کے رشتہ داروں کو ساتھ بٹھالیا۔ علی علیہ السلام، فاطمہ، حسن اور حسین علیہ السلام کے سوا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کی آمد پر کچھ کہنے کی بجائے، اپنے خاندان کے لوگوں کو اشارے سے قریب بلالیا۔ پھر، آہستگی سے پوری دانستگی میں، جب سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے، آپؐ نے اپنا چوغے کے دونوں کونے پکڑ کر اپنے خاندان کے انتہائی قریبی لوگوں کے سر پر اونچا تان لیا۔ یہ وہ ہیں جنہیں میں نے اپنے سائے تلے جگہ دی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا۔ یہ وہ ہیں جنہیں آپؐ نے مثال، خود سے لپٹا لیا ہے، انہیں اپنا آپ اوڑھنے کو دے دیا ہے۔ یہ ان کے انتہائی پیارے، قریبی اور سب سے عزیز لوگ ہیں۔ شیعہ بعد میں انہیں اہل بیت کے نام سے یاد کیا کریں گے، جس کا مطلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے سے تعلق رکھنے والے، مراد ہے۔ اس واقعہ کو، 'چوغے کا واقعہ' سے موسوم کیا جائے گا۔

یہ موقع محل کے حساب سے انتہائی عمدہ مظاہرہ تھا۔ عرب عیسائیوں کے یہاں ایک روایت مشہور

تھی۔ کہا جاتا کہ آدم کو اپنے زمانے میں کشف ہوا تھا۔ جس میں، وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انتہائی روشن کرن ہے جس کے گرد چار دوسری روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ پوچھنے پر خدا نے انہیں بتایا تھا کہ یہ ان کی پیغمبرانہ آل ہے۔ یعنی، آدم کی نبوت کا آخری سرا ہیں۔ یقیناً محمد ﷺ نے بھی عیسائیوں کے یہاں مشہور اس روایت بارے سن رکھا تھا اور جانتے تھے کہ نجران کے عیسائی جب چوغہ تلے ان کے گھرانے کے چار افراد کو دیکھیں گے تو قائل ہو جائیں گے کہ آدم کی پیغمبرانہ پشت کے وہی اصل وارث ہیں۔ اولاد کا جہاں تک تعلق ہے، حسن اور حسین علیہ السلام ان کی اولاد ہیں اور عیسیٰ نے جس مقدس ہستی کا غیبی تذکرہ کر رکھا ہے، وہ کوئی اور نہیں بلکہ آپؐ ہی ہیں۔ ہوا بھی یہی، نجران کے عیسائی یہ منظر دیکھتے ہی قائل ہو گئے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے اسلام قبول کر لیا۔

چوغے کا واقعہ صرف عیسائیوں کے لیے نہیں تھا۔ محمد ﷺ نے اسی موقع پر ایک طرح سے علی اور فاطمہ کو بھی پیغام دے دیا تھا۔ وہ کہنا چاہ رہے تھے کہ وہ اپنی اولاد، اپنے گھرانے سے نہ صرف محبت رکھتے ہیں بلکہ ان کے بیچ کہیں گہرا، خون کا رشتہ ہے۔ وہ جان لیں کہ خون کا حق پہلا ہوتا ہے، اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ چوغے تلے، لاولد عائشہ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

یوں، جب محمد ﷺ نے گمشدہ ہار کے واقعہ میں علی سے مشورے کے لیے رجوع کیا تو ایسا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس بابت، اپنے خاندان، سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی کے سوا وہ کس سے رجوع کرتے؟ لیکن، دوسری طرف عائشہ کے خیال میں، ان سے رجوع کرنا، انتہائی غیر موافق بات تھی۔ یوں کہیے، یہ عائشہ کے لیے ایک بھیانک خواب جیسا تھا۔ ان کے مطابق ان کو درپیش حالات میں اس سے بدتر ہونا ممکن نہیں تھا کہ محمد ﷺ علی سے مشورہ مانگ رہے تھے۔ لیکن، ان کی جگہ پر کھڑے ہو کر سوچیں تو یہ واقعی ایسا ہی لگتا ہے۔ ویسے بھی، یہ ان سے منسوب ایک روایت ہے اور اس نوعیت کا یہ تاریخ میں واحد حوالہ ہے۔ عائشہ کے علاوہ کوئی دوسرا راوی نہیں ہے۔ خیر، روایت سے ایسا لگتا ہے کہ علی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جو مشورہ دیا، وہ ان حالات میں کسی بھی زاویے سے دیکھ لیں، کند اور کھنڈا ہی نظر آتا ہے۔ حیران کن طور پر، علی نے انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور ٹھسے سے انتہائی سخت مشورہ دیا۔ ویسے تو، علی اپنی

شائستگی اور خوش گفتاری کے لیے مشہور رہے ہیں۔ ان کی تقاریر، خطوط اور خطبات کا مجموعہ، 'نہج البلاغتہ'، جس کا مطلب 'فصاحت/بلاغت کا راستہ' ہے، آنے والی صدیوں میں زبان اور بیان کی روح اور مثالیے کے طور پر پڑھا اور اپنایا جائے گا۔ علی فہم اور فراست کے لیے بھی مشہور تھے، انہیں اہم معاملات کی ایسی سمجھ ہوتی تھی، جس کی مثال دوسری نہیں ملتی۔ ہم آج بھی ان کی شخصیت کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ وہ بلا شبہ ایک جنگجو اور عالم کا حسین علیہ السلام امتزاج تھے۔ وہ دلیر تھے، شجاعت میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ کردار انتہائی بلند اور اولوالعزم شخص تھے۔ لیکن، یہاں کیا ہوا؟ عائشہ کے خیال میں علی اس موقع پر انتہائی کٹھور ثابت ہوئے، شائستگی تو دور کی بات، انہوں نے تو ساری حدیں پار کر دیں۔

عین ممکن ہے کہ علی نے محمد ﷺ سے بات کرتے ہوئے تفصیل سے حالات پر روشنی ڈالی ہو گی مگر عائشہ نے روایت میں صرف اس کے لب لباب یا کہیے حاصل مطلب کا ذکر کیا ہے۔ یا، کیا ایسا ہوا کہ علی کے صبر کا پیمانہ واقعی لبریز ہو چکا تھا؟ وہ روز روز کی اس جھک جھک سے تنگ آ چکے تھے؟ یا وہ اب عائشہ کو کسی بھی صورت مزید برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے؟ جو بھی تھا، ہم وثوق سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ علی کا مشورہ بعض لوگوں کو فیصلہ کن، کھرا اور حالات کے عین مطابق جبکہ دوسروں کو معمول سے سوا، روکھا اور ٹکا سا معلوم ہو گا۔

'اس کی طرح کی کئی عورتیں ہیں' علی نے کہا، 'اللہ نے آپ کو بندشوں سے آزاد کر رکھا ہے۔ عائشہ کی جگہ باآسانی پر ہو سکتی ہے'۔ مراد یہ تھی کہ محمد ﷺ کو یہ فکر چھوڑ دینی چاہیے، ان کے پاس کئی دوسرے راستے بھی ہیں، انہیں کوئی کمی نہیں۔ کئی مواقع ہیں۔ وہ عائشہ کو طلاق دے دیں اور یوں اس سارے قضیے سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔

یہ اسلام کی بنیاد میں بچھی تحتی چٹان میں پہلی دراڑ تھی۔ یہ کٹ پھٹ، مثال اس کی ایسے تھی کہ پہلے پہل تو بمشکل نظر آتی ہے، بلکہ محسوس بھی نہیں ہوتی۔ لیکن، بعد ازاں یہ ایک فالٹ لائن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے اور گاہے بگاہے بھونچال آتے رہتے ہیں۔ اس طرح وقت کے ساتھ چٹان تڑکتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سوائے دھول کے کچھ نہیں بچتا۔ علی کے

الفاظ، بے سوچے سمجھے یوں ہی عائشہ سے جان چھڑانے کا مشورہ دینے سے صرف تحقیر یا حقارت کی چبھن نہیں ہوئی بلکہ یہ گھاؤ تو عائشہ کی ہڈیوں کے گودے میں اتر گیا۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے۔ اگر عائشہ سے منسوب روایت کو ویسے ہی پرکھا جائے جیسا کہ انہوں نے اسے رقم کروایا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ یہ علی کی بے ساختگی ہی تھی جس سے ایک انسانی خاصیت، یعنی ترغیب دینے کی صلاحیت اور معترف ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ عائشہ سے منسوب اس روایت میں انہیں یوں بیچ راہ میں چھوڑ دینے، حقارت کی نظر سے تولنے اور نا چیز سمجھنے سے ایسا بھی لگتا ہے جیسے علی واقعی عائشہ کی بد چلنی کے قائل تھے۔ یہ بات وہ کسی طور بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ بالخصوص محمد ﷺ کے گھرانے کے کسی فرد کے ذہن میں ایسی بات کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ مرتے دم تک وہ اس بات کو نہیں بھولیں، وہ بعد اس کے، ہمیشہ علی سے بد گماں رہیں۔ وہ ان کی آنکھ میں ہمیشہ چبھتے رہے۔

تاریخ میں اس بابت، اس ایک روایت کے سوا کوئی دوسرا حوالہ موجود نہیں ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ علی نے اس بابت تفصیلاً کیا کہا تھا؟ یقیناً، انہوں نے مزید بھی کچھ کہا ہو گا۔ نہ صرف یہ کہ اتنی مختصر بات، وہ بھی اتنی بڑی بات، جس میں بے انتہا اختصار اور روکھا پن ہے، عجیب طرز ہے۔ عام روش سے کوسوں دور ہے۔ لیکن، وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ علی نے بھلے کچھ بھی کہا ہو، اس سے کسی طور بھی محمد ﷺ کی مشکل حل نہیں ہوتی تھی۔ عائشہ کو طلاق دینا کسی طور بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ لوگوں کی زبان کو کون روکتا، بلکہ اس طرح تو افواہیں زور پکڑ لیتیں۔ محمد ﷺ کا اختیار اور ساکھ ختم ہو کر رہ جاتی۔ اس مسئلے کا حل تو صرف یہ تھا کہ انسانوں سے بڑی کوئی ذات گواہی دیتی۔ ایسا، ہو کر بھی رہا۔

تین ہفتوں کی مسلسل کوفت اور تذبذب کے بعد، محمد ﷺ سیدھا ابو بکر کے گھر عائشہ سے منہ در منہ سوال جواب کرنے پہنچ گئے۔ یہاں، عائشہ نے ایک بار پھر اپنی پاک دامنی کی قسم اٹھائی۔ محمد ﷺ پر پیغمبرانہ حال طاری ہو گیا۔ عائشہ نے اس وقت کا واقعہ کچھ یوں بیان کیا ہے، 'رسول خدا چادر میں لپٹے، لیٹے ہوئے تھے اور سر کے نیچے چمڑے سے بنا ایک تکیہ رکھا ہوا تھا۔ پھر، کافی دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے جسم سے پسینہ یوں بہہ رہا تھا جیسے موسم سرما کے دنوں میں بارش ہوتی ہے۔ انہوں نے

ابروؤں سے پسینہ نچوڑااور کہنے لگے، 'مبارک ہو عائشہ ! اللہ نے تمہاری پاکیزگی کی گواہی دی ہے'۔

یہ الہام کا بروقت نزول تھا۔اسی دن، محمد ﷺ نے عوامی سطح پر اس ربانی گواہی کی اطلاع عام کردی۔ آج، یہ الہامی الفاظ قران کی چوبیسویں سورت کا حصہ ہیں۔ یہ آیات کچھ یوں ہیں، 'جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں، اور انہیں سزا مل کر رہے گی'۔اسی طرح، 'لیکن جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گماں کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟' آگے چل کر پوچھا گیا، 'جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی'۔ جھڑکنے کی طرح کہا، 'کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ، 'ہمیں ایسی بات زبان زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے؟' اور پھر نصیحت کی، 'آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو'۔

یہ عائشہ کی اس قضیے سے شاندار انداز میں خلاصی تھی۔انہیں صرف بریت نہیں ملی بلکہ پر شکوہ بات یہ تھی کہ الہامی آواز ان کے معاملے میں غلط ثابت کرنے کے لیے ایک نہیں، دو نہیں بلکہ پورے چار لوگوں کی گواہی کا تقاضا کر رہی تھی۔ کہا گیا تھا کہ اگر چار لوگ اس غیر اخلاقی حرکت، جس کا الزام دھرا گیا تھا، عینی شاہد بن کر سامنے نہیں آتے، عائشہ بے گناہ تھیں۔ بلکہ، جو بغیر کسی شہادت کے ایسا الزام دھرے، اسے سخت سزا دی جائے۔

زیادتی اور ناانصافی کا شکار ہونے والی کسی بھی عورت کے لیے اس سے بہتر فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن، ہوا کیا کہ آنے والی صدیوں میں

قدامت پسند ملاؤں کے ہاتھ میں اسی فیصلے کو یوں ہیر پھیر دیا گیا کہ اس کی وہ روح جو الہام اور محمد ﷺ کی منشا تھی، چھلنی ہو کر رہ گئی۔ یہ آیات اپنی اصل کے بالکل برعکس استعمال ہونے لگیں۔ یعنی یہ کہ، بجائے

اس سے عورت کو تحفظ ملتا، ان ہی کی تشریحات کی مدد سے الزام تراشی کی جانے لگی۔ وہ یوں کہ الہامی الفاظ نہ صرف بدکاری کے شبہ میں بلکہ جنسی زیادتی میں حالت مفعولی، یعنی استغاثہ میں بھی استعمال کیے جائیں گے۔ یعنی، اگر ایک عورت جو مبینہ طور پر جنسی زیادتی کا نشانہ بنی ہو، کسی کو اس کا مورد الزام ٹھہرائے تو اس صورت میں بھی، جب تک وہ چار عینی گواہ پیش نہیں کرتی، جو ظاہر ہے عملی طور پر ناممکن ہے، وہ اس الزام تراشی پر بہتان اور بدکاری کی مجرم قرار دی جائے گی اور سخت ترین سزا کی حقدار ہو گی۔ جن کلمات سے عائشہ کی گو خلاصی ہو گئی تھی، ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے بعد کے ادوار میں یہی احکامات بے شمار عورتوں کو خاموش کرانے کا حربہ، بے عزتی کا سامان، تضحیک اور قتل کا ہتھیار بن جائیں گے۔

ظاہر ہے، اس دور کے لوگوں، بشمول عائشہ اور محمد ﷺ، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو گا۔ یعنی، خدائی آیات کو تشریحات کے گھن چکر میں یوں گھمایا جائے گا کہ اصل روح ہی فسخ ہو جائے گی۔ عائشہ کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے خلاف لگائے گئے گھناؤنے الزامات غلط ثابت ہو چکے تھے اور یہ خود خدائے ذوالجلال کی مہربانی سے ممکن ہوا تھا۔ کائنات کی سب سے برتر، مقدس ذات کو خود اس معاملے میں بولنا پڑا تھا۔ ان پر الزام دھرنے والوں کو سر عام کوڑے لگا کر سزائیں دی گئیں اور وہ شاعر خواتین و حضرات جو کل تک عائشہ کے خلاف زہر اگل رہے تھے، فوراً ہی پلٹا کھایا اور اب ان کے قلم ان کی پاک دامنی اور عصمت کی قسمیں کھا رہے تھے۔ ان کی عظمت اور بڑائی بیان ہو رہی تھی، مقام اور حیثیت کے گن گائے جا رہے تھے۔ وہ اب مسجد کے احاطے میں اپنے کمرے میں واپس آ گئیں، جو محمد ﷺ کی بیویوں کے لیے مختص تھے۔ وہ ایک بار پھر، آپؐ کی پسندیدہ ترین بیوی تھیں۔ لیکن، اب ان کا رتبہ کسی بھی دوسری بیوی سے بڑھ کر تھا۔ بلکہ، کسی بھی عورت سے بڑھ کر تھا۔ وہ واحد تھیں جن کی موجودگی میں محمد ﷺ پر وحی اتری تھی، اس کے ساتھ یہ کہ یہ وحی ان کے ہی متعلق تھی۔ کسی بھی شخص کے لیے اس سے بڑا رتبہ کیا ہو سکتا ہے؟

اس کے باوجود، عائشہ کو بہر حال اس رتبے کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ ان کی محمد ﷺ کے ساتھ مہمات پر جانے کی آزادی ختم ہو گئی، وہ اب مزید اس طور سفر نہیں کر پائیں گی۔ سوائے مکہ میں حج کے، وہ

محمد ﷺ کی زندگی میں دوبارہ کبھی دور، صحرا کے اندر نہیں جاسکیں گی۔ یقیناً، وہ ان مہمات اور صحرائی سفر کے دلچسپ تجربے کو یاد کرتی رہتی ہوں گی۔ جس طرح کی ان کی طبیعت تھی، لڑائی اور جنگوں کے دوران لشکر کا حصہ نہ بن پانے پر تنگ بھی ہوا کرتی ہوں گی۔ زیادہ تر وقت صرف مدینہ تک محدود ہو جانے پر کڑھتی بھی ہوں گی۔ بے خوف، یہاں تک کہ بسا اوقات بے دھڑک خطرات میں کود جایا کرتی تھیں، ایک انتہائی عمدہ جنگجو ثابت ہو سکتی تھیں، اب پس منظر میں چلی گئیں۔ اس واقعے کے تقریباً پچیس سال گزر جائیں گے تو وہ دوبارہ جنگ کے میدان میں اتریں گی۔

اس کے علاوہ بھی عائشہ کو اس معاملے کے بعد، ایک اور لحاظ سے بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جہاں وہ ایک نئے رتبے اور حیثیت سے، نہایت ٹھسے کے ساتھ اپنی باقی زندگی معتبری میں گزاریں گی، وہیں طوفان کے گزر جانے کے بعد اس کے کلی انجام میں ایک بات یہ بھی ہوئی کہ اب مدینہ کے نخلستان کی اجتماعی یاد داشت میں وہ منظر نقش ہو کر رہ گیا، جس میں عائشہ سر اونچا کیے، اونٹ پر سوار، صفوان اونٹ کی مہار تھامے ہوئے ہے، مدینہ میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ ایسا منظر ہے، جو شاید محمد ﷺ کی عوامی سطح پر نیک نامی اور ساکھ کی آخری حد تھی۔ چنانچہ، جہاں ایک طرف قرانی آیات نے عائشہ کی پاک دامنی کی گواہی دی تھی، وہیں ایک دوسری آیت میں حکم ملا کہ اس دن کے بعد، محمد ﷺ کی بیویاں جب باہر نکلیں تو منہ پر چادر ڈال لیں گی، تاکہ غیر محرم مردوں کی نظروں سے دور رہیں۔ ظاہر ہے، گھر کے اندر تو دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دانوں پر پردے ڈال کر نسبتاً آسانی سے یہ مقصد پورا ہو جاتا تھا، لیکن گھر کے دروازے سے باہر یہ پردہ، فرد کو ڈھکنے کے سوا ممکن نہیں تھا۔ یہ پردہ، حجاب کہلائے گا۔

پردے کے احکامات صاف طور پر پیغمبر کی بیویوں کے لیے مختص تھے، جو ایک طرف ان کی ضرورت تھی تو دوسری جانب انہیں باقی عورتوں سے ممتاز حیثیت اور رتبہ بھی عطا کرنا مقصود تھا۔ مثلاً، '۔۔۔ پہچانی جاؤ اور ستائی نہ جاؤ'۔ ان آیات کے نزول کے کئی دہائیوں بعد اسلامی سلطنت میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد ان احکامات کو اپنا لے گی۔ مقصد، دوسری عورتوں سے ممتاز نظر آئیں اور رتبے کی حامل ہوں۔ لیکن، جلد ہی اسلامی قدامت پسند فقہی تشریحات کی بنیاد پر قائل ہو جائے گا کہ دراصل پردہ، ہر مسلمان عورت پر

لازم ہے۔ شاید ان کا مقصد، تمام مسلمان عورتوں کو امتیازی حیثیت دلانا رہا ہو یا دوسری صورت، جیسے باقی تمام معاملات میں ہوا، قدامت پسند اپنی مرضی تھونپ رہے ہوں۔ لیکن، ہر دو صورت یہ ضرور ہے کہ اگر نئے ادوار میں عائشہ ہوتیں تو یقیناً اس طرح کی تشریحات اور پھر تمام عورتوں کے لیے انتہائی لازم سمجھے جانے والے احکامات پر یقیناً سیخ پا ہو جاتیں۔ ذرا سوچیے، بعد کے ادوار اور آج کے مسلمان قدامت پرستوں کی حیرت کا کیسا منظر ہوا گر انہیں پتہ چلے کہ ایک دن ایسا بھی آیا تھا کہ عائشہ نے اپنے سر کی چادر انتہائی غیظ و غضب اور خفگی کا اظہار کرنے کے لیے اتار کر پھاڑ دی تھی۔ گرچہ، انہوں نے حجاب کو ایک امتیازی حیثیت سے قبول تو کر لیا تھا، لیکن کیا وہ قبول کر لیتیں کہ کوئی شخص پردے اور حجاب کا نام لے کر انہیں پس منظر میں رہنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کسی بھی شخص، کسی بھی شخص حتی کہ اپنے دور کے جید اصحاب اور طاقتور حکمرانوں تک کو بھی یہ اجازت نہیں دی۔ ایک ایسی لڑکی جو نمود داری میں یقین رکھتی ہو، بے باک اور بے خوف ہو، خود اعتمادی کا نشان رہا کرتی ہو۔۔۔ کسی بھی صورت اسے پردوں میں چھپا رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کسی طرح، اس طرح کی پابندیوں کو قبول نہ کرتیں۔ تاریخ گواہ ہے، انہوں نے ایسی بندشیں کبھی قبول نہیں کیں۔

اسی عرصے میں، یعنی گمشدہ ہار کے واقعہ کی قسط جب تمام ہو چکی تو اس کے بعد عائشہ کا رویہ لوگوں سے بھی بدل گیا۔ اگرچہ، محمد ﷺ نے کبھی ان پر شک نہیں کیا، صرف پوچھ تاچھ کی تھی۔ اگر انہیں محمد ﷺ پر اس وجہ سے کوئی غصہ رہا بھی تھا تو مسئلے کے حل ہونے کے انداز کی وجہ سے جاتا رہا۔ اگر پہلے کبھی رہا بھی تھا تو اب ان کے دل میں محمد ﷺ کے لیے کوئی گلہ باقی نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو ظاہر ہے، وہ با آسانی اس کو دور کر دیتیں۔ لیکن، یہ علی کو یہ معافی کبھی نہیں ملے گی۔ وہ مرتے دم تک علی سے شاکی رہیں گی۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ کے سات سال بعد جب محمد ﷺ بیماری مرگ میں مبتلا تھے اور ان کے انتقال کے بعد جو واقعات پیش آئیں گے، ایسا وقت بھی آئے گا کہ عائشہ ایک بڑی فوج کی کمان سنبھالے میدان جنگ میں علی کے مد مقابل کھڑی ہوں گی، گمشدہ ہار کے واقعے کے بعد حالات کے اس نہج پر پہنچنے کے لیے کڑیاں ملنا شروع ہو گئیں۔ علی نے محمد ﷺ کو جو مشورہ دیا تھا، عائشہ کی زندگی میں اس کی تلخی ہمیشہ ہی باقی رہے گی۔ وہ ان کی آنکھ میں ہمیشہ کھٹکتے رہیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے دل میں اس سوزش کا اثر

صرف ان دو لوگوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس گہری خلش کا کھٹکا آج بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ سنی اور شیعہ ، وہ بھی علی اور عائشہ کے بیچ کشمکش سے بچ نہیں سکے، وہ آج بھی جب اکثر جب کٹر خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اکثر اخلاق کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کھینچ تان، لوگوں میں بھی جاری ہے۔ جہاں سنی انہیں ان کو ملنے والے رتبے کی وجہ سے 'المبراء'یعنی، 'بری ہو جانے والی' کہا کرتے ہیں، تو کئی کٹر شیعہ ایسے ہیں جو آج کئی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی، یہ نہایت عجیب بات ہے کہ ان اصحاب کے بیچ چپقلش کو انتہائی ذاتی سطح پر لے جاتے ہیں اور انہیں اپنے نام 'عائشہ' کی بجائے 'فاحشہ' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

باب 4

یوں، تقسیم کا بیج بویا جا چکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، محمد ﷺ کی بیویاں، سسر، داماد، ہم زاد، بیٹیاں، مشیر اور دیرینہ ساتھی، الغرض ہر شخص، جب یہ بیج جان پکڑے گا، پھوٹ کی جڑ کا حصہ بن جائیں گے۔ لیکن، اب کئی سالوں بعد، جب محمد ﷺ بستر مرگ پر تھے، یہ بیویاں ہیں جو ہر چیز کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ ان کا راج ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مریض کمرے پر پہرہ لگائے بیٹھی ہیں۔ وہی تعین کرتیں کہ آیا آپؐ کی حالت ایسی ہے کہ عیادت کے لیے آنے والوں کو انہیں دیکھنے کی اجازت دی جائے یا کیا وہ اس قدر کمزور ہیں کہ ان کے انتہائی قریبی رفقاء کو بھی دروازے سے واپس لوٹا دیا جائے گا؟ کئی دن تک تو ان کے بیچ یہ کشمکش رہی کہ محمد ﷺ بیماری کے دوران کس کے کمرے میں رہا کریں؟ جب بات حد سے بڑھ گئی تو محمد ﷺ کو سختی دکھانی پڑی، اصرار کر کے عائشہ کے یہاں آن رہے۔ اب، محمد ﷺ کی دیکھ بھال میں یہ بیویاں ہی تھیں جو ہمہ وقت اس بحث میں رہتیں کہ کونسی دوائی دی جانی چاہیے؟ کونسا ایسا دم ہے جو کارگر ہو گا؟ کیا نہیں ہو گا؟ یا پھر، انہیں دوا دینا ضروری بھی ہے؟ یا پھر اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے؟

ایسی تو خیر کئی باتیں تھیں لیکن جس معاملے پر اصل قضیے نے جنم لیا، وہ یہ تھا کہ دن بدن، جیسے جیسے محمد ﷺ کی حالت بگڑ رہی تھی، تنازعہ بڑھتا ہی گیا کہ انہیں دیکھنے کی اجازت کس کو دی جائے اور کس پر روک لگا دی جائے؟ کئی بار تو ایسا ہوا کہ جیسے ہی آپؐ کی حالت سنبھلی، انہوں نے قوت مجتمع کر کے اگر کسی مخصوص شخص کو دیکھنے، اس کو بلا لانے کو کہا تو اس پر بھی توں تکرار ہوتی رہتی۔ بیویاں معترض رہتیں۔ وہ محمد ﷺ کے ساتھ بحث کرتیں۔ بیماری کی وجہ سے آپؐ کمزور اور ناتواں ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے، وہ انہیں ٹوک نہیں سکتے تھے، کبھی چپ کر جاتے۔ بسا اوقات ہاں میں ہاں ملا لیتے۔ اس نزاع اور ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشمکش کو ختم کرنا اب ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی لیکن وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ ان کا امہ کے بارے خدشات، حقیقت کی بدترین شکل میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔

ان دنوں پیش آنے والا ایک واقعہ تو بہت ہی مشہور ہوا۔ اس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہوا یہ کہ محمد ﷺ نے علی کو بلا کر ان کے پاس لانے کو کہا۔ چونکہ، مریض کمرے میں بیویوں، بالخصوص عائشہ کی

بات زیادہ چلتی تھی، اس لیے علی دور ہی رہتے۔ وہ آج کل زیادہ وقت مسجد میں عبادت اور مطالعے میں گزارتے تھے۔ عائشہ بجائے محمد ﷺ کی خواہش کا احترام کرتیں، انہوں نے اپنے والد کی بابت لقمہ دیا، 'کیا آپؐ بجائے اس کے، ابو بکر کو نہیں دیکھنا چاہتے؟'۔ یہ دیکھ کر وہیں موجود دوسری بیوی، یعنی عمر کی بیٹی حفصہ نے اپنے والد سے ملنے کا مشورہ دیا۔ کہنے لگیں، 'یا پھر، عمر کو دیکھنا چاہیں گے؟'۔ پہلے تو محمد ﷺ نے علی کو بلانے پر ہی زور دیا لیکن جب ان دونوں کا اصرار یوں ہی جاری رہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی ہاں میں ہاں ملادی۔ یوں، ابو بکر اور عمر تو آ گئے لیکن علی کو نہیں بلایا گیا۔

ایک بیمار، بستر مرگ پر پڑے شخص کو یوں بہلا پھسلا کر اپنی مرضی پر مائل کرنا، تاکہ ان کی اپنی مرضی چل سکے، ہر لحاظ سے نامناسب بات ہے۔ بلکہ، کٹھور پن ہے۔ لیکن ظاہر ہے، ان جوان عمر بیویوں سے بھی کوئی اپنی منشاء لاگو کرنے پر گلہ نہیں کر سکتا۔ دوسروں کی بجائے اپنے یا اپنے اپنے والد کا مفاد مقدم رکھنا، ان کی مجبوری بن چکی تھی۔ علی کی بجائے دوسروں کو آگے لانا، ان کے لیے ضروری تھا۔ محمد ﷺ کے بعد ان کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی تھی، ایسا مستقبل تھا جس کے ساتھ ساری عمر، مثال اکھاڑے میں کشتی لڑنی تھی۔ وہ جانتی تھیں اور ان کے لیے لازم تھا کہ وہ اس مشکل مرحلے کے لیے ہر طرح سے تیاری کر لیں۔

یہ جلد ہی بیوہ ہو جائیں گی اور ان کی بسر ہمیشہ ہی بیوگی میں بسر رہنی تھی۔ ان کی قسمت یوں ہی لکھ دی گئی تھی۔ قران کی تینتیسویں سورت میں واضح طور پر ان کے لیے حکم جاری ہوا تھا کہ، 'بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔۔۔'، ایک دوسری آیت میں صاف صاف تاکید بھی کر دی، 'تمہارے لیے ہر گز یہ جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔'

یوں، پیغمبر کی بیویاں اگر واقعی انہیں ماننے والوں کی مائیں تھیں تو وہ اب کبھی بھی دوبارہ کسی سے نکاح نہیں کر سکیں گی۔ محمد ﷺ کے بعد وہ ہمیشہ بیوہ ہی رہا کریں گی اور ان سے بیاہ شرعی لحاظ سے حرام ہوتا۔

محمد ﷺ کی بیویوں پر یہ پابندی، یعنی دوبارہ شادی کرنے کی ممانعت عرب رواج کے خلاف تھا۔

ساتویں صدی عرب میں، عام طور پر بیواؤں کی فوراً سے پہلے ہی شادی ہو جایا کرتی تھی۔ زیادہ تر یوں ہوتا کہ مرنے والے کا کوئی قریبی رشتہ دار آگے بڑھتا اور بیوہ اور اس کے بچوں کو سنبھالنے کی غرض سے شادی کر لیتا۔ اس طرح خاندان کی حفاظت ہوا کرتی اور یہ محفوظ رہتا۔ ظاہر ہے، اسی لیے یہ ممانعت صرف محمد ﷺ کی بیویوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو یہ آیات کسی طرح سے بھی محمد ﷺ کی تعلیمات، یعنی بیواؤں، یتیموں اور ضرورت مندوں کی کفالت اور دیکھ بال کے پرچار سے میل نہیں کھاتا۔ مگر، یہیں یہ نکتہ انتہائی اہم ہے۔ بات یہ ہے کہ محمد ﷺ کی بیویوں کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے دوبارہ سے شادی کرنے پر پابندی سے بھی انہیں ایک واضح رتبہ اور بلند مقام عطا کرنا تھا۔ وہیں، یہ ممانعت اس بات کی بھی غماز ہے کہ امت مسلمہ کا تصور کسی ایک شخص، خاندان، کنبے یا قبیلے تک محدود نہیں بلکہ یہ تو ایک قومیت بھی نہیں بلکہ، اس کی مثال تو ایک بڑے خاندان جیسی ہے۔

شاید، یہ سب احکامات اور اس کے نتیجے میں بلند مقام بڑی عمر کی بیویوں کے لیے تو موزوں ہوتیں مگر بغور دیکھیں تو یہ عائشہ اور حفصہ جیسی جوان عمر بیویوں کے لیے ایک بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ اگر، انسانی سطح پر سوچیں تو یہ سفاک معلوم ہو گا۔ بالخصوص عائشہ کے لیے تو یہ باقی سب سے بڑھ کر جبر تھا۔ عائشہ کی عمر بمشکل ایک لڑکی جتنی تھی، وہ اب تمام عمر بیوہ رہیں گی۔ وہ دوبارہ شادی نہیں کر سکیں گی، یوں وہ ہمیشہ لاولد بھی رہیں گی۔ اگرچہ، وہ مومنین کی ماں کہلائیں گی لیکن خود اپنے بطن سے انہیں کبھی اولاد نصیب نہیں ہو گی۔ اس طرح، عرب معاشرے میں، جہاں ہر شے خاندان، قبیلے سے جڑی ہے۔ اولاد نرینہ ہی سب کچھ ہو، وہاں عائشہ کے لیے، اگر وہ توجہ نہ دیں گی تو ان کے لیے آگے چل کر انتہائی کڑا وقت آنے والا تھا۔

یقیناً، محمد ﷺ کی بیویوں سے شادی کرنے والے خواہش مند افراد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اللہ کے رسول کی بیوہ سے شادی کرنے کے لیے ہر مرد، اگر ضروری ہوتا تو مقابلہ بھی کرتا، یہاں تک کہ خون ریزی سے بھی باز نہ آتا۔ اس طرح، ہر شخص آپؐ کے ساتھ نسبت پکی کرنے کی سبیل نکال سکتا تھا اور اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس سے محمد ﷺ لوگوں کو باز رکھنا چاہتے تھے۔ ایسا

بھی نہیں ہے کہ یہ بات منظر عام پر نہیں آئی۔ ایسے کئی مواقع آئے، جب جید اصحاب میں سے بھی کئی ایسے تھے، جو بر ملا اس خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔ مثال کے طور پر ایک روایت میں تو واضح الفاظ میں طلحہ کا ذکر ملتا ہے۔ طلحہ عائشہ کے چچا زاد تھے، جنہیں ایک جگہ پر اونچی آواز میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ وہ محمد ﷺ کے بعد عائشہ کے ساتھ نکاح کریں گے۔ ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی، کیونکہ انہیں فوراً ہی عائشہ کی ایک بہن کے ساتھ نکاح میں باندھ دیا گیا۔ لیکن، اب چونکہ یہ آیات اتر چکی تھیں، اس طرح کی باتوں کو پوری طرح روک لگا دی گئی تھی۔ کوئی شخص ایسی کوئی خواہش اپنے دل میں پالنے کا خیال بھی نہیں لا سکتا تھا۔ ظاہر ہے، خدا کی بات حتمی تھی۔ محمد ﷺ اپنے پیچھے نو بیوائیں سوگوار چھوڑیں گے، اور ان میں سے کوئی بھی، اب کبھی بھی دوبارہ شادی نہیں کر پائے گی۔

ان نو بیواؤں میں، یہ عائشہ تھیں جو اپنے مستقبل سے متعلق باقی سب سے زیادہ فکر مند تھیں۔ ابھی ان کی عمر صرف اکیس برس تھی اور وہ عمر بھر کے لیے بیوہ ہونے جا رہی تھیں۔ ذرا سوچیں، وہ ایسے شخص کی بیوہ ہوں گی جس نے مرتے ہوئے کوئی وصیت بھی نہیں کی۔ کیا وہ ان کے بعد اپنے والد کے گھر واپس چلی جائیں گی جہاں ان کی پہاڑ جیسی عمر وقت سے پہلے ہی ہر معاملے سے سبکدوش ہونے کی متقاضی رہے گی؟ اتنی چھوٹی عمر میں تنہائی اور زندگی کے دھارے سے علیحدگی کا سوچ کر ہی انہیں ہول آتا ہوگا۔ وہ تو جب اس بارے غور کرتی ہوں گی تو سوچیں، ان پر کیا گزرتی ہوگی؟ یقیناً، یہ ان کے لیے انتہائی پریشان کن صورتحال تھی۔ آج تک، وہ ہمیشہ ہی توجہ کا مرکز رہی تھیں اور اب اچانک وہ گمنامی کا شکار ہونے جا رہی تھیں؟ جس طرح ان کی شخصیت تھی، وہ کسی بھی صورت کونے سے لگنے پر تیار نہ ہوتیں۔ اب، ان حالات میں اگر محمد ﷺ مرنے سے پہلے علی کو اپنا جانشین مقرر کر لیتے ہیں تو عائشہ کا خیال یقیناً یہی رہا ہوگا کہ اگر اس سے پہلے انہیں کوئی رعایت کی توقع رہی تھی تو اس صورت میں تو وہ ہلکی سی امید بھی دم توڑ دیتی۔ علی کے ہوتے ہوئے، وہ محمد ﷺ کے بعد، پہلے ہی دن گمنامی کے کنوؤں میں دھکیل دی جائیں گی۔ عائشہ کو ذاتی طور پر اس طرح کی صورتحال میں علی سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ ابو بکر بھی گمشدہ ہار کے معاملے میں علی کے انتہائی ترش کردار پر نالاں چلے آ رہے تھے۔

علی نے جو محمد ﷺ کو جو انتہائی کند اور کھنڈے انداز میں مشورہ دیا تھا، اس سے نہ صرف ابو بکر بلکہ ان کے پورے خاندان کی بے عزتی ہوئی تھی۔ یوں، اگر قبائلی رواج کے مطابق دیکھیں تو یہ نہ صرف ان کے کنبے بلکہ قبیلے اور مدینہ میں مہاجرین کی عزت کا معاملہ بن چکا تھا۔ مہاجرین کی بے عزتی بارے، کم از کم عمر کا یہی خیال تھا۔ وہ اور ابو بکر محمد ﷺ کے سب سے منجھے ہوئے مگر عمر رسیدہ ساتھی اور مشیر تھے۔ وہ ان کے دیرینہ رفیق، دوست تو تھے ہی، دونوں ہی آپؐ کے سسر بھی تھے۔ اگرچہ، ان دونوں اصحاب کی عمریں محمد ﷺ سے کم تھیں۔ ابو بکر ان سے دو سال جبکہ عمر بارہ سال چھوٹے تھے۔ لیکن، ان کا حلقہ اثر کہیں بڑھ کر تھا۔ جہاں سفید ریش ابو بکر، خمیدہ کمر کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو گویا، شفقت اور تکریم کا دور دورہ ہو جاتا۔ لوگ، ان کی طرف مائل ہوتے اور ان کے ساتھ تعظیم برتتے۔ انہیں انسیت محسوس ہوتی۔ دوسری جانب، عمر ایک انتہائی سخت جان، طبیعت اور اعصاب کے مالک جنگجو واقع ہوئے تھے۔ ان کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ جہاں وہ کھڑے ہوتے، مجال ہے کسی کو چوں چراں کی جرات بھی ہو پاتی۔ لوگ ان کے جلال سے دبے رہتے۔

اس چھوٹے سے مریض کمرے میں بھی، عمر کی موجودگی کا زبردست احساس رہا کرتا ہوگا۔ وہ اس قدر بلند قامت واقع ہوئے تھے کہ عائشہ کہا کرتیں، 'ہجوم میں دور سے ہی وہ دوسروں سے اتنے اونچے، بلند نظر آتے، جیسے گھوڑے پر سوار ہوں'۔ عمر ہاتھ میں ہر وقت ایک لچک دار چھڑی جو عام طور پر گھڑ سواری میں استعمال ہوتی ہے، اٹھائے پھرتے تھے۔ جہاں ضرورت پڑتی، اسے انسانوں پر بھی استعمال کر لیتے۔ چاہے گھوڑے کو سدھانا ہو یا کسی شخص کو راہ راست پر لانا مقصود ہو، بلا امتیاز اس کا استعمال کرتے۔ اسی طرح، ان کی آواز بھی شخصیت کے عین مطابق خاصی گرج دار تھی۔ عام بول چال میں بھی لگتا جیسے حکم صادر کرتے ہوں۔ میدان جنگ میں یا کسی مباحثے میں، یہ آواز اور اونچی ہو جاتی اور سننے والے کے دل پر ہیبت طاری کر دیتی۔ یوں، ہر شخص آواز سے بھی دب کر رہتا، صرف گلے کی کھنکار سن کر ہی فوراً باادب ہو جاتا۔ عائشہ کے مطابق، وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے تو جیسے سب کو سانپ سونگھ جاتا۔ ہنستے ہوئے لوگوں ایک دم سنجیدہ ہو جاتے۔ یوں، اکثر کہا جاتا کہ جس محفل میں بھرپور خاموشی نظر آئے، یقیناً عمر بھی وہیں موجود ہوں گے۔ یہی نہیں، کسی بھی جگہ پر جہاں عمر کی آمد ہوتی، لوگ چپ تو ہو جاتے، ساتھ ہی سب کی نظریں ان پر جم

جاتیں کہ اب کچھ کہیں گے، صرف انہی کو سنا جائے۔ کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خواہ مخواہ ہی عمر سے بات چیت کرے، گپ شپ لگائے یا لمبے چوڑے قصے سناتا پھرے۔ عمر کے یہاں فضول گوئی اور ہنسی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اب، ایسی شخصیت کے مالک ہوتے ہوئے بھی، مریض کمرے میں ان کی موجودگی کے باوجود اگر کسی محفل میں محمد ﷺ کے آس پاس شور شرابا ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صورتحال کس قدر تشویشناک ہو چکی تھی۔

اس کمرے میں موجود ہر شخص اسلام کی سربلندی اور حفاظت چاہتا تھا لیکن ان میں سے ہر شخص کو اس کے ساتھ ساتھ ذاتی مفادات کا تحفظ بھی عزیز تھا۔ جیسا کہ عام طور پر سیاسی معاملات میں ہوا کرتا ہے، ہر اہم شخص کو یہی لگتا ہے کہ اس کے ذاتی مفادات اور ترجیحات ہی دراصل پوری قوم کے مفادات اور ترجیحات ہیں۔ سیاسی طور پر پر اثر شخصیات کے لیے مثال، یہ ایک ہی چیز ہوا کرتی ہے۔ یہی بات اس واقعہ کے پیش آنے پر ثابت بھی ہو جاتی ہے، جو بعد ازاں 'قلم اور کاغذ کا واقعہ' کہلایا جائے گا۔

ہوا یوں کہ محمد ﷺ کی بیماری کے نویں دن، ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ عام طور پر ایسا سنبھالا تب آتا ہے جب بستر مرگ پر مریض کا آخری وقت قریب ہو۔ یہ عارضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد، حالت بگڑتی ہی چلی جاتی ہے تا آنکہ موت گلے نہ لگا لے۔ اٹھ کر بیٹھے تو خاصے ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے تھوڑا سا پانی پیا اور عام خیال یہی ہے کہ اپنی آخری خواہش اور جسے بعد ازاں ممکنہ طور پر وصیت بھی شمار کیا جائے گا، واضح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن یہاں بھی، اس معاملے کی روایات کے بیان میں خاصا ابہام ملتا ہے۔

'لکھنے کا سامان لے آؤ تا کہ میں تمہیں کچھ کہوں اور تم اسے لکھ لو۔ اس کے بعد تم کبھی بھی گمراہی اور ضلالت کا شکار نہیں ہو گے'۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگے۔

دیکھنے میں یہ نہایت سادہ اور صاف درخواست تھی۔ اسی طرح، یہ نہایت معقول بات بھی لگتی ہے کہ ان حالات میں، بلکہ کہیے حالات جو رخ اختیار کرتے جا رہے تھے، ایسے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو

جانتا۔ لیکن، ہوا یہ کہ کمرے میں موجود تمام لوگوں میں یہ سنتے ہی ایک دم افرا تفری پھیل گئی۔ اس وقت یہاں محمد ﷺ کی بیویاں، ابو بکر اور عمر موجود تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ محمد ﷺ کیا لکھنے جا رہے ہیں، یا جیسا کہ روایت میں بیان کیا گیا ہے، انشاء نویس سے کیا لکھوانے جا رہے تھے؟ یہ وضاحت ضروری ہے، کیونکہ عام اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ محمد ﷺ نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھنے کے قابل تھے۔ حالانکہ، حقیقت سے قریب تر ہو کر سوچیں تو یہ بات ناممکن سی لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ ایک عرصے تک تجارت کا کام کرتے رہے، منجھے ہوئے آڑھتی تھے۔ انہیں یقیناً، تمام تر تجارت، لین دین اور نفع اور نقصان کا حساب کتاب رکھنے کی ضرورت رہتی ہی ہو گی۔ اگرچہ، یہ لکھنے اور پڑھنے میں کوئی بہت مہارت تو نہیں لیکن پھر بھی، اس کام کے لیے بھی بنیادی پڑھائی لکھائی تو لازم ہی ہوتی ہے۔ لوگوں کا ایمان کی حد تک یہ ماننا اور اس پر ہمہ وقت اصرار کہ محمد ﷺ پڑھنے اور لکھنے سے قاصر تھے، دراصل قران کی سچائی کی دلیل بنا کر پیش کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس طرح یہ بات ثابت کر دی جاتی ہے کہ قران دراصل ذات مقدس کی زبان ہے اور اس کے ظہور میں کسی انسانی خیال اور بیان کی کسی بھی طرح سے آمیزش، کھوٹ شامل نہیں ہے۔ حالانکہ، ایسی کسی بھی دلیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس پائے کی زبان، فصاحت اور بلاغت قران میں پائی جاتی ہے، وہ ایک آڑھتی تو دور کی بات، بڑے سے بڑے کلام گو، شاعر یا نثر نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔

خیر، جب محمد ﷺ نے اس آخری خواہش کا اظہار کر دیا، آپ اپنی سہولت کے مطابق سمجھ لیں کہ جو وہ لکھنا چاہتے تھے یا لکھوانا چاہتے تھے، کمرے میں موجود تمام افراد کے ذہن پر ایک ہی سوال تھا، 'جو وہ لکھوانا چاہتے ہیں، یہ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ آگے کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے عمومی ہدایات لکھوانا چاہتے ہیں؟ یا پھر، کیا وہ دینی تعلیمات کا ایک بار پھر اعادہ کرنا چاہتے ہیں، دین سے مثال دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے امہ کے لیے کیا چھوڑے جا رہے ہیں؟ یا پھر وہ سوال جس کا ان لوگوں کو اصل ڈر تھا، 'کیا وہ واقعی وصیت لکھوانے جا رہے ہیں؟'۔ کیا مرنے سے پہلے پیغمبر خدا اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ اپنا جانشین مقرر کرنے والے ہیں؟'

جس قدر اہم یہ سوال ہے اور مندرجہ بالا بیان کیے گئے حالات ہیں، ایسے میں کمرے میں موجود لوگوں میں افراتفری پھیل جانا قدرتی بات ہے۔ سادہ حالات میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ وہ کیا لکھوانا چاہتے ہیں تو اس کا حل یہی ہے کہ کاغذ اور قلم لے آتے تو پتہ چل جاتا لیکن افسوس، ایسا نہیں ہوا۔ جوں ہی انہوں نے یہ مطالبہ کیا، وہاں موجود ہر شخص اندر ہی اندر جان چکا تھا کہ اس درخواست کا اصل مقصد کیا ہے۔ اس کی وجہ کئی سوالات ہیں، جو لازمی طور پر وہاں تمام لوگوں کے دل اور دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ مثلاً، کیا ہوگا اگر محمد ﷺ نے واقعی اپنی وصیت لکھوالی؟ پھر کیا ہوگا، اگر یہ وصیت ان کے حق میں نہ ہوئی؟ اگر محمد ﷺ نے علی کو اپنا جانشین مقرر کر لیا تو پھر؟ ابو بکر نہیں، عمر نہیں بلکہ کوئی بھی دوسرا دیرینہ ساتھی نہیں بلکہ علی علیہ السلام، تو پھر؟ اگر وہ واقعی وصیت لکھوانا چاہتے تھے، لکھوانے پر اصرار کیوں کر رہے ہیں، زبان سے کہہ کیوں نہیں دیتے؟ قلم اور کاغذ منگوانے میں کیا حکمت ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ بستر مرگ پر، اب انہیں اس کمرے میں موجود لوگوں پر اعتبار نہیں رہا کہ وہ اس زبانی وصیت کو من و عن باقی لوگوں تک پہنچائیں گے؟ کیا وہ اسے پکا لکھوانا چاہتے تھے، تاکہ باقی لوگ ان کی زبان پر شک نہ کریں بلکہ لکھے ہوئے کو اچھی طرح دیکھ لیں اور اس میں کسی بھی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے؟

اگرچہ ان شبہات کو وہاں کسی شخص نے باآواز بلند، ظاہر تو نہیں کیا لیکن پھر بھی کمرے میں ایک ہاؤ ہو مچ گئی۔ اس شور شرابے سے محمد ﷺ کی حالت ایک دم پھر بگڑ گئی۔ جوں ہی ان پر دوبارہ غشی کا غلبہ آنے لگا، وہ اس بات پر متفکر ہو گئے کہ آپ ؐ کو اس قدر دباؤ اور تناؤ سے دوچار کرنا، مناسب بات نہیں ہے۔ بجائے وہ اصل مدعا کی طرف توجہ دیتے، ان کا سارا زور اس بات پر مجتمع ہو گیا کہ کمرے میں خاموشی کی ضرورت ہے۔ اس بات پر بھی، جبکہ وہ خاموشی کی ضرورت پر زور دے رہے تھے، ان کی آوازیں اونچی سے اونچی ہی ہوتی چلی گئیں۔

یہ نہایت عجیب و غریب منظر ہے۔ اس بات کے واضح اشارے ہیں کہ اس کمرے میں موجود لوگ، جو اس شخص کے انتہا درجے کے وفادار ہیں، یہ بات کئی مواقع پر ثابت بھی ہو چکی ہے، اب وہی شخص اپنی

وصیت لکھوانا چاہتا ہے، شاید وہ اپنا جانشین بھی مقرر کر لے اور اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ یہ وہ چیز ہے، جو ہر شخص چاہتا ہے کہ، ہو جائے۔ ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس بابت جو درست ہے وہ جان لے، اس شخص کی مرضی جان لے۔ لیکن، وہیں اسی وقت، یہی ایک چیز ہے جو کوئی بھی شخص جاننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہ عجب مشکل ہے۔ یہ ان لوگوں کی مجبوری ہے۔ اگر علی کو جانشین مقرر کر بھی دیا جاتا ہے تو اس کمرے میں موجود کوئی بھی شخص، اس نامزدگی کو کسی بھی صورت تحریر میں نہیں لانا چاہے گا۔

جہاں یہ عجیب صورتحال ہے، نہایت عجیب و غریب منظر ہے، وہیں یہ خالصتاً انسانی خصلتوں کا بھرپور اظہار بھی ہے۔ اس کمرے میں موجود سب ہی انسان ہیں۔ جو اگر ایک طرف انتہائی محترم اور تاریخ کا کلیدی حصہ رہے ہیں، وہیں وہ بنیادی انسانی خاصیتوں، کمزوریوں اور ناکامیوں سے بھی پر ہیں۔ ان میں سے ہر شخص متفکر ہے، کوئی بھی محمد ﷺ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا، وہ ایک زمانے میں، جب حالات انتہائی بدتر تھے، اس وقت بھی آپؐ کے ساتھ جم کر کھڑے رہے تھے، ابھی تو انہیں چھوڑ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ آج بھی ویسے ہی ان کے گرد جمع ہیں۔ محمد ﷺ کی حفاظت، بیماری سے بچانے اور انہیں ہر طرح کے شر سے، حتیٰ کہ خود اپنی مجبوریوں کے شر سے بھی بچائے رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پیغمبر خدا کو سکون ملے، اس بیماری میں ان کی زندگی آسان ہو۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ دل کی گہرائیوں سے آپؐ کا بھلا چاہتے تھے، وہ پہلے ہی ان کے وفادار چلے آ رہے تھے۔ اپنے تئیں ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ لیکن، جس طرح کے حالات تھے، اس میں ان کی یہ کوششیں بھی بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔ وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے، قلم اور کاغذ منگوانے کے فوائد اور نقصانات پر بحث ہونے لگی اور یوں شور و غل بڑھتا ہی گیا۔ اس دھما چوکڑی سے ظاہر ہے، محمد ﷺ کی صحت برداشت کرنے سے قاصر تھی، وہ ایک دم ہی پھر غش کھا کر بستر پر گر گئے۔ غصے میں بجھے ہوئے ہر لفظ کی دھمک، کانوں کو پھاڑتی ہوئی ہر تیز لے جیسے ان کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ کمرے میں ہنگامہ اور شور اس قدر بڑھا کہ آپؐ کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ 'مجھے اکیلا چھوڑ دو!' انہوں نے حتمی انداز میں بڑبڑا کر کہا۔ بھرپوری قوت سے آواز دوبارہ جمع کی۔ دوبارہ گویا ہوئے تو صرف یہ کہہ سکے، 'میری موجودگی میں ان بن اور لڑائی بند کرو۔۔۔' پھر درد اور بخار کے ساتھ شور نے آن لیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

اس کشمکش اور کھینچ تانی کے باعث وہ اس قدر ناتواں ہو چکے تھے کہ یہ الفاظ ان کے منہ سے بمشکل سرگوشی بن کر نکلے۔ ایسا لگا جیسے وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ صرف عمر تھے جو انہیں سن پائے اور ان کے لیے یہ کافی تھا۔ اب پہلی بار، اپنی زور آور طبیعت اور سے کھری اور اونچی آواز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے چلا کر حکم صادر کیا، 'رسول خدا درد سے نڈھال ہیں، یہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہمارے پاس قران ہے۔ قران خدا کی کتاب ہے اور ہمارے لیے یہی کافی ہے'۔

تاہم، بعد ازاں یہ کافی ثابت نہیں ہوا۔ شاید یہ کافی بھی ہوتا، بلکہ اسے کافی ہونا چاہیے تھا، لیکن بعد ازاں مسلمانوں کے لیے صرف قران کافی ثابت نہیں ہوا۔ عمر کے الفاظ آج بھی یقین اور کامل، ایمان کی درخشاں مثال بنا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن، سچ یہ ہے کہ بعد کے دور میں، یہ ہر گز کافی نہیں تھا۔ آگے چل کر وقت آئے گا کہ قران کے ساتھ سنت کو بھی انتہائی اہم ضمیمے کی صورت میں اسلام کا کلیدی حصہ بنا دیا جائے گا۔ سنت سے مراد محمد ﷺ کے اقوال اور افعال کی وہ ہزاروں اور لاکھوں روایات ہیں جو احادیث کی شکل میں ان لوگوں نے جمع کیں، جو ان کی انتہائی قربت کے دعویدار رہے تھے۔ ان احادیث میں محمد ﷺ کا طور طریقہ، ہر طرح کا کام، چاہے وہ زندگی کے بڑے اور اہم معاملات سے متعلق ہو یا روزمرہ زندگی کے معمولات ہی کیوں نہ ہوں، پوری تفصیل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ سنۃ یا سنت، عربی زبان کا روایتی اور قدیم لفظ ہے جس سے مراد آباؤ اجداد کا طور طریق مراد لیا جاتا ہے۔ اسی لفظ اور نظریے کی بنیاد کو بعد ازاں ایک گروہ اپنا تعارف بنالے گا، جنہیں ہم آج سنی کہتے ہیں۔ حالانکہ، شیعہ بھی محمد ﷺ کے کم و بیش انہی اقوال اور افعال کی پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ پیروی کرتے ہیں۔

بہر حال، اس وقت عمر کا حکم چل گیا۔ ان کے الفاظ نے اپنا کام کر دکھایا، جو مقصد تھا، وہ پورا ہوا اور مریض کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ یوں کہیے، ہر شخص کھسیانا ہو کر بالکل چپ ہو گیا۔ اگر محمد ﷺ واقعی جانشین کی تقرری کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب ان میں طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ وصیت تو دور کی بات، مسلسل بگڑتی ہوئی صحت اور لوگوں کو بحث و مباحثے اور تو تو میں میں سے بھی نہیں روک سکتے تھے۔ شاید، ان کی بہتر نظر آتی ہوئی صحت سے ان لوگوں کو بھی مغالطہ ہوا تھا۔

ان کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی، جتنی سمجھ لی گئی تھی۔ یا شاید، کمرے میں موجود ہر شخص اپنے مفادات کا واقعی تحفظ چاہتا تھا، یا دوسری صورت کہیے، اس کے ساتھ امہ کا تہہ دل سے خیر خواہ تھا، لیکن اس بات میں کوئی شک اور شبہ نہیں کہ تمام تر نیک خیالی کے ساتھ، کچھ اور معاملہ بھی تھا۔ ان میں سے ہر شخص بھلے امہ اور اسلام کی بابت نیک نیت رہا ہو لیکن وہیں تقریباً ہر شخص کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ ہو نہ ہو، محمد ﷺ وہی بات دہرانے جا رہے ہیں جو انہوں نے صرف تین ماہ قبل، مکہ میں اپنی زندگی کے واحد اور آخری حج کی ادائیگی کے بعد واپسی کے راستے میں، اشاروں اور کنایوں میں کہی تھی۔

کیا محمد ﷺ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی مکہ نہیں آ سکیں گے؟ کیا وہ بھانپ چکے تھے کہ اب وقت آخر قریب ہے؟ کیا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حج سے واپسی کے دوران، ایک مخصوص موقع پر علی کو باقی سب سے ممتاز قرار دیا تھا؟

شیعہ کا خیال ہے کہ محمد ﷺ اس بارے پہلے سے ہی صاف اشارہ دے چکے تھے، انہیں آخری وقت کی قربت کا پوری طرح سے ادراک تھا۔ اسی لیے، انہوں نے حج کے موقع پر کچھ ان الفاظ میں اس بابت اظہار خیال کیا، 'وقت قریب ہے کہ خدا مجھے واپس بلا لے اور میں یقیناً اس کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ میں تمہارے بیچ دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم مضبوطی سے انہیں تھامے رہے تو تم کبھی گمراہی کا شکار نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں، قران یعنی اللہ کی کتاب اور دوسرا اہل بیت یعنی میرے گھر کے افراد ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے اور خود سے الگ مت کرنا تا آنکہ یہ دوبارہ سے حوض کوثر (جنت کا ایک تالاب) پر واپس میرے پاس نہ پہنچ جائیں'۔

دوسری طرف، سنی علماء کا اس پر اختلاف ہے۔ ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ محمد ﷺ کے بیان میں ان الفاظ کا بعد میں خود سے اضافہ کر دیا گیا اور ویسے بھی، محمد ﷺ کے الفاظ سے بالکل واضح طور پر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ یہ کہتے ہوں کہ وہ عنقریب انتقال کر جائیں گے۔ لیکن، تریسٹھ سال کی عمر، بالخصوص ساتویں صدی عرب میں، ایسی شمار ہو گی، جب انسانی جسم اور توانائیاں یوں جواب دے سکتی ہیں کہ جوانی کے مزے لوٹنے والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ محمد ﷺ یقیناً جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں اور ان

کا وقت قریب ہے۔ یہ بات تو درست ہے، لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ آپؐ کو یہ توقع تھی کہ وہ مستقبل قریب میں، چند ماہ کے اندر ہی، انتقال کر جائیں گے۔ وہ تو صرف مسلمانوں کو موت کی حقیقت سے آگاہ کر رہے تھے۔ موت سے کسی کو بھی چھٹکارا حاصل نہیں اور جب یہ پیش آئے تو وہ صرف یہ یقینی بنا رہے تھے کہ لوگ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوں۔

خیر، محمد ﷺ کا یہ بیان حج کے موقع پر ادا کیے گئے خطبات کی روایات میں جا بجا ملتا ہے اور پھر اس کا دوبارہ اعادہ، اس سفر سے واپسی پر ہوا۔ اس موقع کے وقت اور جگہ پر کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ یہ 10 مارچ 632ء، یعنی محمد ﷺ کو لاحق ہونے والی جان لیوا بیماری سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ حجاج کا قافلہ محمد ﷺ کی سربراہی میں مکہ سے واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک رات کے لیے ان کا پڑاؤ غدیر خم پر ہوا۔ غدیر خم، ایک چشمے کا نام ہے۔ غدیر سے مراد چشمے یا تالاب کے ہیں۔ اگرچہ یہ آنکھوں کو بھلی لگتی تصویر، جیسے لق و دق صحرا میں سرسبز نخلستان کا ٹکڑا تو نہیں تھا لیکن، بہر حال یہ نخلستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہر وقت اتنا پانی میسر رہتا تھا کہ اس کی نمی سے تھوڑی بہت ہریالی ہو جاتی اور کھجور کے چند درختوں کے لیے اگنے کا سامان ہو گیا تھا۔ جزیرہ حجاز و عرب کے مغربی حصے کی بنجر پہاڑیوں اور سوکھی گھاٹیوں میں ایک معمولی سا چشمہ بھی اہمیت کا حامل ہوا کرتا تھا۔ جہاں پانی کی شائبہ بھی ہوتا، وہ جگہ اس راہداری پر سنگ میل کی حیثیت اختیار کر جاتی۔ غدیر خم کی اہمیت نسبتاً بڑھ کر تھی کہ اس مقام پر نہ صرف پانی تھا بلکہ یہ چھوٹی مگر ایک سے زیادہ تجارتی راستوں پر واقع ایک چوراہا ہوا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ کر، حجاج کا قافلہ کئی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جائے گا اور ان میں سے کچھ مدینہ کی طرف نکل جائیں گے جب کہ باقیوں کا رخ شمال اور مشرق کی طرف، اپنے آبائی علاقوں کی جانب ہو گا۔ یہ آخری رات ہے جب محمد ﷺ کی موجودگی میں حجاج کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گی۔ وہ اکٹھے ہی رات بسر کریں گے۔ اسی رات، یہاں رش میں اضافہ ہو گیا۔ غدیر خم کے مقام پر، لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ علی علیہ السلام، جو کہ آخری حج میں شامل نہیں تھے، یمن میں ایک سرکش گروہ کی کامیابی کے ساتھ سرکوبی کرنے کے بعد یہیں پہنچ چکے تھے۔ یمنی قبائل نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ نوزائیدہ اسلامی ریاست کو ٹیکس دینے پر بھی راضی ہو چکے تھے۔ یوں، اس مہم کے بعد جزیرہ عرب کا تقریباً حصہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر طرف ایک جشن کا سماں تھا۔ محمد ﷺ کے لیے یہ خوش خبری تو

تھی،اس کے ساتھ ہی انہوں نے مناسب سمجھا کہ اس نادر موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے سامنے اپنے دیرینہ ساتھی اور متوسل، جواب پینتیس سال کا ایک جواں مرد تھا۔ انتہائی سیانا، فہم اور فراست کا حامل، ایسا جنگجو تھا جو ابھی ابھی ایک انتہائی اہم مہم کو کامیابی سے ہمکنار کر کے ان کے پاس واپس پہنچ چکا تھا۔

اس شام، جب قافلے کے لوگوں نے اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کو اچھی طرح پانی پلا اور چارہ کھلا کر سیر کر لیا۔ خود اپنے لیے کھانا پکا کر کھا چکے اور سونے کی جگہیں بھی کھجور کے درختوں تلے ترتیب دی جا چکیں تو محمد ﷺ نے حکم دیا کہ اونٹ کی کاٹھیوں پر کھجور کے پتے بچھا کر ایک چبوترہ تیار کیا جائے۔ یہ چبوترہ، صحرا میں منبر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد، آپؐ اس منبر پر چڑھ گئے۔ اس موقع پر، جیسا کہ محمد ﷺ خطابت کے لیے مشہور تھے، انہوں نے نہایت والہانہ انداز میں علی کو آواز دے کر بلایا اور اپنے ساتھ اس چبوترے پر شانہ بشانہ کھڑے ہونے کو کہا۔ علی آگے بڑھے تو محمد ﷺ نے جھک کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور کھینچ کر اوپر اپنے ساتھ لا کھڑا کیا۔ پھر، انہوں نے علی کا ہاتھ پکڑ کر ہوا میں بلند کیا، ان کی کہنی سے کہنی ملالی۔ یہ روایتی عرب معاشرے میں اعتماد اور اتحاد کی نشانی ہوا کرتی تھی۔ یہاں، لوگوں کے ایک جم غفیر کے سامنے، انہوں نے علی کے لیے خصوصی دعا کی اور ان کے بارے یوں گویا ہوئے، 'وہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہے'۔ پھر توقف کیا اور بیان جاری رکھا، 'اللہ اس کو دوست رکھے جو علی کو دوست رکھتا ہے اور اس کو دشمن رکھے جو علی کو دشمن رکھتا ہے'۔

اس وقت یہ بات بالکل صاف تھی۔ کسی کو بھی شک اور شبہ نہیں تھا۔ کم از کم عمر کو اس بابت، محمد ﷺ کی منشاء سمجھنے میں ایک ذرہ برابر مشکل نہیں ہوئی۔ روایت میں آگے چل کر درج ہے کہ عمر نے آگے بڑھ کر علی کو مبارکباد دی اور کہا، 'اب دن اور رات، تم ماننے والے ہر مرد اور عورت کے مولا ہو'۔

کہا جاتا ہے کہ عمر نے بھی محمد ﷺ کے اس اعلان کو، ان کی جانشینی کا اعلان سمجھا اور موقع پر ہی تسلیم کیا کہ علی ہی محمد ﷺ کے جانشین ہیں۔ اگر، ایسا ہے تو یقیناً یہ بات سمجھنی قطعی مشکل نہیں کہ وہاں، صرف عمر ہی نہیں بلکہ ہر شخص نے محمد ﷺ کی بات کا مطلب، یہی سمجھا ہو گا۔ جس قدر، یہاں تک اس روایت کا

واضح بیان تاریخ میں درج ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ہر شخص کا یہی خیال تھا۔ لیکن وائے افسوس، یہاں بھی ابہام نے بالآخر اپنے پنجے گاڑ لیے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس موقع پر محمد ﷺ واقعی باقاعدہ طور پر جانشین کا اعلان کر رہے تھے تو انہوں نے ایسا صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا؟ بجائے یہ کہ سادہ اور آسان الفاظ میں ایسا کہنے کی بجائے وہ اشاروں اور کنایوں کا سہارا کیوں لیں گے؟ بلکہ، اگر ان کا مقصد یہی تھا تو انہوں نے اپنے جانشین کا اعلان حج کے موقع پر مکہ میں کیوں نہیں کیا جب مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد جمع تھی اور لوگ پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے؟ کہیں، ایسا تو نہیں کہ حج مکمل ہونے اور پھر علی کی کامیابی کے باعث محمد ﷺ خوشی سے سرشار تھے اور ایسے میں انہوں نے صرف اپنے انتہائی قریبی، جان سے زیادہ عزیز، بیٹے کی مانند علی کے ساتھ محبت اور انس کا اظہار ضروری سمجھا تھا؟ یا کیا، واقعی۔۔۔ غدیر خم پر محمد ﷺ کا پوری تیاری کے ساتھ، لوگوں کو متوجہ کر کے یوں ایک چبوترہ بنوا کر، علی کی موجودگی میں یہ بیان، محبت اور انسیت کے اظہار سے بڑھ کر معاملہ تھا؟

اگلے تین ماہ میں، جیسا کہ اس کے بعد آج چودہ سو سال بعد بھی، ہر چیز تشریحات کی نظر ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ محمد ﷺ کے بیانات میں بھی طرح طرح کے مفہوم ڈھونڈے جائیں گے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ انہوں نے کیا الفاظ استعمال کیے لیکن ان کا مطلب کیا تھا؟ عربی اس لحاظ سے ایک انتہائی پیچیدہ زبان ہے، یہ تقریباً عقدہ مشکل ہے۔ ہر لفظ جیسے پراسراریت سموئے ہوئے ہے۔ نفاست اور لطافت تو ظاہر ہے، اس کا خاصہ ہے لیکن اس زبان کی سخن سازی میں کئی باریکیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ 'مولا' کو ہی لے لیں۔ اس کے کئی مطلب نکلتے ہیں۔ پالن ہار، رہنما، متولی، محسن، دوست یا پھر ہمدم یا ہمراز۔ کونسا مطلب ہے؟ کیا مطلب ہے؟ کیوں ہے؟ اس سب کا انحصار سیاق و سباق اور ماحول پر ہے۔ تو، یہاں مدعا یہ نہیں کہ محمد ﷺ نے کیا کہا، انہوں نے 'مولا' کہا۔ اصل مسئلہ تو سیاق و سباق کا ہے، اس ماحول کا ہے جہاں یہ کہا گیا، موقع کا ہے۔ اسی پر ہمیشہ سے ایک بحث چلی آ رہی ہے اور آج بھی لوگ اسی طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ سیاق و سباق پر تو ایک لامتناہی بحث ہو سکتی ہے۔ یوں، کہا جاتا ہے کہ اگر عمر نے بھی اسی کی تائید کی جو محمد ﷺ کہہ رہے تھے، تو عین ممکن ہے کہ وہ بھی اسی بات کو دہرا رہے تھے جو اس مجمع میں موجود ہر شخص اور آج بھی ہر شیعہ اور سنی ایک ہی طرح سے متفق ہیں کہ علی علیہ السلام، بلاکسی شک و شبہ

کے، تمام مسلمانوں کے خصوصی دوست ہیں۔ان کی طرح کا مقام، کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

اسی طرح، محمد ﷺ کا غدیر خم کے مقام پر کیے گئے اعلان کا دوسرا حصہ بھی، اس زمانے میں مشرق وسطیٰ کے سارے علاقوں میں دوستی اور نسبت کے اظہار، اعتماد اور اتحاد جتلانے کا رائج طریقہ تھا۔ 'اللہ اس کو دوست رکھے جو تمہارا دوست ہے، اسے دشمن رکھے جو تمہارا دشمن ہو'۔ یہ عام تھا اور تب اس کی قدر کہیں بڑھ کر تھی۔ یہ تو جدید دور کا شاخسانہ ہے کہ اب سیاسی زبان میں اسے انتہائی بھونڈی شکل میں ڈھال دیا گیا ہے۔ بس کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ، 'میرے دشمن کا دشمن، میرا دوست ہے'۔ یا پھر، 'میرے دوست کا دوست، میرا بھی دوست ہے'۔ ان عبارات کو غور سے دیکھیں تو مفادات اور خود غرضی کی بو آتی ہے۔ جبکہ، اپنی اصل حالت میں یہ مطلب کے لحاظ سے انتہائی اہم اعلان ہوا کرتا تھا۔ خیر، یہ تو اس طرح کے اعلان کی اہمیت کا بیان ہے، ورنہ اپنی اصل حالت میں کسی بھی طور اس کے معنی یہ کبھی بھی نہیں رہے کہ مراد وراثت سونپنا ہے یا جانشین مقرر کرنا ہے۔ ان کلمات کی اصل تو اعتماد اور بھروسے کا اظہار ہوتا تھا اور آج بھی، تمام لوگ علی پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں۔ ان کی محمد ﷺ سے نسبت اور ان کی اہمیت بارے کسی کو ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ لیکن، پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ علی علیہ السلام، رسول خدا کے جانشین ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ تشریحات، تاویلات اور دلائل سے ہم سمجھتے ہیں کہ بات صاف ہو جائے گی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس طرح اصل بات مزید دھندلاتی جاتی ہے۔ اس پر کہرا چھانے لگتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا، جس قدر وضاحت کی کوشش ہوئی، اتنا ہی معاملہ گدلا گیا۔

اچھا، اگر کاغذ اور قلم لے بھی آتے تو محمد ﷺ کیا لکھتے، یا لکھواتے؟ جیسا کہ شیعہ پورے یقین سے کہتے ہیں کیا وہ لکھواتے۔۔۔ علی ان کے خلیفہ ہیں؟ یا یہ کہ، علی ان کے جانشین ہیں؟ دوسری طرف سنیوں کا کہنا ہے، 'کون جانتا ہے کہ وہ کیا لکھواتے؟ ان کے خیال میں شیعہ نے اس معاملے کو خواہ مخواہ کا طول دے رکھا ہے، وہ اپنے تخیل کے ہاتھوں مجبور ہیں اور کچھ نہیں۔ لیکن، شیعہ اور سنی کے بیچ اس اختلاف کو ایک طرف رکھیے، ذرا سوچیے کہ اگر محمد ﷺ جو بھی لکھوا لیتے، ان کے ہر لفظ کی بھی وہی درگت بنتی جو ان کے

حج کے موقع پر بیانات اور غدیر خم پر کیے اعلان کی بن چکی ہے۔ لوگ ایسے ایسے مطلب نکال لاتے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا، ایسی تشریحات آتیں کہ ہم حیران و پریشان رہ جاتے۔

تو بات یہ ہے کہ ایسے مناظروں، بحث دلیل کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ تب ہر شخص کا انفرادی سطح پر یہ دعویٰ رہا تھا کہ صرف وہی اصل مطلب سے واقف ہے، جواب جانتا ہے۔ تب کیا، آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اسے معلوم ہے محمد ﷺ کا مطلب کیا تھا، وہ کیا لکھوانے جا رہے تھے یا کہیے وہ کیا چاہتے تھے۔ حالانکہ، یہ دعوے تب بھی اور آج بھی، کسی بھی طرف ڈھلکے ہوں، ثابت نہیں کیے جا سکتے اور یہ کسی بھی طرح سے ممکن نہیں ہے۔ حوالہ جات موجود ہیں، تاریخ لکھی ہوئی ہے اور ایسی تفصیل موجود ہے جو کسی بھی دوسرے تاریخی معاملے میں نہیں ملتی۔ تو پھر یہ سارا قضیہ کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ ہمارے لیے ان حوالوں کی حدود کو سمجھنا ضروری ہے۔ اوائل دور میں تحریر کی گئی سوانح حیات ہوں یا تاریخ کا تفصیلی بیان، ہمیں صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ تب لوگوں نے کیا کہا؟ کیا کیا؟ یا کیسے کیا؟ ان تواریخ میں کہیں پر بھی یہ درج نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی نیت کیا تھی؟ یا مقصد کیا تھا؟ یا وہ کیا سوچ رکھتے تھے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ تب اور آج بھی، بحث اس بات پر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا، بلکہ ہر شخص اس بات پر سر کھپا رہا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے، ان حوالہ جات میں جو چیز موجود ہی نہیں ہے، وہ کیسے مل سکتی ہے؟ یہ تلاش بے سود ہے۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، سوال یہ تھا کہ محمد ﷺ کیا سوچ رہے تھے؟ یہ سوال بعد ازاں علی کے بارے میں بھی آئے گا اور پھر ان کے بعد حسین علیہ السلام کی بابت۔۔۔ یوں ایک لڑی سی بن جائے گی۔ یہ سب کیا چاہتے تھے؟ وہ کیا جانتے تھے؟ یا وہ کیا نہیں جانتے تھے؟ ان سب سوالوں کا جواب ہمیں کبھی نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی بنیاد میں پڑنے والا شگاف، وقت کے ساتھ پھیلنے کے ساتھ ساتھ ایک منجدھار کی شکل اختیار بھی کر گیا، جو روز بروز گہرا ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی یہ درز، بھرنے کا نام نہیں لیتی۔ لوگ بھلے جس قدر چاہیں، پرجوش انداز میں دعویٰ کر لیں۔ تمام مذہبی اکائیاں اپنے تئیں جمع ہو کر شور مچائیں۔ دھواں دھار تقریریں کر لیں یا ہر دور کے عالم فاضل گلے پھاڑ کر شور

مچایا کریں۔ یہاں تک کہ آنے والے وقتوں میں اس کے سبب خون کی ندیاں بھی بہیں گی، قتل و غارت کا میدان گرم ہو جائے گا۔۔۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ لوگ یہ نہیں سوچیں گے کہ اس معاملے میں 'قطعی' سچ واحد شے ہے جو کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ وہ بے سود شور مچا رہے ہیں، دعووں کا انبار لگا ہوا ہے اور ہر طرف خون ہی خون ہے۔۔۔ دیکھیے، قطعی سچ کا حصول، اس کا دعویٰ تو سائنس میں بھی کوئی نہیں کر سکتا، جہاں ہر شے تحقیق، سچ اور دلیل سے مزین ہوتی ہے۔ آپ تاریخ میں اس کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟

ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ بخار کا زور بڑھ گیا۔ درد سے محمد ﷺ کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ ہلکی سی آواز بھی جیسے ہتھوڑا بن کر ان کے سر پر ضربیں لگا رہی تھی اور شدید درد جیسے کھوپڑی کو چیر کر مغز میں اتر رہا تھا۔ آپؐ کی حالت اب ایسی نہیں تھی کہ وہ وصیت اور آخری خواہش کا اظہار کر سکیں۔ قلم اور کاغذ نہیں لایا گیا اور اگلی صبح تک ان کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ وہ حرکت کرنے سے بھی رہ گئے۔ رات بیت گئی تو صبح کاذب سے پہلے، وہ جان گئے کہ اب وقت آخر قریب ہے۔ انہوں نے اب ایک آخری درخواست کی، جو مان لی گئی۔ ان کی ہدایت کے مطابق، سات کنوؤں کے پانی سے نہلایا گیا۔ اگرچہ انہوں نے کسی سے کوئی وضاحت نہیں کی لیکن بیویاں جانتی تھیں کہ روایتی طور پر یہ ایک میت کو نہلانے کی رسم تھی۔ محمد ﷺ کو ان کی خواہش کے مطابق سات کنوؤں سے جمع کیے گئے پانی سے نہلایا گیا اور جب اس طرح پاکی کی رسم پوری ہو چکی تو انہوں نے مسجد کے احاطے میں، وہاں لے جائے جانے کو کہا، جو عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں صبح کی نماز باجماعت ادا کی جائے گی۔

انہیں سہارا دینے کے لیے دو لوگوں نے مدد کی۔ یہ دو، علی اور عباس تھے۔ آپؐ ان دونوں کی گردنوں میں اپنی بانہیں ڈال کر سہارے سے چل رہے تھے۔ عائشہ کے کمرے سے لے کر مسجد کے احاطے تک چند گز کا فاصلہ ہے لیکن نقاہت اور بیماری کے سبب، ان کے لیے یہ میلوں دور ثابت ہو رہا تھا۔ احاطہ پار کیا تو مسجد میں ایک سائے والی جگہ پر پہنچ گئے۔ محمد ﷺ نے یہاں، ایک چبوترے کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھانے کو کہا۔ اگرچہ وہ لیٹے ہوئے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بیٹھے ہوں۔ یہاں سے وہ ابو بکر کو صبح کی نماز کی امامت کرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔

وہ لوگ جو اس دن وہاں موجود تھے، ان میں سے کئی نے روایت کر رکھا ہے کہ وہ صبح کی نماز کا یہ منظر دیکھ کر اور بالخصوص جب ان کے دیرینہ ساتھی ابو بکر کی آواز گونجتی تو سن کر مسکراتے رہے۔ یہ بھی درج ہے کہ آپ ؐ کا چہرہ تمتمار ہا تھا۔ لیکن، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا وہ خوشی کی تمتماہٹ تھی یا بخار کی تمازت سے جل رہے تھے۔ شاید، یہ لوگوں کے اپنے ایمان کی حرارت تھی۔ محمد ﷺ کو ایک بار پھر اپنے پیچ دیکھ کر خوشی، ممنونیت تھی جو انہیں آپ ؐ کے چہرے پر بھی نظر آتی رہی۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے، مسجد میں گونجتی ہوئی ان آیات کو سنتے رہے جو پہلی بار انہوں نے جبرائیل سے سنی تھیں۔ لوگ اس منظر کی محویت میں اس قدر کھو گئے کہ وہ بھول چکے تھے کہ محمد ﷺ شدید بیمار ہیں۔ وہ درد سے دوہرے ہو رہے ہیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ بمشکل مسجد کے احاطے تک پہنچ پائے تھے۔ لوگوں کو ایک دم یقین سا ہو گیا کہ وہ ہمیشہ تندرست رہیں گے، انہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ انہیں آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ جب عبادت مکمل ہو گئی تو علی اور عباس نے ایک بار پھر انہیں سہارا دے کر عائشہ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ محمد ﷺ کے پاس اب صرف چند گھنٹے باقی تھے۔

کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ حقیقت پسند تھے، فہم رکھتے تھے۔ 'خدا کی قسم، میں نے محمد ﷺ کی آنکھوں میں موت دیکھی ہے'، علی کے چچا عباس آپ ؐ کو عائشہ کے کمرے میں پہنچانے کے بعد انہیں بتانے لگے۔ ان کے مطابق جانشینی کا معاملہ طے کرنے کا یہ آخری موقع تھا۔ انہوں نے علی سے کہا، 'چلو واپس چلیں اور ان سے صاف صاف پوچھیں۔ اگر اختیار ہمیں دے دیا تو کم از کم ہم جانتے ہوں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ اگر سب کچھ دوسروں کے حوالے کر دیں تو بھی پرواہ نہیں۔۔۔ مگر ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کو ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کریں'۔

لیکن علی میں اب ہمت نہیں تھی کہ وہ واپس جاتے اور ایک بار پھر محمد ﷺ کو اس حالت میں پریشان کرتے۔ وہ خود تو وہاں موجود نہیں تھے لیکن گزشتہ روز جو ہنگامہ اس کمرے میں ہوا، ایک بار پھر انہیں تکلیف سے دوچار کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ علی نے کہا، 'واللہ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ اگر یہ ہم سے لے لیا جاتا ہے تو محمد ﷺ کے بعد، بھلے آپ ؐ تاکید کر کے گئے ہوں، ہمیں کوئی نہیں دے گا'۔ اس روایت

میں بھی، جہاں علی محمد ﷺ کی حالت بارے تشویش کا شکار تھے، بیان سے ایسا بھی لگتا ہے جیسے دوسروں کی طرح علی بھی معاملات کی صراحت اور وضوح کے لیے تیار نہیں تھے۔

وہ واپس چلے بھی جاتے تو اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابھی علی اور عباس یہی بات کر رہے تھے کہ محمد ﷺ کو غش آیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ جانبر نہیں ہو سکے۔ 8 جون، 632ء کو سوموار کے روز، دوپہر کے وقت آپؐ انتقال کر گئے۔

عائشہ بتاتی ہیں کہ جب نزع کی حالت تھی تو محمد ﷺ کا سر ان کی گود میں دھرا تھا۔ عربی میں ان کے الفاظ یوں ہیں کہ، 'سینے اور منہ کے درمیان تھام رکھا تھا۔۔'۔ اچانک انہیں لگا کہ جیسے ایک دم آپؐ کا سر بوجھل ہو گیا ہے۔ انہوں نے نیچے دیکھا تو وہ جا چکے تھے اور آنکھیں زندگی سے خالی تھیں۔ ان میں موت جھانک رہی تھی۔ یہ سنیوں کی روایت ہے۔ لیکن، شیعہ کے مطابق جب ان کا انتقال ہوا تو عائشہ نہیں بلکہ ان کا سر علی کی گود میں دھرا ہوا تھا۔ یہ علی کی بانہیں تھیں جنہوں نے رسول خدا کو آخری وقت سہارا دے رکھا تھا۔ علی نے ہی آخری سانسوں میں محمد ﷺ کو تین دفعہ کہتے سنا، 'اے اللہ، میرے بعد میری امت پر رحم کر!'۔

مرتے ہوئے محمد ﷺ کو کس نے تھام رکھا تھا، اس کی اہمیت تھی۔ وہ شخص نہایت اہم ہو گا جس نے ان کی آخری سانس ٹوٹتی ہوئے دیکھی۔ اس بکھری سانس کی حرارت کو اپنی جلد پر محسوس کیا۔ جس کے جسم کے ساتھ وہ چمٹے ہوئے تھے یا جس نے ان کو سہارا دے رکھا تھا۔۔۔ وہ ان کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ بعد ازاں، یہ تفاصیل انتہائی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ اتنی اہم کہ جیسے آپؐ کی روح نے جسم سے نکل کر اس شخص کے جسم میں اس کی روح کے ساتھ بسیرا کر لیا ہو، جس نے مرتے ہوئے انہیں تھام رکھا تھا۔ گویا، یہ وہ شخص ہے جس نے ہاتھوں میں اسلام کا ماضی اور مستقبل، دونوں ہی تھام رکھے ہیں۔

باب 5

عائشہ یا علی علیہ السلام، ان میں سے جس نے بھی آخری وقت پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھام رکھا تھا، اسے اب ان کے گزر جانے کی خبر باہر پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرے میں بین شروع ہو گئے۔ پہلے عائشہ اور پھر دوسری بیویاں ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگیں۔ یہ اس قدر تیز، دل خراش اور کانوں کو چیرنے والا شور تھا کہ سننے والے کہتے ہیں کہ اچانک شروع ہونے والے رواس پٹاس میں اس قدر کرب اور درد بھرا تھا کہ بس، بیان سے باہر ہے۔ دور سے سننے پر لگ رہا تھا جیسے کوئی زخمی جانور تکلیف سے بے حال، درد کی شدت سے کراہتے ہوئے جان دے رہا ہو۔ اس رونے میں انتہا کا دکھ چھپا ہوا تھا۔ اتنا کہ اس کا کوئی حساب ہی نہیں۔ جلد ہی، یہ چیخیں مسجد کے احاطے سے نکل کر پورے نخلستان میں پھیل گئیں۔ جو سنتا وہی چیخنے لگتا۔۔۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

مرد اور عورتیں، جوان اور بوڑھے ہر شخص غم سے نڈھال تھا، گریہ و بکا کر رہا تھا۔ جس کو دیکھو، وہی غم سے بے حال تھا۔ جیسے ہر شخص اس خبر کے سامنے سرنگوں ہو گیا، ہار چکا ہو۔ لوگ دونوں ہاتھوں سے چہرے یوں پیٹ رہے تھے جیسے کوئی چپتیں لگا کر ہوش دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر ذرا سنبھلتے تو سینہ پیٹنے لگتے۔ بند مٹھیوں سے دھکے لگنے پر جسم یوں بول رہے تھے جیسے کسی پرانے پیڑ کا کھوکھلا تنا ہوں۔ کئی تو ایسے تھے جنہوں نے اپنے ناخنوں سے پیشانیاں کھرچ ڈالیں اور خون بہہ کر آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں گھل گیا۔ انہیں دیکھ کر لگتا، جیسے آنکھیں واقعی خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ اسی طرح، کچھ لوگ زمین سے دھول اٹھا کر اپنے سر پر ڈالتے اور دوسرے ہاتھ سے سر پر چپت لگاتے جاتے، ان کے چہرے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ یہ اس زمانے میں، ماتم کنائی کی روایتی رسومات تھیں۔ آج بھی، یہی رسوم پورے زور و شور سے ہر سال عاشورہ کے موقع پر دنیا بھر میں شیعہ علی کے بیٹے حسین علیہ السلام کی المناک موت کا غم، ویسے ہی مناتے ہیں، جیسا کہ ساتویں صدی عرب میں رائج تھا۔ ماتم کی یہ رسومات دراصل کئی معنوں سے پُر ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں بچھڑنے کے غم، چھوڑ دیے جانے کے دکھ اور بے سہارا ہو جانے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ نہ صرف لوگ مرنے والے کا ماتم کرتے ہیں بلکہ خود اپنے لیے بھی غم سے دوچار ہوتے ہیں۔

یعنی، وہ متروک ہوگئے، مرنے والے کے بغیر وہ کہیں کے نہیں رہے۔بے قائد اور بے نوا ہوگئے۔

"ہم سیاہ اندھیری رات میں ، طوفان میں گھری ہوئی منتشر بھیڑوں کی طرح تھے جو افراتفری میں ادھر ،ادھر دوڑتی پھرتی ہیں'، مہاجرین میں سے ایک شخص نے اس دن کے واقعات، روایت کیے۔یعنی، حال یہ تھاکہ لوگوں میں بے یقینی پھیلی ہوئی تھی۔انہیں سمجھ نہ آتا کہ کیا کریں تو یہاں وہاں بھاگتے پھر رہے تھے۔مثال بھیڑوں کی طرح تھی جنہیں ہانکنے اور چھت دینے والا چرواہا،اب باقی نہیں تھا۔آخر پیغمبر خدا کیسے مر سکتے ہیں؟لوگوں نے ابھی صبح کے وقت انہیں مسجد میں دیکھا تھا۔کیاان کا چہرہ تمتما نہیں رہا تھا؟ موت نے بہر حال آخر آن لیا تھا،اپنی حقیقت منوالی تھی لیکن کوئی بھی شخص اس کلی سچائی کو ماننے سے گریزاں تھا۔اس بات کو تسلیم کرنا،اس کا تصور کرنا انتہائی مشکل تھا۔اس قدر مشکل کہ اندازہ لگایئے، عمر جیسے شخص کی حالت اتنی غیر تھی کہ وہ بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔عمر جنگجو اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔دو دن پہلے ہی تو وہ زور دار آواز میں خدا کی کتاب بارے کہتے ہوئے پائے گئے تھے کہ مسلمانوں کے لیے صرف یہ ایک کتاب ہی کافی ہے۔اس وقت تو وہ پورے یقین اور ٹھسے سے ایسا کہہ رہے تھے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، قران کے ہوتے ہوئے، امت گمراہ نہیں ہو سکتی۔۔۔لیکن اب یہ حال تھا کہ وہ بھی بوکھلائے ہوئے، ماننے سے قاصر تھے کہ بالآخر موت بازی لے گئی۔

عمر ایک ہی تکرار کیے جاتے کہ سب کچھ بلکہ کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر ایسا ہر گز ممکن نہیں ہے۔بلکہ، ان کے نزدیک تو دل میں ایسا خیال لانا بھی گناہ ٹھہرا، کفر کا سامان قرار پایا۔وہ بڑبڑا رہے تھے کہ محمد ﷺ تو صرف کچھ دیر کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔وہ جلد ہی لوٹ کر آنے والے تھے۔ غم سے حالت اتنی غیر ہوئی کہ دوڑتے ہوئے لوگوں کے بیچ پہنچ گئے۔اس سے پہلے کہ کوئی روک پاتا، مسجد کے احاطے میں ہجوم کے بیچ کھڑے چلا رہے تھے۔ نفی کا شکار تھے۔کہنے لگے، 'واللہ، محمد ﷺ مرے نہیں ہیں۔موسیٰ کی طرح اپنے خدا کے پاس گئے ہیں۔جیسے وہ چالیس دن کے لیے جا کر چھپ گئے تھے۔آپؐ بھی ویسے ہی واپس آئیں گے جیسے موسیٰ آگئے تھے۔حالانکہ لوگ کہتے تھے کہ موسیٰ مر گئے ہیں۔واللہ، رسول خدا انہی کی طرح لوٹ کر آئیں گے اور اپنے ہاتھ سے ان لوگوں کے ہاتھ اور ٹانگیں کاٹ دیں گے، زبان کھینچ لیں گے جو یہ سمجھتے ہیں

کہ وہ چل بسے ہیں'۔

اگر عمر کا مقصد لوگوں کو شانت کرنا تھا تو یہ منظر جس میں ان جیسا جری اور نڈر آدمی ہسٹریائی انداز میں نفی کا شکار ہو کر چلا رہا تھا، عوام میں بے چینی اور ہول مزید بڑھ گیا۔ تب ہی غم سے نڈھال اور دکھ کے بوجھ تلے دبے، جھکی کمر کے ساتھ ابو بکر سامنے آئے اور عمر کے شانے ہاتھ رکھ کر دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگے، 'نرمی سے کام لو عمر، نرمی سے۔ چپ ہو جاؤ!'۔ پھر وہ عمر کا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے گئے۔

لوگوں کی نظریں اب ابو بکر پر جمی تھیں جنہوں نے عمر کی جگہ سنبھال لی تھی۔ انہوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر قرانی آیات کی تلاوت شروع کی۔ غیر متوقع طور پر ان کی آواز مضبوط اور غیر متزلزل تھی۔ وہ دو ٹوک لہجے میں مخاطب تھے۔ لوگوں کو ابو بکر جیسے کمزور اور ناتواں شخص سے اتنی ہمت اور صبر کی امید نہیں تھی۔ جن آیات کی وہ تلاوت کر رہے تھے، یہ احد کی لڑائی کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ موقع تھا جب آپؐ کے پیروکار، میدان جنگ میں ان کی موت کی افواہ سن کر بوکھلا گئے تھے اور افراتفری میں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ 'محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں، بس ایک رسول ہیں۔۔۔' ابو بکر نے زور دے کر قران کی تیسری سورت میں شامل یہ آیت دہرائی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں آگے کا الہامی بیان جاری رکھا، 'پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟'

اس کے بعد ابو بکر نے وہ بات صاف صاف کہی جو لوگ اپنی زبان تو دور کی بات، دل و دماغ میں بھی لانے سے قاصر تھے۔ لیکن، اس وقت سب کو یہی بات سننے کی اشد ضرورت تھی۔ 'وہ جو محمد ﷺ کی عبادت کرتے ہیں' ابو بکر نے اعلان کیا، 'محمد ﷺ انتقال کر گئے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جان لیں کہ اللہ زندہ ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے'۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پہلے تو دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ عمر کو فوراً ہی جیسے اس بات کا ادراک ہو گیا۔ خود عمر سے روایت ہے، 'واللہ، جب میں نے ابو بکر کو وہ الفاظ کہتے سنا تو میں گم سم، سٹ پٹا کر رہ گیا۔ جب سمجھ آگئی کہ محمد ﷺ اب ہمارے بیچ نہیں رہے تو مجھ پر غشی طاری

ہو گئی۔ ٹانگیں جواب دے گئیں اور میں دھڑام سے زمین پر گر پڑا'۔ عمر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک بوڑھے شخص کے تحمل اور حقیقت پسندی نے عمر جیسے زور آور شخص کی ہیبت کو دھیما کر دیا۔ ایک سخت جان، غصیلا شخص روتے ہوئے معصوم بچے میں بدل گیا۔ عمر کے بعد باقی لوگوں کو بھی آہستہ آہستہ کمزوری بشر، یعنی فنا پذیری کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا تو اب واقعی ماتم کا آغاز ہوا۔ مرد اور عورتیں دونوں ہاتھوں سے چہروں کو بے اختیار پیٹنے لگے، مکوں سے سینہ کوبی جاری رہی۔ لوگوں کے جسم پٹنے سے مسجد میں دھمک پیدا ہونے لگی اور ہر شخص زار و قطار رونے لگا۔ کئی بے ہوش ہو گئے۔ شام گئے تک یہی سماں رہا اور جب رات آئی تو مدینہ میں اس قدر آہ و بکا، گریہ تھا کہ اصطبلوں اور باڑوں میں بندھے جانور بھی بے چین ہو گئے۔ آس پاس کی پہاڑیوں اور صحرا میں گیدڑ اور جنگلی جانور بھی شور مچانے لگے۔ یوں آہستہ آہستہ لوگ حقیقت کی طرف لوٹتے چلے گئے۔

کئی ایسے تھے، جنہیں زمینی حقائق کا دوسروں کی نسبت جلد ہی احساس ہو گیا۔

علی نے اپنے تین انتہائی قریبی مرد رشتہ داروں کے ہمراہ خود کو عائشہ کے کمرے میں محمد ﷺ کی میت کے ساتھ بند کر لیا اور رواج کے عین مطابق انتہائی اہم ذمہ داری سنبھال لی۔ یعنی، وہ آپ ؐ کو دفنانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ یہ خاصا طویل عمل ہوا کرتا تھا، جس میں سب سے پہلے تو میت کو نہلایا جاتا ہے۔ پھر جسم پر طرح طرح کی جڑی بوٹیوں سے بنی لئی کا لیپ کر کے آخر کفن میں لپیٹ دیا جاتا۔ لیکن غم کی اس حالت میں بھی کئی ایسے تھے جن کے لیے، محمد ﷺ کی تدفین سے زیادہ مستقبل اہم تھا۔ 'طوفان میں گھری ہوئی منتشر بھیڑوں' کو چرواہے کے انتخاب کا انتہائی مشکل اور کئی زیادہ، یعنی کسی بھی حالت میں پیچھا نہ چھوڑنے والے کٹھن مرحلے کا سامنا تھا۔

اس بابت حالات کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد ﷺ کے انتقال کے صرف چند گھنٹوں کے اندر ہی مدینہ کے آبائی لوگوں اور مکہ کے مہاجرین کے بیچ عرصے سے سلگتی ہوئی بداعتمادی اور بدگمانی ایک دم ہی بھڑک کر منظر نامے کی سطح پر ابھر آئی۔ ہوا یہ کہ ابن عبادہ، جو اس وقت مدینہ کے دو بڑے قبائل میں سے ایک کے نامی گرامی سردار تھے، فوراً ہی شوریٰ کا اجلاس بلا لیا۔ شوریٰ سے مراد،

قبائلیوں کی روایتی بیٹھک ہے جس میں طویل بحث اور مکالمے کے ذریعے دیرینہ مسائل کا حل تلاش کیا جاتا، معاہدے طے پاتے اور تنازعات کا پر امن تصفیہ کیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے کہیے تو ساتویں صدی عرب میں اس مجلس کی مثال اس عقبی کمرے جیسی تھی، جس میں رہنما اور اشرافیہ جمع ہو کر عوام کی نظروں سے دور، علیحدگی میں اہم فیصلے کیا کرتی ہے۔ چوں کہ شوریٰ میں صرف اہم فیصلے ہی ہوا کرتے، اس لیے اس کے اجلاس کو عوام سے دور، مخفی رکھا جاتا اور صرف وہی لوگ شرکت کرتے، جنہیں دعوت دی جاتی۔ شوریٰ کے اس اجلاس کے لیے فوراً سے پہلے ہی دعوت نامے بھیج دیے گئے، جو سب کے سب مدینہ سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات یعنی انصار کے لیے ہی مخصوص تھے۔ مکہ سے تعلق رکھنے والی آبادی، یعنی مہاجرین یا ان کے کسی نمائندہ کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔

مدینہ کی آبادی، یعنی انصار نے محمد ﷺ پر اس لیے اعتماد کیا تھا کہ وہ انہیں اپنا ناتے دار سمجھتے تھے۔ مطلب یہ کہ آپؐ کے والد کا ننھیال مدینہ سے تھا۔ اس سے بھی پہلے، محمد ﷺ کے دادا عبد المطلب کی والدہ بھی مدینہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسی سبب، مدینہ کے لوگ آپؐ کو اپنا ہی شمار کرتے تھے۔ لیکن، ان کے ساتھ ہجرت کے دوران مدینہ پہنچنے والے دور پار کے خاندان کے بہتر افراد کا معاملہ دوسرا تھا۔ اگرچہ، انہیں مدینہ میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔ ان کے گزر بسر کا پورا انتظام تھا لیکن زیادہ تر لوگوں نے انہیں دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں سب برابر ہیں۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ان کی مثال ایک خاندان جیسی ہے۔ لیکن بھائیوں کے بیچ بھی، بلکہ کہیے بھائیوں کے بیچ تو بالضرور ہی حسد اور بخل کی بدی جنم لے کر رہتی ہے۔ انصار کی نظر میں یہ مکی، یعنی مکہ کے ہی رہے۔ جیسا کہ حکم دیا گیا تھا، بجائے یہ کہ مہاجرین کو قبول کیا جاتا، انصار نے ہمیشہ انہیں برداشت کیے رکھا۔ اگرچہ حالات بدل چکے تھے۔ وہ بھلے ان کے بھائی قرار دے دیے گئے تھے لیکن مدینہ کے لوگوں کے لیے وہ بدستور ٹکر کے شہر مکہ سے تعلق رکھنے والے، قریش ہی تھے۔ قریش سے مدینہ کے دونوں بڑے قبائل کو سدا کا بیر تھا۔ اور اب جب کہ اچانک محمد ﷺ چل بسے تھے۔ ان کے بعد تو وہ طاقت جو انہیں جوڑ کر رکھے ہوئے تھی، ہوا ہو گئی۔ یک دم ہی، قبیلے اور کنبے کی سیاست نے ایک بار پھر جست بھری اور ہر حد پھلانگتی ہوئی منہ پر آن کھڑی ہوئی۔

شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا تو تادیر جاری رہا کیونکہ کامیابی کا دارومدار شرکاء کے بیچ ہم آہنگی اور مطابقت رائے قائم ہونے پر تھا۔ ایک لحاظ سے تو یہ خیال خام ہے کہ عام طور پر لوگوں کو ایک ہی نکتے پر راضی کرنا، تقریباً ناممکن ہوا کرتا ہے مگر پھر بھی، چونکہ یہ معاملہ انتہائی اہم تھا۔۔اس لیے اجلاس کی کاروائی اس وقت تک جاری رہتی جب تک کہ اتفاق رائے قائم نہ ہو جاتا۔ اس وقت تک بات چیت چلتی ہی رہتی جب تک کہ مکالمے میں کسی ایک کی جیت نہ ہو جاتی، مخالفین دلیل سے زیر ہو جاتے یا کہیے، عمومی رائے ایک ہی جانب نہ ڈھلک جاتی۔ یہاں کئی ممکنات کا پورا ایک جمگھٹا تھا۔ سب سے خوب تو یہ ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے کو دلیل سے قائل کر لیتے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو خدشہ تھا کہ مار دھاڑ شروع ہو جائے گی اور زور آور زبردستی دوسروں کو اپنی رائے ماننے پر مجبور کر سکتا تھا۔ چونکہ، کوئی بھی شخص اس طرح کے نتائج کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ شوریٰ کو پورا موقع دیا جائے۔ جتنا وقت درکار ہو، اس مکالمے کو جاری رکھا جائے۔ جلدی برتنے میں کسی کی بھلائی نہیں تھی۔ اسی لیے ہر رہنما، بزرگ، نمائندہ اور سردار اپنی باری آنے پر جتنا چاہتا، بولتا رہا اور ہر شخص کو جتنی دیر درکار ہوتی، بولنے کا موقع دیا جا رہا تھا۔

اجلاس میں شریک چند ہی لوگ تھے جو لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے لیکن خطابت اور فن تقریر میں ہر آدمی یکتا تھا۔ اس زمانے میں، لوگ لفاظی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ ایسا صرف عرب نہیں بلکہ تاریخ میں کسی بھی ماقبل ابجد یا سادہ الفاظ میں لکھائی کی ایجاد سے پہلے کے زمانے میں معاشروں کو دیکھ لیں، فن خطابت زوروں پر ہوا کرتا تھا۔ تو تب نہ صرف یہ کہ فن تقریر میں بلاغت اور خطیبانہ طرز ادا کی خوب پذیرائی ہوا کرتی تھی بلکہ اس فن کے ماہرین بھی حد سے زیادہ اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ لوگ، ایسے شخص کو توجہ سے سنتے، لطف اٹھاتے اور بالآخر گرویدہ ہو کر اسی کے پیچھے چل پڑتے۔ اکثر ایسا لگتا کہ مضمون سے زیادہ زبان میں فصاحت اور بلاغت اہم ہے۔ تقریر جس قدر گرجدار اور بھاری بھرکم الفاظ سے بھری ہوتی، اشاروں، کنایوں سے مزین ہوتی اور تفاصیل سے پر ہوتی، اس سے مقرر کے رتبے اور وزن کا تعین کیا جاتا۔ اب اس زمانے میں رائج انہی عوامی اصولوں کی وجہ سے مدینہ کے باسی، نقصان اٹھائیں گے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنا اہم اجلاس، زیادہ تر تک چھپا کر جاری رکھنا ناممکن تھا۔ جلد ہی اس گٹھ جوڑ کی خبر پھیل گئی اور شوریٰ کے جمع ہونے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی دوسرے لوگ، یعنی مکہ کے مہاجرین، حالانکہ مدعو

نہیں تھے، انہوں نے خود ہی اس اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔

جس روز محمد ﷺ کی وفات ہوئی، یعنی سوموار کے دن شام تک ابو بکر نے عمر کو سمجھا بجھا یا اور انہیں غم سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ پہلے تو ایک دم لوگوں میں پھیلی افراتفری اور اب انصار کی جانب سے بغیر کسی سے رجوع کیے یوں شوریٰ کو جمع کرنے کی افتاد کو دیکھتے ہوئے ابو بکر نے کہا کہ ایک دفعہ محمد ﷺ کی جانشینی کا معاملہ طے ہو جائے، پھر غم منانے کو بہت وقت ہو گا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ لوگوں کو یوں امت کے معاملات کے ساتھ کھلواڑ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جس طور شوریٰ کا یہ اجلاس بلایا گیا تھا، اگرچہ قابل قبول تو نہیں تھا لیکن پھر بھی، کسی بھی صورت مدینہ کی آبادی کا یوں علیحدہ ہونا سخت تشویشناک بات تھی۔ وہ کسی بھی صورت ایسا ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اگر یہ روش جاری رہی تو جلد ہی سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا اور آپؐ کی زندگی بھر کی محنت اکارت جائے گی۔ ایک طرف لوگوں کو اکٹھا رکھنے کا مرحلہ درپیش تھا جبکہ دوسری جانب یہ بھی ضروری تھا کہ انتخاب بھی ایسا ہو کہ اسلام کا نیا رہنما ایسا شخص ہو جو امت کو یکجا کرے۔ اس میں پھوٹ کو رد کرے اور لوگوں کو اسی نقطے پر جمع رکھنے کے قابل ہو، جو محمد ﷺ کا خاصہ تھا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ نہایت اہم ہے کہ ابو بکر کی طرح عمر بھی اب تک یہی سمجھتے چلے آ رہے تھے کہ محمد ﷺ کے بعد نیا رہنما بالضرور ہی مہاجرین میں سے ہو گا۔ ان کی اس سوچ کی وجہ یہ تھی کہ مہاجرین وہ لوگ ہیں جو شروع دن سے ہی محمد ﷺ کا ساتھ دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو آپؐ کے سب سے پرانے ساتھی تھے۔ یہی نہیں، مہاجرین میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو انتہائی بااثر تھے۔ وہ محمد ﷺ کی زندگی میں ان کے اہم ترین مشیر ہوا کرتے تھے۔ علی کے ساتھ ان گنے چنے لوگوں میں عمر اور ابو بکر تو شامل ہی تھے، ان کے علاوہ ایک شخص اور بھی تھا۔ یہ عثمان تھے۔ عثمان ایک انتہائی خوب رو، امیر و کبیر آدمی تھے، جن کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ بنو امیہ مکہ کے قبیلے قریش میں سب سے دولت مند کنبہ تھا۔

اگرچہ قریش یعنی مکہ کی اشرافیہ، بالخصوص بنو امیہ کے لوگ صرف دو سال پہلے تک محمد ﷺ کے انتہائی شدید دشمن ہوا کرتے تھے۔ لیکن، عثمان نے اپنے کنبے کے عمومی رویے کے برعکس بہت عرصہ پہلے

ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ مکہ سے تعلق رکھنے والی گنتی کے امیر کبیر لوگوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے آپؐ کے حکم پر لبیک کہا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ چلے آئے تھے۔ اپنی زیادہ تر دولت اسلام کی تحریک کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنے رشتہ داروں اور ناتے داروں کی بھرپور مخالفت کے باوجود محمد ﷺ کا ساتھ دیا تھا۔ اسی وجہ سے محمد ﷺ، عثمان کے ہمیشہ دلدادہ رہے تھے۔ اسی لیے آپؐ نے ممنونیت میں پہلے اپنی ایک بیٹی کا رشتہ ان سے طے کیا۔ جب وہ چل بسیں تو پھر دوسری بیٹی کا ہاتھ بھی خود ہی عثمان کے ہاتھ میں دے دیا۔ عثمان، اس لحاظ سے ایک جدا رتبے اور مقام پر فائز تھے۔ یعنی، ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ محمد ﷺ کے دوہرے داماد تھے۔ عثمان کا تحریک سے لگاؤ اور پھر ان کا امت میں رتبہ، اس بات کا متقاضی تھا کہ جب جانشینی کی بات چلے تو وہ لازماً موقع پر موجود ہوتے۔ ان کی رائے عمر اور ابو بکر کی ہی طرح صائب اور انتہائی اہم تھی۔

محمد ﷺ کی بیماری کے آخری دنوں میں عثمان مریض کمرے میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ وہ تو مدینہ میں بھی نہیں تھے۔ جیسا کہ دولت مند لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے وہ اپنی شاہانہ طرز برقرار رکھتے ہیں۔ انہیں استحقاق حاصل ہوتا ہے، جہاں چاہیں، جب چاہیں اور جیسے چاہیں، بسر کرتے ہیں۔ عثمان بھی گرمی کے دن عام طور پر مدینہ سے باہر اپنی ذاتی جاگیر میں بسر کرتے تھے۔ یہاں ہوا نسبتاً تازہ اور ٹھنڈی رہا کرتی تھی۔ لیکن، اب محمد ﷺ کے بعد ان کی مدینہ میں موجودگی انتہائی اہم ہو چکی تھی اور انہیں جلد از جلد واپس پہنچنے کے لیے پیغام بھجوا دیا گیا۔ پیغام کچھ یوں تھا کہ مہاجرین کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ شوریٰ کے اجلاس میں مدعو ہیں یا نہیں، وہ بہر حال وہاں جا پہنچیں گے اور عثمان کو چاہیے کہ فوری طور پر اس اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچ جائیں۔

مہاجرین کے گروہ کی سربراہی عمر اور ابو بکر کر رہے تھے۔ یہ دونوں کثیر تعداد میں لوگوں کو ساتھ لیے زبردستی اور بزور بازو، اجلاس میں جا پہنچے۔ چونکہ مہاجرین کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا راستہ بنانے کے لیے بڑی تعداد کے ساتھ آئیں، سو وہ آئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو متوقع تھا۔۔ یعنی شوریٰ کے اراکین یعنی انصار کی نسبت مہاجرین تعداد میں زیادہ ہو گئے۔ اب اس شوریٰ میں تمام اہم لوگ موجود تھے اور عثمان کو

خبر کر دی گئی تھی۔ مگر ایک شخص، جس کی اس شوریٰ کے اجلاس کی کاروائی میں براہ راست دلچسپی تھی، وہ نہیں آپائے گا۔ اس موقع پر اس شخص کی غیر موجودگی کی وجہ سے کئی لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ اس شوریٰ کی بہر حال، بوجوہ کوئی اہمیت نہیں تھی یا کہیے یہ شوریٰ اسی وجہ سے اپنا جواز کھو بیٹھی تھی۔ یہ شخص علی تھے۔

مدینہ کے انصار کے لیے مہاجرین میں علی واحد شخص تھے جنہیں وہ بہر طور اپنے رہنماء کی حیثیت سے برضا اور بخوشی قبول کر لیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ کے باقی لوگوں کی نسبت وہ انہیں زیادہ قریبی سمجھتے تھے۔ محمد ﷺ کی والدہ ننھیال کا تعلق مدینہ سے تھا۔ علاوہ ازیں، محمد ﷺ اور علی کے دادا، یعنی عبد المطلب کا ننھیال بھی اسی نخلستان سے تھا، چنانچہ ان کا مدینہ سے بہر حال تعلق نکل آتا۔ چونکہ، محمد ﷺ کے قریبی مرد رشتہ داروں میں صرف علی ہی باقی تھے، اس لیے مدینہ کے لوگوں کے لیے انہیں اپنانے کی خواہش قدرتی تھی۔ لیکن، علی کی محمد ﷺ کے ساتھ یہی قربت اور نسبت کا نتیجہ تھا کہ آج وہ شوریٰ کے اس اہم اجلاس سے غیر حاضر تھے۔

یقیناً، علی کو شوریٰ کی خبر پہنچ گئی ہو گی۔ ان کے چچا، عباس جنہوں نے آج صبح ہی علی کے ساتھ مل کر محمد ﷺ کو سہارا دیا تھا اور بعد ازاں مصر تھے کہ علی واپس جائیں اور محمد ﷺ سے جانشینی کے بارے حتمی فیصلہ لیں۔ اب بھی، وہ علی پر زور دے رہے تھے کہ وہ بجائے میت کے سرہانے بیٹھے رہیں، انہیں چاہیے کہ شوریٰ میں جائیں اور اپنے حق کا دعویٰ کریں۔ انہوں نے علی کو یقین دہانی کرائی کہ ان کی جگہ وہ محمد ﷺ کی میت کے پاس موجود رہیں گے اور ایک لمحے کے لیے نہیں ہلیں گے۔ عباس کا ماننا تھا کہ اتنے اہم معاملے، بالخصوص جتنا کچھ داؤ پر لگا تھا، اس وقت ضروری تھا کہ علی سب کچھ چھوڑ کر صرف رہنمائی کا دعویٰ کریں۔

اگرچہ عباس نے اپنے تئیں بہتیری کوشش کر لی لیکن ہم تخیل میں علی کو سر جھٹکتے، ان کی ہر دلیل کو رد کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھلے کچھ بھی کہا کریں، علی وہاں سے ہلنے والے نہیں تھے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جیسے، وہ غم سے نڈھال تھے؟ محمد ﷺ سے ان کی نسبت، اس وقت انہیں دنیاوی کسی بھی چیز سے روکے ہوئے تھی؟ یا پھر وہ باقیوں کی اس روش، یعنی ابھی محمد ﷺ کی تدفین بھی نہ ہوئی تھی، یوں اختیار کے پیچھے اودھم مچاتے دیکھ کر متنفر تھے؟ کیا وہ اس شخص کی میت کو یوں چھوڑ سکتے تھے جس نے

انہیں باپ بن کر پالا تھا، ان کو زندگی کی ہر سہولت عطا کی تھی؟ وہ شخص جوان کا مائی باپ تو تھا، علی کے والد کا بھی چہیتا تھا۔ وہ جس نے انہیں ہمیشہ باقیوں سے کہیں بڑھ کر عزت بخشی تھی، اپنی بیٹی کا ہاتھ خود اپنے ہاتھوں سے ان کو تھمایا تھا۔۔۔ بھلا علی اس شخص کی میت کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ حالات و واقعات کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات صاف عیاں ہے، علی کی زندگی شاہد ہے کہ جس طرح وہ محمد ﷺ کے ساتھ ہر موڑ پر شانہ بشانہ کھڑے رہے، اب مرنے کے بعد بھی وہ ان کی میت کو اکیلا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ہر چیز سے بڑھ کر، علی اپنے عہد اور نسبت کے پکے تھے۔ وہ میت کے ساتھ رہیں گے اور انہیں یقین تھا کہ مدینہ کے لوگ کسی بھی صورت ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ کیا ہوا جو وہ خود وہاں موجود نہیں ہیں؟ مدینہ کے انصار ہر صورت ان کی رہنمائی کا حق منوا کر رہیں گے۔

اگرچہ علی خود تو ایمان اور عہد کے پکے تھے، لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہو گا جب دوسروں پر تکیہ کر لینے کی وجہ سے وہ نقصان اٹھائیں گے۔

سنیوں کے مطابق، شوریٰ کا یہ اجلاس حکمت اور اتفاق رائے قائم کرنے کی بہترین مثال ہے۔ یہ امت کا واقعی امتحان تھا جس میں امت کے ماننے والے سرخرو ہوئے۔ یعنی، انہوں نے پہلی بار مشترکہ طور پر، مل جل کر ایک انتہائی اہم تنازعے کا حل تلاش کر لیا اور درست فیصلے پر پہنچے۔ پیغمبر نے مرتے ہوئے امت پر اعتماد کیا تھا اور صحیح رہنما کو چن کر، محمد ﷺ کے پیروکار اس قضیے سے نکل آئے۔ بلکہ یہی تو وہ شے ہے جس کی محمد ﷺ نے ہمیشہ سے چاہ کی تھی۔ آپؐ کی خواہش یہی تھی کہ لوگ معاملات کو یوں ہی مکالمے سے طے کیا کریں۔ اس حوالے سے سنی پوری شدمد کے ساتھ محمد ﷺ سے منسوب یہ قول روایت کیا کریں گے کہ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ، 'میری امت کبھی بھی ضلالت اور گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی'۔ ہر لحاظ سے امت کی حیثیت متبرک اور مقدس ادارے کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اجتماعی رائے سے اتفاق واجب التعظیم اور اہم ہے۔ امت کی متفقہ رائے کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن، آنے والی صدیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سنی علماء کا یہ خیال بجائے امت کی حرمت، شیعہ کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اس کا مطلب کچھ یوں نکالا جائے گا کہ مسلمانوں میں وہ لوگ جو اکثریت یعنی سنیوں سے متفق

نہیں ہیں، کٹر معنوں میں کہا جاتا ہے کہ اکثریت یعنی سنیوں سے اتفاق نہیں رکھتے، سراسر گمراہی اور غلطی کا شکار ہیں۔ مراد، شیعہ اپنی ہٹ دھرمی یا کہیے اختلاف رائے کی وجہ سے خود بخود دامہ کے تصور سے خارج ہو جاتے ہیں۔

دوسری جانب شیعہ ہیں۔ ان کے نزدیک امت نہیں بلکہ ہمیشہ سے امت کی قیادت مقدس اور محترم رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنیوں نے خدائے ذوالجلال کی جانب سے نازل ہونے والے حکم، یعنی اختیار کی عطا کو منسوخ کر دیا۔ بجائے وہ حق دار کو اس کا حق دیتے، انہوں نے اسے آپس میں تقسیم کر دیا۔ بجائے خدا کی سنتے، خود ہی تعین کرنے بیٹھ گئے۔ مزید یہ کہ خدائی احکامات اور اختیار پر یہ غاصبانہ قبضہ پہلے ہی دن دیکھنے میں آ گیا تھا۔ اسلامی تاریخ کی پہلی شوریٰ نے اپنی حد سے بڑھ کر زبردستی احکام الہیٰ میں دخل اندازی کی تھی۔ پیغمبر کی وصیت تو صاف تھی۔ یعنی، صرف اور صرف علی ہی رسول خدا کے جائز اور واقعی جانشین ہوں گے۔ یوں، شیعہ کے مطابق علی کے سوا کسی دوسرے شخص کو خلیفہ تسلیم کرنا، نہ صرف محمد ﷺ بلکہ اسلام اور خدا کے ساتھ غداری ہے۔

یہ بات تو طے ہے کہ شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا تو ارادہ نیک تھا۔ لوگ پوری نیک نیتی سے اتحاد برقرار رکھنا چاہتے تھے، بلکہ یہی وہ ایک چیز ہے جو وہ دل و جان سے چاہتے تھے لیکن یہی واحد شے ہے جس کا حصول ناممکن نظر آ رہا تھا۔ جوں ہی مکہ کے مہاجرین بزور بازو اس اجلاس میں آن پہنچے تو مدینہ کے انصار تب ہی سمجھ گئے کہ اب ان کی خواہش، یعنی ان میں سے کوئی ایک یا ان کے کسی قریبی شخص کے لیے رہنما مقرر ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے واضح ہے کہ حالات کا رخ بدلتا دیکھ کر انہوں نے فوراً پینترا بدلا اور بجائے ایک نئی تجویز سامنے رکھی۔ اس تجویز کے مطابق دونوں گروہوں کے لیے علیحدہ رہنماؤں کا انتخاب کیا جانا تھا۔ تاریخ میں یہ بات کچھ یوں درج ہے، "انہوں نے کہا، 'کیوں نہ ہم انصار اپنا جبکہ مہاجرین اپنے لیے علیحدہ رہنما منتخب لیں؟'" لیکن، ابو بکر اور عمر نے اصرار کیا کہ امت کا صرف ایک ہی رہنما ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ جرح بھی کی کہ یہ رہنما، مہاجرین میں سے ہی کوئی شخص ہونا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مہاجرین وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ وہ محمد ﷺ کے اپنے قبیلے، قریش

سے تعلق رکھتے تھے اور یہ مہاجرین کی ہی دلی خواہش تھی جس کے سبب آج بجائے غیر ملک میں یروشلم، مکہ اور جزیرہ عرب مومنین کے لیے مرکز اور ایک بڑا تجارتی خطہ بن چکا تھا۔ ویسے بھی، اسلام تو اتحاد کا درس دیتا ہے بلکہ اس کی تو اصل روح ہی اتفاق اور ایکا ہے۔ علاوہ ازیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ معاملہ صرف مدینہ یا مکہ کا نہیں ہے، بلکہ ہمیں تو ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہیے جو ان دونوں شہروں کو متحد رکھ سکے۔ ان دونوں شہروں کے لوگ اور پورے جزیرہ عرب کی آبادی، ایک ہی شمار ہوا کرے اور ان میں کوئی تفریق نہ ہو۔ کہنا یہ تھا کہ یہ کام تو صرف اور صرف قریش سے تعلق رکھنے والا ہی کوئی شخص پورا کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے، شوریٰ میں بحث طول پکڑتی گئی۔ ساری رات اور پھر اگلا پورا دن بغیر کسی تعطل کے کاروائی جاری رہی۔ ایک کے بعد دوسری تقریر ہوتی رہی۔۔۔ ہر تقریر طویل، گرج دار، اشاروں کنایوں سے لدی اور پر مغز تھی۔ شوریٰ میں موجود سبھی لوگوں کے ذہن میں لوگوں کی فلاح اور بہبود سب سے اہم تھی اور اس بات کا اعادہ تقریباً ہر شخص اپنی تقریر میں خاصی تفصیل سے دوبارہ اور سہ بارہ کیے جا رہا تھا۔ عام طور پر اس طرح کے مواقع پر ایسی تقاریر، یوں ہی ہوتی ہیں۔ لیکن، ویسے ہی یہ بات بھی ہے کہ ایسی تقریریں کرنے والوں کے لیے لوگوں کے فلاح کے ساتھ ساتھ ذاتی مفاد بھی مقدم ہوا کرتا ہے، صرف اتنا ہے کہ اس کا تذکرہ ہمیں تقریروں میں نہیں ملتا۔ اس بابت، آفاقی کلیہ یہ ہے کہ رہنمائی کے خواہشمندوں کے لیے عوامی معاملات سے لگاؤ اور فلاح اکثر ہی ان کے ذاتی مفادات کے ساتھ ہم مکان بیٹھتا ہے، بالخصوص ایسے حالات میں، جب شخصیات انتہائی اہم ہوں۔ اس صورت تو بالضرور ہی ایسا ہوتا ہے جب عوامی معاملات ان سے جڑے ہوں اور ان شخصیات کی ذاتی زندگی کا عوامی معاملات پر دار و مدار ہو۔

چنانچہ، مہاجرین نے پوری توجہ انصار کو قائل کرنے پر مرکوز کر دی اور جلد ہی ان پر حاوی ہو گئے۔ طویل بحث کے بعد اب بات تو صاف ہو گئی کہ جانشین مکہ اور پھر قبیلہ قریش سے ہی ہو گا۔ یہ تو فیصلہ ہو گیا لیکن سوال یہ تھا کہ آخر قریش میں سے وہ شخص کون ہو گا؟ جہاں قریش، یعنی اس قبیلے کی اہمیت پر دلیل دی گئی تھی، اصولی طور پر یہاں بھی یہی ایسا ہی ہوتا۔ مطلب یہ کہ امت میں اگرچہ سب برابر تھے، لیکن پھر بھی

حسب اور نسب کا اصول یعنی اعلیٰ شجرہ نسب سے تعلق رکھنے والوں کی طرف جھکاؤ قائم تھا، اس کو مقدم رکھا گیا تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ شرافت اور برگزیدگی تو خون میں شامل ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے میں، جہاں حسب اور نسب کی اہمیت کسی بھی دوسری چیز سے بڑھ کر تھی بعد میں جب خانہ جنگی کا واقعی آغاز ہوا تو ہم دیکھیں گے کہ اس زمانے میں بھی جنگجو میدان میں اترنے سے پہلے اور کسی دوسرے پر وار کرنے سے پہلے باآواز بلند اپنا شجرہ گنوایا کریں گے۔ مراد یہ ہے کہ پہلے زمانوں میں اور اب محمد ﷺ کے بعد بھی، شجرہ کی اہمیت کم نہیں ہو سکی۔ اگرچہ قبائلی روایات کے معنی اصولی طور پر امت میں ڈھل گئے لیکن، حسب اور نسب سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی اہم ہی سمجھا جاتا رہا۔ تو اگر لوگ اپنے شجرہ پر نازاں رہتے تھے یا اپنے خاندان کی شرافت اور اعلیٰ نسبی کے دعویدار ہوا کرتے تھے، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی دیکھا، قریش کی بالا دستی قائم کی گئی تو اس اصول کے تحت علی کو تو بغیر کسی حیل اور حجت کے محمد ﷺ کا جانشین مقرر کر دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آخر کیوں؟

ایسا نہیں ہوا کیونکہ یہ سب اتنا سادہ نہیں ہے، جتنا سمجھ لیا گیا تھا۔ محمد ﷺ کی حیران کن طور پر پر اثر شخصیت کا جادو اور تحریک اسلام کی کامیابی کے نتیجے میں قائم ہونے والا اختیار ایک بات تھی۔ یہ انتہائی غیر معمولی کامیابی تھی۔ لیکن، قبائلی اثر ور سوخ میں تو ان کا کنبہ اور اب علی علیہ السلام، قریش جیسے بڑے قبیلے میں بے اختیار تھے۔ محمد ﷺ اور علی کا تعلق بنو ہاشم سے تھا جبکہ قریش کی باگ دوڑ بنو امیہ کے ہاتھ میں تھی۔ بنو امیہ کے لوگوں نے کئی سالوں تک محمد ﷺ کی زبردست مخالفت کی تھی۔ وہ ان کے جانی دشمن رہے تھے کیونکہ آپؐ کی تعلیمات، بالخصوص برابری کے پرچار کی وجہ سے ان کی بے پناہ دولت، امارت اور اقتدار کو خطرات لاحق ہو گئے تھے۔

سو بنو ہاشم میں ایک پیغمبر کا وارد ہونا، اس کنبے کا امتیاز بن گیا۔ قریش، بالخصوص بنو امیہ نے بھی طویل دشمنی کے بعد محمد ﷺ کی حاکمیت کو قبول کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ معاملہ تھا۔ اب آپؐ کے گزر جانے کے بعد حاکمیت کی یہ دلیل باقی نہیں رہی تھی۔ اب جبکہ وہ نہیں رہے تو قدرتی طور پر بنو ہاشم کا امتیاز ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ، نیا استدلال یہ تھا کہ اب قریش کے دوسرے کنبوں کو بھی رہنمائی کا اختیار ملنا چاہیے۔ اختیار پر

ان کا بھی حق ہے۔ کہا گیا کہ محمد ﷺ کی ہمیشہ سے تعلیم یہی رہی تھی کہ اختیار ایک ہی جگہ پر جمع نہ ہو۔ طاقت تقسیم ہونی چاہیے، دوسروں کو بھی انتظام اور انصرام میں، شامل حال کیا جانا چاہیے۔ وہ ساری زندگی، ایک شخص کی دوسرے پر، ایک کنبے کی دوسرے تمام کنبوں، یا ایک قبیلے کی باقی تمام قبائل پر فوقیت کے خلاف رہے۔ علی کو منتخب کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محمد ﷺ کے بعد ایک اور ہاشمی سربراہ بن جائے گا اور یوں خطرہ تھا کہ اسلام موروثی ملوکیت کا شکار ہو جائے گا، یعنی ریاست ایک ہی خاندان کی بادشاہت بن کر رہ جاتی۔ ایسا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ محمد ﷺ کی ساری زندگی کی محنت اکارت جاتی۔ اس سے بھی بڑھ کر الہامی پیغام کی نفی ہو جاتی۔ رہنمائی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے آپ وراثت میں حاصل کریں، یہ کوئی جائیداد تو نہیں۔ قیادت کا تعین خون یا حسب نسب نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور یہی محمد ﷺ کی مرضی تھی۔ اپنے اس دعوے، یعنی محمد ﷺ کی مرضی والی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا گیا کہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی باقاعدہ وارث یا جانشین مقرر نہیں کیا۔ انہیں اپنے لوگوں پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اپنے لیے، مل جل کر بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہر شے، مال و دولت، اختیار یا اپنے مفادات پر امت کی حرمت اور تقدس کو برقرار رکھیں گے۔ وہ ہمیشہ اصل روح کو زندہ رکھیں گے۔

بلاشبہ یہ تاویل جمہوریت کی حمایت میں دی گئی دلیل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بغور دیکھیں تو یہاں جمہور کا دائرہ کار محدود ہے۔ یعنی شوریٰ کے اراکین جمہور کے ہاتھوں منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ اثر ورسوخ اور اپنی نسبی حیثیت کی بنا پر شریک تھے۔ پھر اس شوریٰ کا پہلا قدم ہی ایک قبیلے تک اختیار کا حق محدود کرنا تھا، جو ایک لحاظ سے ناگزیر لگتا ہے مگر جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ مگر اس روز اختیار اور قیادت کے حوالے سے ابھرنے والا یہ نکتہ، ان واقعات کی نفی تھا جو پچاس سال بعد پیش آئیں گے۔ جب دمشق میں بنوامیہ سے تعلق رکھنے والا ایک خلیفہ تخت شاہی اپنے بیٹے کے حوالے کر کے پہلی بار ایک سنی شاہی سلسلے کی بنیاد رکھے گا۔ تب پیش آنے والے ان واقعات کے نتائج علی کے بیٹے حسین علیہ السلام کے لیے خاصے بھیانک ثابت ہوں گے۔ مگر اس دن کی مناسبت سے کہیں تو سچ یہ ہے کہ اپنی اصل حالت میں، محمد ﷺ کے بعد مدینہ میں منعقد ہونے والی اس شوریٰ کی مندرجہ بالا دلیل آنے والی صدیوں میں قائم ہونے والی ہر بادشاہت، خود ساختہ خلافت، شاہی عمل داری، قلمروی، سلطنت، فرمانروائی، راج اور آمریت کے بطن سے جنم لینے والی

سبھی صدارتوں کے خلاف تھی۔ اسی طرح جہاں ایک طرف اس دلیل کے تحت اقتدار اور اختیار ایک کنبے سے نکل کر سبھی میں بٹنا تھا، وہیں یہ دلیل بنو امیہ کے لیے بھی دوبارہ اقتدار کے حصول کا راستہ بن گئی جو قیادت کو چند ہاتھوں میں مجتمع رکھنے کی طرز حکومت کے نہ صرف عادی بلکہ ماہر تھے۔

چاہے یہ ساتویں صدی کا زمانہ ہو یا آج اکیسویں صدی کا جدید دور چل رہا ہو۔ مشرق یا مغرب، ہر جگہ پر چند خاندان، گروہ یا کنبے ہمیشہ سے ایسے ہوتے ہیں جن کی جڑوں میں حکمرانی اور قیادت مزمن سمجھی جاتی ہے۔ ان کی عادات اور اطوار، سمجھ اور بوجھ، طرز زندگی ہی حکومت کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے موروثی طور پر یہ چند لوگ پیدا ہی اس مقصد کے لیے ہوئے ہیں۔ دراصل، یہ ایک رویہ ہے۔ ایک ایسا انداز فکر جس میں اپنے تیئں یہ لوگ حکمرانی کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ طرز فکر کے اس تسلسل کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جسے جمہوریت کی زبان میں 'عوامی فلاح اور بہبود کی روایت' کہا جاتا ہے۔ اس روایت کو جاری رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ تسلسل قائم رہے اور حکومت ایک کے بعد دوسری نسل یا انہی کے ایک گروہ سے دوسرے گروہ کو بالضرور ہی منتقل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ باقاعدہ طور پر موروثی بادشاہت یا سلطنت کا وجود ہو، پس یا پیش منظر میں رہ کر، کسی بھی صورت ممکن ہو، ایسا ہونا ان کے نزدیک انتہائی ضروری ہے۔ اسی لیے ان کو جس زاویے سے دیکھیں، وہ اختیار سے چمٹے نظر آئیں گے۔ آج دنیا بھر میں ہم اس رویے کی کئی مثالیں صاف دیکھ سکتے ہیں۔ تب، ساتویں صدی میں قریش کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ عام طور پر سمجھا جاتا تھا اور خود قریش کا یہی دعویٰ تھا، پھر قریش میں بھی بنو امیہ وہ کنبہ تھا، جو اس نقطہ نگاہ کے ساتھ اپنی حاکمیت قائم کیے ہوئے تھا اور ان کے بارے عام خیال بھی یہی تھا کہ حکمرانی ان ہی کا خاصہ ہے۔ اس لحاظ سے، یعنی 'پیدا ہی حکومت کے لیے ہوا ہے' کے نظریہ کے تحت اگر شوریٰ کی نظر کسی پر ٹکتی تو بنو امیہ کی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے امیر کبیر، عثمان تھے۔ لیکن، وہ ابھی تک اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے، بلکہ مدینہ بھی نہیں پہنچے تھے۔ دو سال پہلے ہی، مکہ نے باقاعدہ مدینہ کی اسلامی ریاست کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اب تک مکہ کی اشرافیہ نے بنو امیہ کی قیادت میں محمد ﷺ اور مدینہ یعنی اسلام کے خلاف کم از کم دو بڑی جنگیں لڑی تھیں اور کئی سالوں تک جاری رہنے والی کشمکش میں جھڑپوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ ان لڑائیوں اور جھڑپوں کا کسی کو شمار بھی یاد نہیں ہے۔ ان جنگوں

اور لڑائیوں کی یاد ابھی تازہ تھی، زخموں پر ابھی تک ان جھڑپوں میں آنے والے زخموں کے نشان باقی تھے۔ ایسے میں، مدینہ کے انصار کسی بھی صورت بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کی قیادت قبول کرنے پر راضی نہیں تھے، بھلے وہ عثمان جیسی محترم اور قابل اعتماد شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔

منگل کے روز، شام ہونے تک ایسا لگ رہا تھا کہ شوریٰ مکمل طور پر ڈیڈ لاک کا شکار ہو گئی ہے۔ قریب تھا کہ شرکاء مسلسل بحث کے باعث تکان سے اضطراب شکار ہو جاتے اور اعصاب جواب دے جاتے۔ قریب تھا کہ یہ بھڑ جاتے۔ ممکنہ طور پر ایسا ہونا قدرتی تھا۔ وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے تقاریر سن رہے تھے، باری آنے پر تفصیل سے بول رہے تھے۔ سوچ سمجھ کر، تول کر بات کر رہے تھے۔ تجاویز پر غور کرتے اور جوابی تجاویز پر سر کھپاتے رہے تھے لیکن اتنی طویل مشقت کے بعد بھی حل کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ تب وہ ہوا جس کو شطرنج کے کھیل میں شہ مات کہا جاتا ہے، ابو بکر اور عمر نے ایک نہایت عمدہ چال چلی۔

کیا انہوں نے اس کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی؟ یہ کوئی نہیں جانتا، بلکہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہوا یہ کہ طویل مشاورت اور تھکا کر چور کر دینے کی حد تک کوفت کے بعد جانشینی کا مشکل مرحلہ ایک دم، نہایت خوش اسلوبی سے پورا ہو گیا۔ یہ اتفاق رائے تک پہنچنے کی اتنی زبردست حکمت عملی تھی کہ اس قدر گھمبیر مسئلہ ایک دم حل ہو گیا۔ جس آسانی سے سب لوگ راضی ہوئے تھے، علی کے پیروکار ہمیشہ یہی شک کرتے چلے آ رہے ہیں کہ شاید یہ پہلے سے طے شدہ معاملہ تھا۔

ہوا یوں کہ پہلے ابو بکر نے عمر کو خلیفہ کے طور پر نامزد کیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ محمد ﷺ کے انتقال کے فوراً بعد عمر کے ہسٹریائی انداز میں ہوش کھو دینے کی وجہ سے کسی بھی طرح سے اس مرحلے پر وہ موزوں انتخاب نہیں تھے۔ یہ ایسا موقع تھا، اسلام کو جنگجوؤں کی نہیں بلکہ مرہم رکھنے والے کی ضرورت تھی۔ اس نامزدگی کے جواب میں عمر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بجائے، عثمان کو نامزد کر دیا۔ جیسے عمر کے بارے ابو بکر جانتے تھے، عمر بھی عثمان کی بابت پوری طرح آگاہ تھے کہ بنو امیہ سے تعلق ہونے باعث وہ کسی صورت بھی خلیفہ مقرر نہیں کیے جائیں گے۔ وہ اس وقت کے حساب سے فوراً ہی نااہل قرار دے دیے جاتے۔ پھر، ایسا ہی ہوا۔ دونوں ہی تجاویز کی ایک دم شدید مخالفت شروع ہو گئی اور بات اتنی بڑھ گئی کہ

شرکاء ہاتھا پائی پر اتر آئے۔

تقاریر جلد ہی شور شرابے میں بدل گئیں۔ اب تک ہر شخص تحمل کا دامن تھامے چلا آرہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے صبر چھوڑ گیا اور ایک دوسرے کی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں۔ یہاں تک کہ ابن عبادہ جو مدینہ سے تعلق رکھتے تھے اور دلیل پر راضی چلے آرہے تھے، وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے شوریٰ کا اجلاس بلایا تھا، اب وہ کھل کر سامنے آگئے اور مہاجرین پر قیادت ہتھیانے کے حربے استعمال کرنے کا الزام لگادیا۔ ابھی ان کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ چاروں طرف سے مہاجرین مکے لہراتے ہوئے ابن عبادہ پر ٹوٹ پڑے اور بیچ اجلاس میں انہیں جالیا۔ کمرے میں دھینگا مشتی شروع ہوگئی اور ابن عبادہ کو اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔

اجلاس کا یہ حال دیکھ کر لوگوں پر سراسیمگی چھاگئی۔ یہ اچانک کیا ہوا؟ مار دھاڑ سے لوگ ہکا بکا تھے۔ مہاجرین کے یوں اچانک تشدد پر اتر آنے سے مدینہ کے لوگوں کی ساری اکڑ فوں نکل گئی۔ وہ فوراً ہی مزاحمت سے پیچھے ہٹ گئے۔ ابن عبادہ بے ہوش تھے، ان کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ انصار میں ابن عبادہ کا یہ حال دیکھ کر ہراس پھیل گیا اور وہ سخت نراس تھے۔ ہر شخص دم بخود تھا کہ شوریٰ جیسے معتبر اجلاس کی کاروائی بھی اس نہج پر پہنچ سکتی ہے؟ شرکاء میں سے کسی کے دل میں اب مزید بحث مباحثے، مکالمے اور مذاکرے کی کوئی خواہش باقی نہیں تھی۔ اسی لیے جب آخری تجویز سامنے آئی تو سب نے جیسے اس کے سامنے ہار مان لی۔ اس موقع یا کہیے آخری تجویز بارے شیعہ کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ یہ پہلے سے ہی طے شدہ چال تھی۔ دوسری جانب، سنی کہا کریں گے کہ یہ اتفاق رائے اور حکمت کی بہترین مثال تھی۔ ہوا یہ کہ شوریٰ کی یہ درگت بنتے دیکھ کر عمر اچانک اٹھے اور اپنی دانست میں حتمی سمجھوتے کا بہترین طریقہ پیش کیا۔ اس بابت تاریخ میں عمر سے منسوب روایت میں ان کا انداز مختصر اور شستہ مگر حتمی ہے۔ وہ دوٹوک، فوجی انداز میں بیان کرتے ہیں، "جھک جھک بہت بڑھ گئی اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تو ماحول بہت گرم ہو گیا۔ آوازیں اونچی ہوتی جارہی تھیں اور خدشہ تھا کہ اب یا تب، بس پھوٹ پڑنے والی ہے۔ ایسے میں، میں نے کہا، 'ابو بکر، اپنا ہاتھ باہر نکالو!'، انہوں نے ایسا ہی کیا اور میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر دی۔ میری

دیکھا دیکھی، پہلے مہاجرین اور پھر انصار نے بھی اپنی باری پر بیعت کر لی'۔

یوں، یہ معاملہ بالآخر طے ہو گیا۔ محمد ﷺ کے جانشین یعنی خلیفہ ابو بکر ہوں گے۔ وہ محمد ﷺ کی سب سے ممتاز، بے باک اور کئی لوگوں کے نزدیک نزاعی بیوہ عائشہ کے والد تھے۔

محمد ﷺ کی تدفین حیران کن طور پر انتہائی سادہ اور افراتفری کے عالم میں کی جائے گی۔ در حقیقت، اس بابت خاصی راز داری برتی جائے گی۔ آج، جس طور کی رش ہم محمد ﷺ کے روضے پر دیکھتے ہیں، یہ بات نہایت تعجب کا باعث ہے کہ تب، یعنی تدفین کے موقع پر اس بابت قرب و جوار میں کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اب تو یہاں ہر وقت زائرین کا رش رہتا ہے۔ روضے پر آج بھی ممکنہ طور پر نقص امن کے خدشے سے نبٹنے کے لیے چوبیسوں گھنٹے غیر محسوس انداز میں پہرہ دیا جاتا ہے۔

جس وقت علی اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو ابو بکر کے انتخاب کی خبر پہنچی تو محمد ﷺ کو گزرے ڈیڑھ دن بیت چکا تھا۔ جون کی گرمی میں، ان کی تدفین کی رسومات جلد از جلد مکمل کیے جانے کی متقاضی تھیں۔ رواج کے مطابق تو میت کو چوبیس گھنٹوں کے اندر دفن کر دیا جانا تھا لیکن شوریٰ کے اجلاس کی وجہ سے، جہاں چیدہ لوگ، قبائلی سردار اور محمد ﷺ کے مشیران اور کنبوں کے سربراہ جمع تھے، تاخیر ہو رہی تھی۔ ایسے میں علی اور عباس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ انتظار کریں۔ اب جب کہ شوریٰ کی کاروائی مکمل ہو چکی تھی۔ ابو بکر کی بطور خلیفہ تقرری ہو گئی تو علی کے لیے حالات کا دھارا، دیکھتے ہی دیکھتے چند گھنٹوں کے اندر بدل گیا۔ عین ممکن تھا کہ ابو بکر آپؐ کی تدفین کا انتظام کچھ اس طرح کروانا چاہیں گے جو آپؐ کے شایانِ شان تو ہو لیکن اس کے ساتھ اس موقع پر ابو بکر کے انتخاب، یعنی محمد ﷺ کے جانشین کے طور پر زبردست مظاہرہ بھی دیکھنے کو ملے۔ دوسرے الفاظ میں کہیے، وہ اس اجتماع کو اپنے انتخاب کی توثیق کے لیے استعمال میں لا سکتے تھے۔ علی انہیں اس موقع سے محروم کر دیں گے۔ محمد ﷺ کی تجہیز و تکفین کا کوئی اجتماع منعقد نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں رات کی تاریکی میں انتہائی خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا جائے گا۔

بدھ کے دن، صبح تڑکے میں، عائشہ کی آنکھ مسجد کے احاطے میں زمین کھرچنے اور کھودنے کی آواز سے کھل گئی۔ چونکہ محمد ﷺ کی میت ان کے کمرے میں رکھی گئی تھی اس لیے وہ حفصہ کے ساتھ ان کے یہاں منتقل ہو گئیں۔ حفصہ کا کمرہ یہاں بس چند قدم دوری پر تھا۔ چونکہ وہ غم سے نڈھال تھیں اور پچھلے دو دن کی شب بسری سے کافی تھک چکی تھیں، اس لیے باہر نکل کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اگر وہ اٹھ کر دیکھتیں تو انہیں پتہ چلتا کہ یہ شور پتھریلی زمین کھدنے کا تھا۔ علی اور ان کے قریبی رشتہ دار کدال اور بیلچے سنبھالے محمد ﷺ کی قبر، عائشہ کے کمرے میں تیار کر رہے تھے۔

بعد میں اس کی وجہ کچھ یوں بتائی جائے گی کہ محمد ﷺ نے ایک بار کہا تھا کہ پیغمبر کو وہیں دفن کرنا چاہیے جہاں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ چونکہ آپ ؐ کا انتقال اسی کمرے میں سونے کے لیے بنائے گئے چبوترے پر ہوا تھا، آخری آرام گاہ بھی یہیں بنانا لازم ٹھہرا۔ ان کی قبر اس چبوترے کے قدمچے میں بنائی گئی۔ جب ضرورت کے مطابق، قبر کافی گہرائی تک کھود لی گئی تو میت کو بستر سمیت احتیاط سے اٹھا کر، سر کا رخ مکہ جانب رکھ کر، اس میں اتار دیا گیا۔ پھر جلدی سے دہانہ پتھروں سے ڈھانپ کر مٹی ڈال دی گئی اور کیچڑ سے لپائی بھی ہو گئی۔ اس کے اوپر پتھر کی سلیٹ کا ایک کتبہ بھی نصب کر دیا گیا۔

یوں، نمود و نمائش کے بغیر انتہائی سادگی سے محمد ﷺ کو دفنا دیا گیا۔ عوامی سطح پر رسومات ادا کی گئیں اور نہ ہی جنازے کا اجتماع منعقد ہوا۔ نوحہ گروں کے جلوس نکلے اور نہ ہی ان کی یاد منائی گئی۔ نوحے لکھے اور نہ ہی کسی نے ان کے قصیدے گائے۔ اس موقع پر ان کی بیویوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ مہاجرین اور انصار میں سے بھی کوئی نہیں تھا حتیٰ کہ ان کے دیرینہ ساتھیوں کو بھی زحمت نہیں دی گئی۔ جس طرح پچھلی شام شوریٰ نے جانشینی کے معاملے پر اپنا فیصلہ سنایا تھا، علی نے محمد ﷺ کی تدفین کا یوں اہتمام کر کے منہ در منہ حساب برابر کر دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے دیا، اپنی مرضی بتا دی۔ وہ سب سے نالاں تھے۔ انہوں نے اپنا احتجاج اس طرح ریکارڈ کرایا اور بغیر کچھ کہے یوں ہی خفگی کا اظہار بھی کر دیا۔ عائشہ کا کمرہ، وہ جگہ جہاں ان کی بسر رہی تھی اب محمد ﷺ کا مزار بن چکا تھا۔ ان کے والد اسلامی ریاست کے پہلے خلیفہ مقرر ہو چکے تھے۔ ابو بکر خلافت کے دور میں، پہلے خلیفہ تھے۔ ان کے بعد اور علی سے پہلے،

یعنی اگلے پچیس برسوں کے دوران دو مزید خلفاء مقرر کیے جائیں گے۔ علی اس ربع صدی کو 'خاک اور خار کے سال' کہا کرتے تھے۔ ان کے لیے دھول اور کانٹوں پر بسر ہونے والے اس طویل زمانے کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔

حصہ دوم: علی علیہ السلام

باب 6

اگر آپ تقدیر میں یقین رکھتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ شاید علی کی قسمت میں خلافت لکھی ہی نہیں تھی۔ مگر جب علی خلیفہ منتخب ہوئے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزرے پچیس برس بیت چکے تھے۔ جن حالات میں انہوں نے یہ عہدہ سنبھالا اور پھر بعد اس کے جو واقعات رونما ہوئے، ایسے لگتا ہے جیسے قسمت کے لکھے کو رد کر کے، انہوں نے یہ عہدہ سنبھال کر گویا تقدیر کو طیش دلا دیا ہو۔ وہ ان پچیس برسوں میں ایک نہیں، دو نہیں بلکہ تین بار نظرانداز کیے گئے۔ کہا کرتے کہ یہ تمام عرصہ وہ یوں جیے جیسے 'آنکھوں میں دھول اور منہ میں کانٹے بھرے ہوں'۔ وہ اس ربع صدی پر محیط زمانے کو 'خار اور خاک کے سال' کہا کرتے تھے۔

دھول اور کانٹے، غریب الوطنی کی تصویر ہیں۔ یہاں مادی نہیں بلکہ وجود کی جلاوطنی کا تذکرہ ہے۔ یوں کہیے، انہوں نے اپنا آپ کھو دیا۔ کہنے کو تو اس شہر مدینہ میں بستے تھے لیکن وجود اور مقصد حیات گم ہو چکا تھا۔ علی کے لیے تو یہ تصویر بے رحمانہ حد تک طعن آمیز تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کئی خطابات سے نوازا تھا۔ ان میں سے ایک 'شیر خدا' بھی تھا۔ ایک وقت تھا جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت پر فائز تھے۔ ہر طرف ان کا چرچا رہا کرتا تھا، مگر اب وہ ایک دوسرے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہی دیے خطاب سے پکارے جانے لگے۔ انہیں لوگ 'شیر خدا' کی بجائے 'ابو تراب' کہہ کر بلاتے تھے۔ ابو تراب سے مراد، 'مٹی یا دھول کا باپ' ہے۔ آج جدید دور میں ہو سکتا ہے لوگوں کو یہ نہایت ہتک آمیز خطاب لگتا ہو مگر عرب روایت اس بارے خاصی مختلف ہے۔

علی کے اس نام بارے کئی باتیں مشہور ہیں، طرح طرح کی روایت مل جاتی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علی کا یہ نام، ان کے گھوڑے کے سبب پڑا جو میدان جنگ میں دشمن کی طرف سرپٹ دوڑنے سے پہلے، کھروں سے دھول اڑایا کرتا تھا۔ ایک دوسری روایت کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ محمد ﷺ نے علی کو طوفان گردوبار میں، اپنے چہار سو سے بے نیاز مراقبے کی حالت میں بیٹھے دیکھا۔ ان کے کپڑے دھول اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ اپنی اور نہ ہی اطراف کی کچھ خبر تھی۔ یہ یکسوئی دیکھ کر محمد ﷺ نے انہیں بے اختیار ابو تراب کا نام دے ڈالا۔ ایک تیسری روایت، مدینہ کے اوائل دور کی ہے۔ مسجد کی تعمیر جاری تھی اور علی سخت جان مزدوری میں جتے ہوئے تھے۔ مٹی اور پتھر ڈھونے کا تجربہ نہیں تھا، اس لیے چہرے پر گندھی مٹی کا کیچڑ اور سر میں دھول پڑی تھی۔ محمد ﷺ نے مزاقاً انہیں 'ابو تراب' کہہ کر بلایا اور یوں ان کا نام پکا ہو گیا۔ اسی طرح یہ مشہور ہے کہ مہاجرین کو مدینہ میں وارد ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ زرائع معاش مسدود تھے اور بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ علی سمیت تقریباً سب ہی مہاجرین کو جان توڑ مزدوری کرنی پڑتی۔ وہ پتھر توڑتے اور پانی ڈھو کر گزارہ کرتے تھے۔ انہی دنوں کی یاد میں محمد ﷺ نے علی کو مٹی ڈھونے اور پتھر توڑنے کی مزدوری کے سبب ابو تراب کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان دنوں علی کو شب و روز کا کچھ ہوش نہیں ہوتا تھا اور وہ ہر وقت مٹی میں اٹے پھرتے تھے۔ چنانچہ یہ شبیہ مزدور پیشہ طبقات میں آج بھی خاصی مشہور ہے۔ علی کے پیروکار جن کی گزر بسر تمام عمر مزدوری پر ہوتی ہے، وہ آج بھی انہیں اسی نام کے سبب اپنا کرتا دھرتا، مولا اور ساتھی مانتے ہیں۔ یوں کئی طرح سے علی کا یہ نام، یعنی 'ابو تراب' گویا اوائل دور عرب مسلمانوں اور نئی اسلامی دنیا کی ایک بڑی آبادی کے بیچ ربط کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی سب ہی روایات کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ شاید، ایسا ہی ہوا ہو گا۔ ان تمام بیانات میں دھول اور مٹی کمی کی بجائے، عزت اور منزلت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ مٹی بارے آج بھی یہی مشہور ہے۔ سبھی مسلمان مٹی کو مقدس جانتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اسی مٹی سے اٹھائے گئے تھے بلکہ اسی مٹی میں بالآخر مل کر مٹی ہو جائیں گے اور روز قیامت اسی مٹی سے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ شیعہ کے یہاں، خاک سے یہ نسبت دوسروں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ آج بھی نجف کی ریتلی مٹی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ نجف، عراق میں بغداد سے کوئی سو میل جنوب میں واقع شہر ہے جہاں علی کا مزار ہے۔ یہ

لوگ، یہاں کی مٹی کو گوندھ کر اس کی ٹکیاں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جب بھی عبادت کریں تو سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سجدے میں پیشانی اس مٹی پر ٹکتی ہے، گویا دنیا میں جہاں بھی ہوں وہ نجف میں دفن 'ابو تراب' کے مزار کی مٹی سے جڑے رہتے ہیں۔ ماتھا ٹیکتے ہیں تو مقدس مٹی سے جا ملتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ شیعہ میں سے ہر شخص مر کر اسی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں، شیعہ کی آخری خواہش نجف یا کربلا میں دفن کیے جانے کی ہوتی ہے۔ یہ روایت سینکڑوں سالوں سے یوں ہی چلی آ رہی ہے۔ پہلے پہل میتوں کو قالین جیسی موٹی چادروں میں لپیٹ کر خچروں اور اونٹوں پر لادے یہاں پہنچایا جاتا تھا۔ آج کل کاریں اور ٹرک اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ شیعہ سوگواران جلوس کی شکل میں اپنے پیاروں کے جنازے اٹھائے یہاں آتے ہیں اور نجف میں علی اور کربلا میں حسین علیہ السلام کے مزار کے قرب و جوار میں قائم دو بڑے اور قدیم قبرستانوں میں دفن کر دیتے ہیں۔ ان جڑواں قبرستانوں کو 'وادی امان' کہا جاتا ہے۔ شیعہ کا ماننا ہے کہ مر کر یہاں دفن ہونے والا روز آخر علی اور حسین علیہ السلام کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔ یہاں مدفن شخص جب موت سے اٹھے گا تو مہدی کے لشکر میں شمار ہوگا۔ مہدی بارے مشہور ہے کہ وہ علی کے جانشین ہیں اور شیعہ کے آخری امام ہوں گے۔ جو انہیں ایک بار پھر، اپنی رہنمائی میں انصاف اور سچائی کے ایک زریں دور میں لے جائیں گے۔

لیکن، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آنے والے دنوں میں علی کے لیے انصاف اور سچائی کوسوں دور چلی گئی تھی اور اس کا سراغ تک نہیں ملتا تھا۔ ' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انصار اور ان کی آل پر یہ مصیبت کی گھڑی ہے'، انصار میں سے ایک، علی کے حمایتی نے لکھا، 'یہ زمین انصار پر تنگ ہو چکی ہے اور ان کے چہرے سرمے کی طرح سیاہ ہو چکے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ننھیال یہیں کا تھا اور ان کا مزار بھی ادھر ہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس دن، جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منوں مٹی میں دفن کیا گیا، خدا ہمیں بھی اٹھا لیتا۔۔۔ ہمارے مرد اور عورتیں، بعد ان کے ختم ہو جاتے۔ ہم اسی دن مر کیوں نہیں گئے؟ ہماری تو بے انتہا تذلیل ہو گئی'۔

ہاشمی کنبے سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر نے یوں گرہ لگائی، 'ہم تو وہ ہیں جنہیں عجب رنگ میں دھوکہ ملا۔۔۔'

شیعہ کے ہی مطابق، وہ وراثت سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ ان کے تئیں، وہ مقام جو ان کے لیے حاصل ہونا لازم تھا، چھین لیا گیا۔ اسلام کی رہنمائی کا حق، جو محمد ﷺ کے کنبے کا جائز حق تھا، غصب کر دیا گیا۔ یہ وراثت اور اس سے محروم کیے جانے کا احساس آنے والے وقتوں میں رفتہ رفتہ شیعہ کے دل و دماغ کی میں جم کر بیٹھ جائے گا، اس کا خیال پختہ ہو جائے گا۔ یہ ایسا زخم ہے جو آج بھی ویسے کا ویسا رستا رہتا ہے۔ مثلاً حالیہ تاریخ میں دیکھیں تو بیسویں صدی کے دوران اس سے اٹھنے والی ٹیس پہلے پہل مغربی استعماریت کے خلاف بنیاد بنی۔ پھر ایران میں برپا ہونے والے انقلاب کا پہلا پتھر ثابت ہوئی۔ اس کے بعد لبنان میں خانہ جنگی کا موجب بنی اور آج اکیسویں صدی میں امریکی حملے کے بعد عراق اور شام میں جاری خانہ جنگیوں کا باعث ہے۔ وراثت سے محرومی کا یہی احساس ہے جو وقت کے ساتھ لوگوں کو ایکا کرنے پر مجبور کر دے گی۔ انہیں ایک ہی گٹھ میں باندھ دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ 1960ء میں شائع ہونے والی فرانز فانن کی استعمار کے خلاف کلاسیکی کتاب 'زمین کے بد نصیب' ایران میں ایک دوسرے، 'زمین کے لاوارث' کے عنوان سے طویل عرصے تک ہاتھوں ہاتھ بکتی رہی۔ یہ عنوان ہر طرح سے شیعہ آبادی کو عمل پر اکسانے کے لیے کافی تھا کیونکہ یہ اوائل دور اسلام میں علی اور ان کے حمایتی شیعہ کے تجربات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس داستان میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ آخر کار علی اپنے حمایتیوں یعنی شیعہ کی مدد کے بل بوتے پر 'وراثت' دوبارہ سے حاصل کر لیں گے۔ تاہم اس کے لیے انہیں مورچہ بند ہونا پڑے گا۔ وہ جان لیں گے کہ اگر اکٹھ بنا کر صف آراء ہوں گے تو ہی منزل ملے گی۔ یہ جب ہو گا، تب ہو گا۔ فی الوقت تو علی اور ان کے پیروکاروں کے سامنے 'خاک اور خار' کے طویل زمانے کا ایک اونچا پہاڑ سر کرنے کو کھڑا تھا۔

کانٹے فوراً ہی چبھنا شروع ہو گئے۔ مدینہ بھر میں گہما گہمی تھی۔ لوگ جوق در جوق مسجد پہنچ رہے تھے اور لمبی قطاروں میں کھڑے ابو بکر کی بطور خلیفہ تقرری کی توثیق کرتے ہوئے، ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ لیکن وہ شخص جو اس انتخاب کے دوران نظر انداز کر دیا گیا تھا، اس نے خود کو اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کے ہمراہ گھر میں بند کر دیا۔ علی نے اعلان کیا کہ وہ اور ان کا خاندان سوگ کی حالت میں ہیں۔ یہ درست بھی تھا۔ لیکن اس طرح وہ ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار بھی کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے اعلانیہ سرکشی اور حکم عدولی تھی اور آگے چل کر یہ بڑا مسئلہ بن سکتا تھا۔ اگر علی یوں ہی منکر

تعاون رہے تو عین ممکن تھا کہ مدینہ کے انصار ان کی پیروی میں باہر نکل آتے اور ابو بکر کی بطور خلیفہ تقرری سے انکار کر دیتے۔ شوریٰ کو اوندھا کر دیتے۔ یعنی اس مجلس اور اس کے فیصلے کی افادیت اور اہمیت کی دھجیاں اڑ جاتیں۔ جہاں علی کو قائل کرنا لازم تھا وہیں اس کے ساتھ یہ کام جلد از جلد نمٹ جانا بھی اشد ضروری تھا۔ چنانچہ، انہیں منانے کے لیے ابو بکر نے عمر کو اس مسئلے سے نبٹنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ لیکن ہوا یہ کہ عمر کے ہاتھ میں معاملہ آتے ہی بات سلجھنے کی بجائے بگڑ گئی۔

یہ ایسا کام تھا جس کے لیے انتہائی زیرک سفارت کار، صابر شخص کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا ہوتا جو علی کو مکالمے سے قائل کرتا مگر ابو بکر نے اس مقصد کے لیے عمر جیسے زور آور جنگجو کا انتخاب کیا، جو بد قسمتی ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ عمر کی جرات اور بحیثیت سپہ سالار کمال مہارت بارے کسی کو کوئی شک نہیں ہے لیکن اس نازک کام، جس کے لیے انتہائی صبر اور طویل مکالمے کی ضرورت تھی، عمر کا خاصہ نہیں تھا۔ وہ آن کی آن میں مسئلے کو حل کرنا جانتے تھے۔ بجائے زبانی کلامی باتوں اور نزاکتوں میں پڑتے، فوراً ہی آہنی ہاتھ سے نبٹنے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح سے اٹکل چلانے والے شخص نہیں تھے۔ وہ لوگوں کو چھل پرت کر کے قائل کرنے کے قابل نہیں تھے۔ لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنا حامی بنانا، ان کا کبھی شیوہ نہیں رہا تھا۔ وہ تو دو ٹوک بات پر یقین رکھتے تھے اور اس رات، انہوں نے اپنی شخصیت کے اسی رخ کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ عمر نے مسلح اشخاص کا ایک گروہ جمع کیا اور ان کو لیے علی کے یہاں پہنچ گئے۔ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ۔ وہ خود دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند، تقریباً چلاتے ہوئے علی کو باہر نکل کر ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا حکم دیا۔ علی کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی فوراً دھمکی دے ڈالی کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ اور ان کے آدمی، علی کے گھر کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔

بعد ازاں، اس رات کے واقعات بتاتے ہوئے علی نے کہا، 'اگر اس رات میرے ساتھ صرف چالیس آدمی ہوتے تو میں عمر کی دھمکی کا جواب پوری طاقت سے دیتا'۔ لیکن اس رات علی کے یہاں صرف ان کے خاندان کے قریبی لوگ ہی موجود تھے جنہیں ہم 'اہل بیت' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ علی نے جواب میں بوجوہ حکمت سے کام لیتے ہوئے، انتہائی مجہولی انداز میں عمر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

چونکہ عمر نے بات ہی دھمکانے سے شروع کی تھی۔ دھمکی بھی ایسی تھی کہ جو سنتا، دم بخود رہ جاتا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ محمد ﷺ کے خاندان کو گھر کے اندر جلا کر بھسم کر دیں گے، جو ظاہر ہے ناممکن تھا۔ اب ان کے پاس بظاہر اس کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ اگر علی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے باہر نہیں نکلتے تو پھر انہیں، یعنی عمر کو بزور بازو پوری قوت سے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ جب علی نے انکار کیا تو عمر کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔ وہ پیچھے ہٹے اور خاصی دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور پوری قوت سے دروازے کو دھکا دیا۔ قبضے اور چھپکے ٹوٹ گئے۔ دروازہ دھڑام سے اندر گر گیا اور دروازے کے پیچھے پیچھے چھ فٹ قد اور بھاری بھر کم وزن رکھنے والے عمر بھی چھاٹ سے لڑھکتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ بدقسمتی سے دروازے کی دوسری طرف فاطمہ کھڑی تھیں جو پہلے دروازے اور پھر عمر، جو اپنے وزن پر قابو نہیں رکھ پائے تھے، گرے تو ان کے نیچے دب گئیں۔

فاطمہ، حمل سے تھیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فاطمہ کو صرف چند خراشیں آئیں۔ دوسروں نے تاریخ میں درج کرایا کہ اس حادثے میں ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ لیکن، تمام ہی روایات میں ایک بات مشترک ہے کہ عمر، فاطمہ کو اس حالت میں دیکھتے ہی ہکابکا رہ گئے۔ وہ عمر کے قدموں میں پڑی تھیں اور درد سے کراہ رہی تھیں۔ جیسے ہی علی نے آگے بڑھ کر فاطمہ کو سہارا دے کر اوپر اٹھانا چاہا، عمر فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔ وہ اپنا کام کر چکے تھے، یعنی علی پر بات واضح ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کے چند ہفتوں بعد، کمزوری سے بے حال فاطمہ نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسقاط حمل کی وجہ اس رات پیش آنے والا حادثہ تھا یا یہ فاطمہ کی پہلے سے ہی گرتی ہوئی صحت تھی، جس کے سبب ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ہر دو صورت، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابو بکر یا کم از کم عمر کی طرف سے علی کو معاملہ سلجھانے کے لیے رسمی طور پر گفت و شنید کرنے کی پیش کش کی جاتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یقیناً یہ کچھ اچھی شروعات نہیں تھی۔

ہوا یہ کہ فاطمہ کو پہنچنے والی تکلیف کا ازالہ کرنے کی بجائے اگلا قدم جائیداد سے علیحدہ کرنے کا اٹھایا گیا جو فاطمہ اور علی کے مطابق ان کا جائز حق تھا۔ اسقاط حمل کے کچھ دن بعد، فاطمہ نے ابو بکر کو پیغام بھیجا کہ محمد ﷺ کی جائیداد میں سے ان کا حصہ ادا کیا جائے۔ جائیداد میں، مدینہ کے شمال میں واقع خیبر اور فدک کے نخلستانوں میں واقع وسیع و عریض کھجور کے باغات اور دوسری املاک تھیں۔ مرتے وقت، یہ سب محمد ﷺ کی ملکیت تھیں۔ ابو بکر کے جواب نے فاطمہ کو سٹ پٹا کر رکھ دیا۔ جواب یہ آیا کہ محمد ﷺ کی جائیداد کسی ایک شخص نہیں بلکہ امت کی ملکیت ہیں اور بطور خلیفہ وہ ان املاک کا انتظام سنبھالنے میں بااختیار ہیں۔ اب یہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ وہ کسی بھی صورت، امت کے باقی لوگوں سے زیادتی نہیں کر سکتے اور یوں ان املاک کو گنے چنے لوگوں میں بانٹنے کے روادار نہیں ہیں۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ابو بکر نے کہا، 'آپؐ نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارے یہاں کوئی وراثت اور کوئی وارث نہیں ہے۔ ہم جو بھی اپنے پیچھے چھوڑ جائیں وہ خدا کے نام پر صدقہ شمار ہو گا'۔

فاطمہ کے پاس ابو بکر کی زبان پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی، بھلے وہ اس بابت ذاتی طور پر معترض ہوتیں، ابو بکر کی صداقت اور دیانت پر کسی کو شک نہیں تھا۔ سنی بعد ازاں ابو بکر کے اس دو ٹوک جواب کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے، اجتماعیت کی انفرادیت پر فوقیت کی دلیل پیش کریں گے۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ابو بکر کہتے ہوں، 'صرف تم ہی محمد ﷺ کا گھرانہ نہیں ہو بلکہ ہم سب امتی آپؐ کا گھرانہ ہیں'۔ لیکن شیعہ اس بات پر قائل ہیں کہ محمد ﷺ کے گھرانے کے لوگ، یعنی ان کے قریبی خاندان کو اب دوہرے انداز میں وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ایک شاعر نے اس بات کو یوں لپیٹا، 'علی کو رہنمائی سے دور کر دیا اور فاطمہ کو جائیداد سے محروم ہونا پڑا'۔

ابو بکر نے فاطمہ کا مطالبہ رد کر دیا۔ اس جواب میں جو مقبول بیانیہ ہے، صاف ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ محمد ﷺ کا گھرانہ دراصل اسلام کا گھر ہے اور اسلام میں سب برابر ہیں۔ لیکن برابری کی بات کچھ یوں ٹھہری کہ کچھ ایسے بھی تھے جو باوجود اس بیانیے کے پر اثر ہونے کے، دوسروں سے زیادہ کے حقدار قرار پائے۔ اگرچہ فاطمہ کا دعویٰ رد کر دیا گیا لیکن ابو بکر نے بطور خلیفہ محمد ﷺ کی بیواؤں پر خوب نوازش کی۔

بالخصوص اپنی بیٹی عائشہ کو تو خصوصی عطا ہوئی۔ انہیں مدینہ کے نخلستان میں اور جزیرہ عرب کی دوسری سمت میں واقع بحرین کے علاقے میں بیش قیمت املاک کی ملکیت بخش دی گئیں۔

فاطمہ کے لیے یہ انت تھا۔ یعنی ان کے والد کی سب سے چھوٹی اور خود سر بیوی پر تو خوب عنایت ہوئی لیکن آپؐ کی پہلی اور محبوب بیوی کی بیٹی کو یوں ٹھکرا دیا جائے گا؟ وہ اسقاط حمل یا پھر ابو بکر کے ساتھ جائیداد کے معاملے پر تلخی سے کبھی دوبارہ جانبر نہیں ہو سکیں۔ لیکن ان چند مہینوں کے دوران پیدائشی طور پر مردہ پیدا ہونے والے بچے کے غم کے بعد انہیں سب سے زیادہ دکھ برادری سے دیس نکالے کا سہنا پڑا۔ ابو بکر نے علی کو راہ راست پر لانے کی کوششوں میں ایک انتہائی سخت قدم اٹھایا اور علی کے گھرانے کے سماجی بائیکاٹ کا عندیہ دے دیا۔

ایک ایسے معاشرے میں، جہاں سب کچھ ہی میل جول اور رشتہ برادری پر چلتا ہو، سماجی بائیکاٹ ایک طاقتور ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ بائیکاٹ کے دوران ہر دن، ہفتہ اور مہینہ گزرتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جس کا بائیکاٹ کیا گیا ہے، وہ اپنا وجود ہی کھو بیٹھتا ہے۔ لوگ پیٹھ موڑ لیتے ہیں، دوست فاصلہ رکھتے ہیں اور جاننے والے پاس سے گزرتے ہوئے حال بھی نہیں پوچھتے۔ لوگوں کا رویہ کچھ ایسے سرد پڑ جاتا ہے جیسے آپ وجود ہی نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ مسجد میں بھی، علی کو اب تن تنہا ہی عبادت کرنی پڑتی تھی۔

یہ نہایت عجیب بات ہے۔ اس سے پہلے سماجی بائیکاٹ کا یہی ہتھیار کئی سال پہلے مکہ میں قریش نے محمد ﷺ اور ان کے کنبے کے خلاف استعمال کیا تھا۔ اگرچہ، تب بھی یہ حربہ اتنا ہی کارگر تھا جتنا کہ اب ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن تب قریش کی یہ چال بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ بعد اس کے، جھنجھلا کر مکہ کی اشرافیہ نے محمد ﷺ پر قاتلانہ حملے کا فیصلہ کیا تھا۔ جیسے تب، ویسے ہی آج بھی یہ طریقہ ناکامی سے دوچار ہو گا۔ فاطمہ اور علی نے دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ فاطمہ کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر قریب ہے، انہوں نے وصیت میں علی کو تاکید کی کہ جس طرح خاموشی سے ان کے والد، یعنی محمد ﷺ کی تدفین عمل میں لائی گئی تھی، انہیں بھی اسی طرح گپت انداز میں، رات کے

گھپ اندھیرے میں سپرد خاک کیا جائے۔ انہوں نے زور دے کر تاکید کی کہ ابو بکر کو ان کی موت کی خبر نہ دی جائے اور کسی بھی صورت ان کے جنازے کو سرکاری اعزاز واکرام سے ادا کرنے کی اجازت نہ ملے۔ مزید یہ بھی کہ جنازے میں 'اہل بیت' یعنی محمد ﷺ کے اصل گھرانے کے افراد کے علاوہ کسی بھی شخص کی موجودگی کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کی اجازت دی جائے۔

اگر عائشہ کو فاطمہ، یعنی اپنی حریف کی موت سے کوئی تسلی ہوئی بھی تھی تو اس کا انہوں نے کوئی اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس کا تاریخ میں کوئی ریکارڈ ہے۔ غیر متوقع طور پر اس ساری قسط میں ان کی جانب سے مکمل خاموشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ظاہر ہے، اس طرح کسی کی موت پر شادیانے تو نہیں بجتے اور ویسے بھی عائشہ کو اس طرح کی کسی چیز کی اب حاجت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اس لیے کہ انہیں دوگنی عزت مل چکی تھی۔ پہلی یہ کہ وہ پیغمبر کی بیوہ تھیں اور دوسری یہ کہ وہ پیغمبر کے خلیفہ کی دختر تھیں۔ بلکہ، ایک طرح سے تو یہ تین گنا منزلت تھی۔ وہ یوں کہ ان کا رہائشی کمرہ جو مسجد کے احاطے کی دیوار سے جڑا ہوا تھا، اب پیغمبر کا مزار بن چکا تھا۔

ذرا غور کیجیے کہ آج بھی ایسے لوگ ہیں جو تخیل میں ایک ایسی جوان بیوہ کی شبیہ دیکھتے ہیں جس کے ہاتھ میں لامحدود اختیار ہے اور اس کی رہائش ایسی جگہ پر ہے جہاں بستری چبوترے کے قدمچے میں اس کے شوہر کا مزار ہے۔ اس منظر پر طلسماتی معنوں میں حقیقت کا گماں ہوتا ہے، جیسے گبرئیل مارکیز کے ناول کا کوئی سین ہو۔ لیکن یہ حقیقی دنیا ہے۔ کوئی ناول نہیں ہے۔ لوگ بھلے کچھ بھی تصور کریں لیکن ہوا یہ کہ محمد ﷺ کے بعد عائشہ کی دوبارہ کبھی اپنے رہائشی کمرے میں بسر نہیں رہی۔ محمد ﷺ کی تمام بیواؤں کو مسجد سے باہر، قدرے فاصلے پر واقع نئی تعمیر شدہ کشادہ قیام گاہوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے معقول وظیفہ بھی جاری ہوا، جس میں عائشہ کا حصہ دوسری بیواؤں سے کہیں زیادہ تھا۔ اگرچہ عائشہ اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی محمد ﷺ کے مزار، جو کبھی ان کی رہائش ہوا کرتی تھی، بسر نہیں کر سکیں گی۔ لیکن ان کا طرز زندگی باقی ماندہ عمر ایسا ہی رہا جیسے وہ واقعی وہاں بسر رکھتی ہوں۔ دوسروں سے برتر ہوں۔

جہاں عائشہ نے محمد ﷺ کی زندگی میں تمام اپنی تمام تر کوشش ان کی توجہ حاصل کرنے پر خرچ کی،

اب آپؐ کے بعد وہ صحیح معنوں میں ان کی شخصیت اور یاد کو اپنے نقطہ نظر میں ڈھال دیں گی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی بھی مرتب احادیث کا ذخیرہ ہے، ان میں عائشہ سے منسوب روایات کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔ احادیث، حدیث کی جمع ہے۔ اس سے مراد پیغمبر کے اقوال اور افعال ہیں جنہیں سنت بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کے اقوال اور افعال شامل ہیں۔ چھوٹی اور بڑی چیزیں جیسے دینی معاملات میں بڑے اصول اور چھوٹی سے چھوٹی تفاصیل شامل ہیں۔ جیسے وہ ہاتھ کیسے دھوتے تھے؟ نہایا کیسے کرتے تھے؟ اور دانتوں کے خلال کے لیے کس قسم کی لکڑی استعمال کرتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ سنی بعد ازاں خود کو اسی سنت سے جوڑ دیں گے اور اسی کو اپنی شناخت بنا لیں گے۔ حالانکہ شیعہ بھی محمد ﷺ کے انہی اقوال اور افعال کو محترم جانتے ہیں اور پیروی کرتے ہیں۔

عائشہ سے بھلے ایک بڑی تعداد میں احادیث منسوب ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ لیکن مستقبل نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب تک زندہ رہیں، مومنین کی نامی گرامی ماں کی حیثیت سے جیتی رہیں لیکن بعد کے ادوار میں تاریخ میں ایک متنازعہ شخصیت بن کر رہ جائیں گی۔ لوگ ان کے بارے افترا بازیاں کرتے پھریں گے اور ان کے بارے بد گوئی اور بہتان بازی سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ آنے والی صدیوں میں قدامت پسند علماء ان پر کڑی تنقید کیا کریں گے۔ وہ کہا کریں گے کہ دراصل عائشہ ہی اس سارے قضیے، یعنی انقسام کی وجہ تھیں۔ وہ عائشہ کی مثال دیا کریں گے کہ جب علی بالآخر خلیفہ مقرر ہو گئے تو ان کے عوامی سطح پر کردار اور اثر ورسوخ، سیاسی نا سمجھی کی وجہ سے پیدا ہونے والے فتنے سے امت کو بے انتہا نقصان پہنچا۔ وہ عائشہ کا نام لے کر سب ہی عورتوں کے عوامی سطح کے معاملات میں کردار اور اثر رسوخ کے خلاف دلیل ڈھونڈ لائیں گے۔ عائشہ کے متعلق یہ ہے کہ ان کی وہ تمام صفات، جیسے ان کی بلند نظری، بے باکی اور خود اعتمادی وغیرہ کسی بھی سیکولر دماغ کو تو خوب بھاتی ہیں لیکن وہیں ان کی یہی عادات و اطوار اسلامی قدامت پسندوں کے یہاں ان کی مخالفت کا سبب بن جائیں گی۔ صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ کئی سنی گروہ بھی عائشہ سے اس ضمن میں بھرپور اختلاف کریں گے۔

یہ تو عائشہ کے ساتھ پیش آنے والا معاملہ ہے۔ دوسری جانب فاطمہ ہیں۔ اگرچہ وہ کمزور اور ناتواں

تھیں، مندرجہ بالا شخصی صفات میں وہ کسی بھی طرح سے عائشہ کا دور دور تک مقابلہ نہیں کر سکتیں تھیں۔ وہ جوانی میں چل بسی تھیں اور انہیں تاریخ کو اپنے طریقے سے بیان کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس کے باوجود آنے والا وقت ان کا طرف دار ہو گا۔ شیعہ، فاطمہ کو 'الزہرہ' یا 'زہرہ' کے نام سے یاد کیا کریں گے، جس کے مطلب 'درخشاں' یا 'مرکز شعاع' کے ہیں۔ اپنی زندگی میں ان کی بسر پس منظر میں رہی ہو، کمزوری سے پیلاہٹ کا شکار رہی ہوں اور چہرہ ناتوانی کے سبب بے رونق ہوتا ہو، لیکن اس بات کی بعد ازاں کوئی اہمیت نہیں رہی۔ فاطمہ روحانی طور پر روشن ستارے کی طرح چمکیں گی۔ وہ پاک بازی اور تقدس میں اعلیٰ مقام کی حقدار قرار پائیں گی۔ صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ سنی بھی ان کی روحانی طاقت اور پاک بازی کے گن گائیں گے۔ کیونکہ خود فاطمہ اور پھر ان کے دو بیٹوں حسن اور حسین علیہ السلام کی رگوں میں پیغمبر کا خون دوڑتا تھا۔

شیعہ کے مشہور قصائص میں فاطمہ کا وجود تاابد زندہ رہے گا۔ وہ زمان و مکان کی ایک اور ہی سمت کی وسعتوں میں باقی ہیں جہاں وہ مرنے کے بعد بھی اپنے بیٹوں پر آنے والی تکالیف اور مصیبتوں پر نم دیدہ ہیں ۔ان کا یہ گریہ لامتناہی ہے اور مسلسل جاری رہے گا۔ وہ مقدس ماں کی طرح ہیں جن کے بڑے بیٹے کو زہر دے کر مار دیا گیا اور چھوٹے بیٹے نے اپنے سر کی قربانی دے کر انسانیت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مثال، مریم کی طرح ہے جس کے بیٹے نے بھی کسی زمانے میں سولی چڑھ کر انسانیت کا درس دیا تھا۔ مریم کی طرح فاطمہ کو بھی 'کنواری اور پاک باز' کہا جاتا ہے، مراد وہ روحانی معنوں میں پاکیزگی اور عفت کی علامت ہیں۔ مریم کی طرح فاطمہ کے بارے بھی یہی مشہور ہے کہ وہ آخر دن تک اپنی اولاد کا ماتم کریں گی اور جب حشر برپا ہو گا تو وہ ایک ہاتھ میں بڑے بیٹے حسن کا زہر آلود دل اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹے فرزند حسین علیہ السلام کا کٹا ہوا سر اٹھائے، ظاہر ہوں گی۔

علی نے فاطمہ کی آخری خواہش کا پوری طرح احترام کیا۔ فاطمہ کا جنازہ رات کی تاریکی میں، انتہائی خاموشی اور چپکے سے ادا کیا گیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی طرح فاطمہ کو بھی انتہائی رازداری کے ساتھ گھپ اندھیرے میں دفن کر دیا گیا۔ فاطمہ کی تدفین ہو چکی تو اس کے بعد علی نے شوریٰ کے اجلاس کے بعد سے

جاری کشمکش کو ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے، تسلیم سر خم کر دیا۔ انہوں نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر دی۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت علی غم سے نڈھال تھے۔ پہلے محمد ﷺ اور پھر فاطمہ کے اچانک چل بسنے سے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ اب، ان میں مخالفت اور ڈٹے رہنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ علی کو چاہتے، نہ چاہتے ہوئے بھی ابو بکر کی خلافت تسلیم کرنی ہی پڑی۔

ہوا یہ کہ محمد ﷺ کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی عرب کے طول و عرض میں بغاوت اور سرکشی پھیلنے لگی۔ جزیرہ نما خطے کے شمالی اور وسطی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کئی قبائل نے اسلام سے علیحدگی کی دھمکی دے دی یا عملی طور پر کہیے، وہ امت کے خزانے کو مزید محصولات ادا کرنے سے انکاری تھے۔ ان قبائل کا کہنا تھا کہ یہ اب دین اور ایمان نہیں بلکہ قبائلی آزادی کا معاملہ بن چکا تھا۔ پیغمبر کو محصولات کی شکل میں نذرانہ دینا ایک بات تھی بلکہ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے لیکن اب قریش کی تجوری بھرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ان کے خیال میں اب یہ ایک طرح سے تاوان تھا جو وہ خواہ مخواہ ادا کرنے پر مجبور تھے۔

جیسا کہ محمد ﷺ کی خواہش تھی، انہوں نے وعدہ بھی لیا تھا، علی نے فاطمہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ آخر تک فاطمہ کے وفاشعار رہے۔ لیکن اب ان کا کہنا تھا کہ فرض شناسی کے تقاضے بدل چکے تھے۔ امت کو نئی مشکلات کا سامنا تھا اور دین اسلام کو ان کی وفاداری کی اشد ضرورت تھی۔ یہ وقت کدورتیں پالنے کا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے سر اٹھانے والی ان بغاوتوں اور دین اسلام کو لاحق خطرات کے پیش نظر ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ امت کے مفادات کے تحفظ کا سوال تھا۔ اس وقت انقسام نہیں بلکہ اتحاد کی ضرورت تھی۔ وہ بھلے انفرادی سطح پر اختلافات رکھتے ہوں، تقسیم کا سبب بننے والی قوتوں کے سامنے وہ ابو بکر کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے۔ اگر یہ امتحان کا وقت ہے تو وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے، تصور امت کی بقا کے لیے وہ کچھ بھی کر گزریں گے۔ چاہے، اس کے لیے انہیں اپنے دعوی رہنمائی سے بھی پیچھے کیوں نہ ہٹنا پڑے۔ علی کے پیروکار، ان کے اس فیصلے کو اتم درجہ ظرف اور شرافت کی اعلیٰ مثال قرار دیتے ہیں اور بلاشبہ یہ حقیقت ہے۔ اگر وہ ایسا نہ بھی کہا کریں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ علی اصالت اور اعلیٰ ظرفی کی حامل

شخصیت کے مالک تھے۔ شیعہ اور سنی، دونوں ہی ہر طرح سے علی کے کردار اور برگزیدگی کے قائل ہیں۔ مگر ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ علی کی یہی صفت اور راست بازی ان کا سب سے بڑا بوجھ بن کر رہ جائے گی۔

آخر کار، علی نے حمایت کا اعلان کر ہی دیا اور ابو بکر اب پوری توجہ کے ساتھ سرکش قبائل سے نبٹنے کے لیے تیار تھے۔ ابو بکر نے اعلان کیا، 'جتنے محصولات محمد ﷺ کے زمانے میں ادا کیے جاتے تھے، اگر یہ اس میں سے ایک دھیلے جتنا بھی فرق لانے کی کوشش کریں تو میں آخر دم تک ان سے جنگ کروں گا'۔ انہوں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہتک آمیزانہ زبان کا استعمال کیا تھا۔ سرکش قبائل صحرائی بدو تھے جنہیں شہری حلقوں کے مطابق اونٹ چرانے کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں تھی۔ ابو بکر نے اعلان میں انہیں 'گنوار بدو' کہہ کر پکارا جو شہری علاقوں میں بسر رکھنے والے قریش کے مقابلے میں اجڈ اور پھوہڑ دہقان تھے۔ گو عربوں کی مشہور و معروف غنائی نظموں اور داستانوں میں صحرائی زندگی کے گن گائے جاتے تھے مگر وہ مالیخولیا، یعنی ماضی کی خوشگوار یاد سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ شاعری اور نثر میں، ان بدوؤں اور ان کی زندگی کی سادگی اور مادی ضرورتوں سے بے نیازی کے خوبصورت نقشے کھینچے جاتے تھے۔ جیسے، یورپ میں دیہی زندگی اور چرواہوں، امریکہ میں کاؤبوائے مشہور ہیں، ویسے ہی بدو بھی عربوں میں مثال تھے۔ لیکن اصل چرواہوں، گوالوں اور بدوؤں میں اونٹ پالنے والے خانہ بدوشوں کی زندگی ان قصے کہانیوں اور شاعری سے انتہائی مختلف اور سخت ہوا کرتی تھی۔ آج بھی عرب دنیا میں بدوؤں کے وہ قبائل جو شہری زندگی کے قائل نہیں اور دور صحراؤں میں قدیم روایات کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، شہری علاقوں میں ان کو خوب لتاڑا جاتا ہے۔ لوگ ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ انہیں کئی لحاظ سے کمتر اور گنوار سمجھا جاتا ہے۔

ابو بکر نے اعلان کیا، چونکہ ادا کیے جانے والے محصولات، امت کے خزانے کا دینی حق اور ملکیت ہیں۔ ان کی ادائیگی سے انکار، انحراف یا دین اسلام سے علیحدگی تصور کیا جائے گا۔ یعنی ایسا کرنے والا مرتد ہو گا۔ غیر مسلموں کو تو پھر بھی چھوٹ تھی لیکن کوئی ایسا شخص جو پہلے تو اسلام میں داخل ہوا اور پھر منحرف ہو گیا تو اسے کسی بھی قسم کی کوئی رعایت نہیں دی جا سکتی۔ ایسا شخص سخت ترین سزا کا مستحق قرار پائے گا اور اس کے

معاملے میں قرآنی احکامات، جن کے تحت ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کا خون حرام قرار دیا گیا تھا، لاگو نہیں ہوں گے۔ مسلمان کا خون حرام تھا، لیکن چونکہ مرتد اسلام دشمن ہوتا ہے تو اس کے خون کی حرمت بھی باقی نہیں رہتی۔ مرتد کا خون حلال ہو جاتا ہے۔ یعنی مجوزہ طور پر اسلامی قانون کے تحت اس کی کھلی اجازت ہوتی ہے۔

آگے چل کر، یہ دلیل کئی رنگ پکڑ لے گی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، اس دلیل کو سنی شیعوں کے خلاف، شیعہ سنیوں کی مخالفت میں، انتہا پسند اعتدال پسندوں کی سرکوبی، شریعت پسند علماء صوفیاء کی ضد میں بے روک وٹوک استعمال کرتے ہوئے پائے جائیں گے۔ حالیہ دور میں، کم از کم مغرب کے لیے اس کی تازہ ترین مثال اس دلیل کا وہ استعمال ہے جب آیت اللہ خمینی نے سلمان رشدی کو مرتد قرار دے کر قتل کرنے کا حکم دیا۔ یعنی جس کی آراء سے آپ کو اختلاف ہو، اسے مرتد ثابت کر کے، قتل جائز کر دیا جائے۔ جیسا کہ عربوں میں کہا جاتا ہے، 'مرتد کا خون حلال ہو جاتا ہے'۔

'ارتداد کی جنگوں' میں علیحدگی پسندوں کے ساتھ اتنی ہی سختی سے نبٹا گیا جیسا کہ ابو بکر نے اعلان میں وعدہ کیا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر، بغاوت اور سرکشی کو کچل دیا گیا اور اس کے اگلے ہی برس اسلامی افواج شمال کی جانب جزیرہ عرب سے باہر نکل کر حملے کر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابو بکر جو کہ سنیوں کے یہاں مشہور چار خلفاء راشدین میں سے پہلے خلیفہ تھے، ان کی سربراہی میں اسلام خوب پھل پھول رہا ہے اور اب بھرپور طریقے سے عرب سے باہر پھیلنے کو پر تولے جا رہے ہیں۔ اس سے اگلے برس، جب اسلامی افواج بازنطینی سلطنت کے اہم شہر دمشق کا معاصرہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں، ابو بکر کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ بستر مرگ سے جا لگے۔ انہیں تیز بخار نے آلیا تھا۔ اول المسلمین کے بعد پچاس سالوں میں ابو بکر واحد رہنماء ہیں جن کی موت کی وجوہات قدرتی تھیں۔ محمد ﷺ کے برعکس، ابو بکر کی موت کے وقت کسی کو شک و شبہ نہیں تھا کہ اگلا خلیفہ کون ہو گا۔

بعض سنی علماء بعد میں کہا کریں گے کہ ابو بکر نے محمد ﷺ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال سے بچنے کے لیے، یعنی امت میں تقسیم کے خدشات کو رد کرنے کے لیے وہی کیا جو ضروری تھا۔ کئی

دوسرے سکالروں کا خیال ہے کہ دراصل اب عرب فتوحات کا جزیرہ نما سے باہر آغاز ہو چکا تھا۔اسلامی دنیا کو اب ایک سخت جان جنگجو اور فوجی تجربے کے حامل مضبوط اعصاب کے حامل رہنما کی ضرورت تھی۔ شیعہ اس معاملے کو بالکل مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ان کے مطابق،ابو بکر بدستور علی سے عناد رکھتے تھے اور انہوں نے اب، بستر مرگ پر بھی اپنی ازلی خواہش، یعنی علی کو اقتدار و اختیار سے دور رکھنے کا پورا انتظام کیا۔ان میں سے ابو بکر کا جو بھی معاملہ رہا ہو، یہ بات طے ہے کہ ان کی وصیت صاف تھی۔ شوریٰ کا اجلاس منعقد نہیں کیا جائے گا۔ نامی گرامی مشیران اور قبائلی سرداروں کا کوئی گٹھ جوڑ، ان کے بیچ مکالمہ نہیں ہو گا۔ اگرچہ، ابو بکر کا انتخاب شوریٰ کی کاروائی کے تحت ہوا تھا لیکن آخر میں جو حال شوریٰ کا ہوا تھا، ابو بکر کے پاس اس اجلاس کو نہ بلانے کی کئی معقول وجوہات تھیں۔

اگر شوریٰ نہیں تو پھر بھلا آگے کیسے بڑھا جائے؟ اسلام سے پہلے کا دور ہوتا تو معاملہ قدرے آسان ہوتا۔ یعنی ابو بکر کا کوئی ایک بیٹا، ترجیحاً سب سے بڑا بیٹا خود بخود جانشین مقرر ہو جاتا۔ موروثی ملوکیت یا بادشاہی نظام حکومت پوری تاریخ میں اسی لیے کامیاب چلا آیا ہے کہ اس کے تحت جانشینی کا قضیہ بالکل سادہ اور آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی مشکل ہی نہیں ہوتی اور پیش روہی کا ایک سیدھا خط بن جاتا ہے۔ طویل مکالمے اور پیچیدہ مذاکرات کی کوفت بھی نہیں ہوتی۔ کوئی سیاسی ہلچل نہیں، مشکل مرحلے، ڈیڈ لاک وغیرہ سرے سے پیش ہی نہیں آتے۔ دشوار گزار عمل اور انتہائی نازک اور احتیاط کا متقاضی نظام جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں، اس کا کوئی قضیہ ہی نہیں رہتا۔ اسلام تو عقیدہ مساوات، یعنی تمام انسانوں کی برابری پر کھڑا تھا۔ جیسے کہ اس سے پہلے، شوریٰ میں ابو بکر نے مجوزہ طور پر علی کے اختیار اور اقتدار پر دعویٰ کی مخالفت میں دلیل پیش کی تھی کہ رہنمائی، رسالت کی ہی طرح موروثی نہیں ہوتی۔ چنانچہ، اب پھر دوبارہ وہی مرحلہ پیش تھا اور تقریباً انہی مشکل سوالات کا سامنا تھا جو آج بھی مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں تقریباً ہر ملک کا منہ چڑا رہے ہیں۔ یعنی، آخر اس خطے میں جمہوریت کیسے رائج کی جائے؟ آخر یہاں جمہوریت کیسے پنپے گی جب عوام اور اشرافیہ، دونوں ہی اس کو قبول کرنے سے خائف ہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم جمہوریت نافذ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور بنیادی لحاظ سے اس کا پہلے سے کوئی ڈھانچہ موجود ہی نہیں ہے؟ جمہوریت کا دروازہ، بغیر کسی چوکھٹ کے کیسے فٹ کیا جا سکتا ہے؟

بہر حال، یہ بات تو طے ہے کہ درپیش حالات میں ابو بکر نے بیچ کا راستہ اپنایا۔ یعنی وہ اپنے جانشین کی تقرری تو کریں گے لیکن یہ بلاشک وشبہ اہلیت اور ضرورت کے عین مطابق ہو گی۔ وہ کسی بھی طرح سے رشتہ داریوں، قرابت اور اشتراک خون کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ وہ اس شخص کا انتخاب کریں گے جو ان کی نظر میں آنے والے سالوں کے دوران، امت کی اجتماعی ترجیحات اور ضرورتوں کا بھرپور طریقے سے انتظام اور دفاع بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس سے قبل، تقریباً دو سال پہلے شوریٰ کے اجلاس میں اس شخص کو کے لیے نامزد ہوتا دیکھ چکے تھے۔ تب شاید وہ اس انتہائی نازک مرحلے پر شاید موزوں امیدوار نہیں تھے لیکن اب سب لوگ واضح طور پر دیکھ سکتے تھے کہ ابو بکر کن بنیادوں پر تب بھی اور آج جب سب عیاں تھا، اس شخص کی بطور خلیفہ نامزدگی چاہتے تھے۔ ابو بکر نے مرتے ہوئے عمر کو اپنا جانشین، یعنی اسلام کا دوسرا خلیفہ مقرر کر دیا۔ یہ اس وقت کے معروضی حالات کے مطابق صائب فیصلہ تھا لیکن شیعہ آج بھی مصر ہیں کہ ابو بکر کا یہ قدم نفاق اور مزید ٹکراؤ کی جانب ایک اور قدم اور منہ بولتا ثبوت ہے۔

ایک بار پھر علی کو مات ہو گئی۔ ایک بار پھر وہ نظر انداز کر دیے گئے اور اب کی بار ان کے مقابلے میں جس شخص کو ترجیح دی گئی تھی وہ ان کی بیوی کو زخمی کرنے کا ذمہ دار تھا۔ عمر نے ابو بکر کی بطور خلیفہ تقرری کے بعد علی کے گھر کو جلا کر بھسم کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ابو بکر کو عائشہ کے کمرے میں، جہاں اب محمد ﷺ کا مزار تھا، ان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ علی نے اپنے حامیوں کو صبر سے کام لینے کی تاکید کی اور امن قائم رکھنے کا سختی سے حکم دیا۔ علی نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور انہوں نے اس کے بعد اپنی زبان کی لاج رکھتے ہوئے ابو بکر کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب وہ دوبارہ، ابو بکر کے جانشین، یعنی عمر کو زبان دیں گے۔ باوجود اس کے کہ علی اور عمر کے بیچ دو سال پہلے کافی تناؤ پیدا ہو گیا تھا، وہ اس کو پس پشت ڈال کر عمر کا بھی پورا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ علی کی جانب سے اٹھائے جانے والے اقدامات اور وعدوں سے صاف ظاہر ہے کہ ان اصحاب، یعنی ابو بکر، عمر اور علی کے بیچ جاری کشمکش تب تک ختم ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اگر کسی کو محمد ﷺ کے ان قریبی اصحاب کی امت کو متحد رکھنے کی کوششوں پر ایک ذرا برابر بھی شک تھا تو علی نے ایسی تمام افواہوں اور مفروضات کو ایک نہایت عمدہ قدم سے ہمیشہ کے لیے ٹھکانے لگا دیا۔ عمر کی خلافت کی ابھی شروعات تھی۔ علی نے اپنی تمام تر وفاداریوں کا ثبوت دینے کے لیے ابو بکر کی سب سے چھوٹی بیوہ،

عاصمہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اس قدم سے اس دور کے تمام تر مفروضات اور سازشیں دم توڑ گئیں۔ آج چودہ سو سال بعد بھی، لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ تینوں اصحاب اتحاد اور یگانگت کے خواہاں تھے، ان کے بیچ اصولی اختلافات اپنی جگہ مگر وہ کسی بھی صورت اسلام کو بکھرتے ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ علی کا یہ قدم، اس کا کھلا ثبوت ہے۔

آج جدید دور میں، شاید لوگوں کو ایسا لگے کہ سابقہ مخالف کی بیوہ سے شادی کرنا، شاید انتقام کی ایک شکل ہو سکتی ہے۔ ساتویں صدی عرب میں، یہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ تب، اس طرح کے اقدامات مصالحت اور تجدید تعلقات کی علامت ہوا کرتے تھے۔ علی کا عاصمہ سے نکاح، آگے بڑھ کر صلح کی پیشکش تھی۔ اس طرح پرانی عداوتیں اور مخالفتیں بھلا کر نئے اتحاد اور ملاپ میں ڈھلا جا سکتا تھا۔ اور علی کی جانب سے، رستے ہوئے زخموں کو مندمل کرنے کی سعی ضروری تو تھی، انہوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا۔ انہوں نے اعلانیہ ابو بکر اور عاصمہ کے تین سالہ بیٹے کو باقاعدہ طور پر اپنا لے پالک بیٹا بنا لیا اور اس طرح گویا اس بچے کی سوتیلی بہن، عائشہ کی جانب خیر سگالی کا ہاتھ بڑھا دیا۔

ایک بار پھر، عائشہ جواب میں غیر متوقع طور پر خاموش رہیں۔ اگر ان کا یہ خیال تھا کہ علی نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھرانے میں نقب لگانے کی کوشش کی ہے تو تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ عاصمہ اور علی کی رفاقت کے سالہا سال میں، ان کے گھر ابو بکر کے بیٹے یعنی علی کے لے پالک فرزند نے بھرپور پرورش پائی اور جب وہ بلوغت کو پہنچ گیا تو اس کی تمام تر وفاداریاں علی کے ساتھ تھیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس لڑکے کی علی کے ساتھ گہری نسبت کا عائشہ کو خاصا دکھ تھا اور یہ لڑکا، جو مثالی طور پر ان دونوں یعنی عائشہ اور علی کے بیچ دوریوں کو مٹانے کا سبب بنتا، اس کی علی سے نسبت انہیں ایک دوسرے سے مزید دور کر دے گی۔ تاہم وقتی طور پر پھوٹ کی دڑار بھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مفاہمت کی کوششوں میں، ایک تیسرا قدم بھی اٹھایا گیا جو انتہائی غیر معمولی تھا۔ اتحاد اور وفاداری کے بے انتہا ثبوت کے طور پر علی نے خلیفہ عمر کو عزت بخشی اور اپنی بیٹی ام کلثوم، یعنی محمد ﷺ کی سب سے بڑی نواسی کا نکاح ان کے ساتھ باندھ دیا۔

ایک بار پھر، عائشہ جواب میں غیر متوقع طور پر خاموش رہیں۔ اگر ان کا یہ خیال تھا کہ علی نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھرانے میں نقب لگانے کی کوشش کی ہے تو تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ عاصمہ اور علی کی رفاقت کے سالہا سال میں، ان کے گھر ابو بکر کے بیٹے یعنی علی کے لے پالک فرزند نے بھر پور پرورش پائی اور جب وہ بلوغت کو پہنچ گیا تو اس کی تمام تر وفاداریاں علی کے ساتھ تھیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس لڑکے کی علی کے ساتھ گہری نسبت کا عائشہ کو خاصا دکھ تھا اور یہ لڑکا، جو مثالی طور پر ان دونوں یعنی عائشہ اور علی کے بیچ دوریوں کو مٹانے کا سبب بنتا، اس کی علی سے نسبت انہیں ایک دوسرے سے مزید دور کر دے گی۔ تاہم وقتی طور پر پھوٹ کی دڑار بھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مفاہمت کی کوششوں میں، ایک تیسرا قدم بھی اٹھایا گیا جو انتہائی غیر معمولی تھا۔ اتحاد اور وفاداری کے بے انتہا ثبوت کے طور پر علی نے خلیفہ عمر کو عزت بخشی اور اپنی بیٹی ام کلثوم، یعنی محمد ﷺ کی سب سے بڑی نواسی کا نکاح ان کے ساتھ باندھ دیا۔

عمر کا پیغمبر سے رشتہ اور نسبت اب دوگنا ہو چکا تھا۔ وہ اس سے پہلے آپؐ کے سسر تھے لیکن اب ان کی نواسی سے نکاح کے بعد، ان کے دوہرا داماد بھی تھے۔ اب وہ خلافت کے منصب پر پاؤں جما چکے تھے۔ اس سب کے باوجود علی ممکنہ طور پر انتہائی طاقتور، خلیفہ کی ٹکر، مضبوط حریف ثابت ہو سکتے تھے۔ مگر عمر نے حکمت سے کام لیتے ہوئے قدیم سیاسی مقولے پر عمل کیا۔ یعنی دوستوں کو قریب اور دشمنوں کو قریب تر رکھو۔ اب ان دونوں کے بیچ سسر اور داماد کا رشتہ بھی تھا جو انہیں جوڑ کر رکھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں اصحاب رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ اکثر جب عمر مدینہ سے باہر، کسی فوجی یا سفارتی مہم پر نکلتے تو اپنے پیچھے علی کو اپنا ڈپٹی مقرر کر کے جایا کرتے۔ یہ صاف اشارہ تھا۔ لوگ واضح طور پر دیکھ سکتے تھے کہ وقت آنے پر، علی ہی عمر کے خلیفہ ہوا کریں گے۔ کئی لوگ اس کا برملا اظہار بھی کرتے اور یوں خلیفہ کے ساتھ ساتھ، علی کی بھی دھاک بیٹھتی چلی گئی۔

عرب فتوحات کا اب صحیح معنوں میں آغاز ہوا۔ عمر نے ابو بکر سے محمد ﷺ کے خلیفہ کا حق پایا تھا۔ اب وہ ایک نئے خطاب کے ساتھ مشہور ہو جائیں گے۔ یہ خطاب، 'امیر المومنین' کا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں امیر،

یعنی سپہ سالار تھے۔ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ سختی اور کڑا وقت جھیلتے، صحرا میں گرم ریت پر اپنے چوغہ بچھا کر سو رہتے۔ بجائے افواج کو لڑائی میں آگے بڑھنے کا حکم دیتے، خود ہی سب سے پہلے آگے بڑھتے اور پوری فوج دھاڑتی ہوئی ان کی پیروی میں خون خوار انداز میں دشمن پر جھپٹ پڑتی۔ یوں، مومنین اور بالخصوص افواج اسلامی میں ان کی عزت و منزلت اور وفاداری کا کوئی حساب نہیں رہا۔ اگرچہ عمر نہایت سخت مزاج شخص تھے۔ وہ انتہائی سخت گیر اور نظم و ضبط کے قائل تھے۔ لیکن توازن برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے انصاف کی ضرورت پر زور دیا۔ جلد ہی وہ انتہائی معتبر منصف بھی مشہور ہو گئے۔ اسلام اور امت سے اپنی وابستگی اور بطور خلیفہ اپنی حیثیت کے تقاضے میں وہ ہر طرح سے اقربا پروری کی حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ اصولوں اور قوانین پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا، دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان پر تو انتہائی کڑی نظر رکھتے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ان کا فرزند شراب پی کر بازار میں چلا آیا اور مبینہ طور پر غل غپاڑہ کیا۔ عمر نے کوئی لحاظ نہ کیا۔ اس نوجوان کو اسی کوڑے مارنے کی سزا سنائی۔ عمر کا بیٹا کوڑے لگانے کی وجہ سے زخمی ہو گیا۔ ابھی سزا پوری نہیں ہوئی تھی کہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ عمر نے اس کا ماتم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنی حرکات کے سبب اس انجام کو پہنچا تھا۔

عمر کی حکمرانی کے دس سالوں میں، مسلمانوں نے شام اور عراق فتح کر کے انتظام سنبھال لیا۔ یہ اس قدر تیزی سے ہونے والی فتوحات تھیں کہ اس دور میں قرب و جوار کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ عربوں نے اتنی سرعت سے کامیابیاں حاصل کیں کہ آج ان فتوحات کو 'قبائلی قبضے کی جبلت' نامی مغالطہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہاوت ماہرین بشریات کے لیے اجنبی ہے۔ اس کی تہہ میں یہ تصور بھرا ہے کہ شاید خون کے پیاسے جاہل اور گنوار قبائلی، قدیم و حشیانہ جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر راستے میں آنے والی ہر تہذیب اور تمدن کو تہہ بالا کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شائستہ اور استدلالی معاشروں کی ترتیب کو خطرے میں ڈال کر تہذیبوں کو تہلہ ترغا کر دیتے ہیں۔ یہ تصور، آج مشرق وسطیٰ کے حالات کو دیکھ کر کئی لوگوں کے ذہنوں میں خود بخود ہی ناچنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، شاید عربوں کی ہمیشہ سے ہی یہ روش رہی ہے۔ شاید، یہ اوائل دور سے ہی ایسے چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی ان فتوحات میں خون خرابے کا اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ مال غنیمت یا وسائل پر اختیار، اس وقت بھی بڑا محرک تھا۔ اسلامی افواج اگرچہ تعداد میں بہت کم تھیں لیکن انہوں نے فارس اور بازنطین کی سلطنتوں پر انتہائی غیر معمولی فتوحات حاصل کیں۔ لیکن یاد رہے، ان فتوحات زیادہ تر تلوار کی بجائے الہامی پیغام کی بنیاد پر ممکن ہوئیں۔ یہ افواج جہاں پڑاؤ ڈالتیں، تلوار کو ایک طرف رکھ کر مقامی آبادی اور انتظامیہ کو عرب یعنی اسلامی دستور اور راج قبول کرنے کا موقع دیا جاتا۔ عام طور پر لوگ عرب بہ معنی اسلام کی حکمرانی قبول کر لیتے۔ ویسے بھی، عرب اس خطے میں نووارد نہیں تھے۔ لوگوں نے جزیرہ نما عرب میں اسلامی تحریک کے پھیلاؤ کے قصے سن رکھے تھے، بلکہ اچھی طرح واقف تھے۔

محمد ﷺ کے الہامی پیغام سے قبل بھی مکہ کی اشرافیہ مصر میں املاک، دمشق میں محلات، فلسطین میں زرعی اراضیوں اور عراق میں کھجور کے وسیع باغات کی مالک تھی۔ وہ جن علاقوں میں تجارت کرتے، وہاں بالضرور ہی اپنی جڑیں گہری رکھا کرتے تھے۔ ساتویں صدی عرب میں، ایک تاجر کے لیے تجارت کے ساتھ ساتھ جہاں تجارت ہوتی، عارضی یا اکثر مستقل مسکن قائم رکھنا انتہائی ضروری تھا۔ تب، تجار صرف تجار نہیں تھے بلکہ سیاح اور سفارت کار بھی ہوا کرتے تھے۔ سال میں دو دفعہ مکہ کے تجارتی قافلے دمشق پہنچتے تھے اور ہر قافلے میں کم از کم چار ہزار اونٹ تو ضرور ہی ہوا کرتے۔ پھر، جب یہ قافلے اس عظیم الشان نخلستان نما شہر میں پہنچتے تو ایسا نہیں تھا کہ فوراً ہی واپس چلے آتے۔ مکہ کے تجار یہاں مہینوں بسر رکھتے اور اس دوران وہ مقامی آبادی اور حکام کے ساتھ میل جول بڑھاتے، نئے تعلقات بنتے، لین دین ہوتا، ایک دوسرے کی آؤ بھگت کی جاتی اور یوں دوطرفہ تعلقات گہرے ہوتے جاتے۔ عرب تجار زمانہ قدیم سے اس خطے کے چپے چپے میں پھیلتے چلے آ رہے تھے اور انہیں سب کی خبر تھی۔ وہ علاقے جو وہ ابھی پے در پے فتح کرتے چلے جا رہے تھے، وہ یہاں کی زندگی کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں یہاں کی مقامی آبادیوں کو اپنے ساتھ ملانے اور کسی بھی جگہ پر مقامی انتظامیہ کو گھیرنے میں ذرہ برابر مشکل پیش نہیں آئی۔

یہی نہیں، وقت بھی عربوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ جزیرہ عرب میں جب اسلام کا بول بالا ہو چکا تو یہ وہ

دور تھا جب مشرق وسطیٰ کے سیاسی منظر نامے پر ایک بڑا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ ایک عرصے سے مشرق وسطیٰ پر دو سلطنتوں کا دور دورہ چلا آرہا تھا۔ مغرب میں باز نطینی اور مشرق میں فارس کی سلطنتیں تھیں۔ یہ دونوں ہی لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ بھڑتے بھڑتے، اب خاصی کمزور ہو چکی تھیں۔ فارس کی تو یہ حالت تھی کہ وہ اب عراق میں دجلہ اور فرات کے دریاؤں سے سیراب ہونے والے وسیع و عریض خطے کا انتظام صحیح طرح چلانے سے قاصر تھے۔ باز نطینیوں کا گرچہ دمشق اور یروشلم جیسے شہروں پر قبضہ تھا مگر اندرونی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ وہ بمشکل ہی یہاں ٹک پا رہے تھے۔ دونوں سلطنتیں اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں اور جہاں ایک طرف جزیرہ عرب میں اسلامی ریاست جان پکڑ رہی تھی، یہ دونوں بڑی بادشاہتیں آخری سانس لے رہی تھیں۔ چنانچہ، یہ وقت کی جانب سے اسلامی ریاست کو کھلی دعوت تھی کہ وہ آگے بڑھیں اور دونوں سلطنتوں کو اکھاڑ کر انتظام سنبھال لیں۔

فتوحات اور بے پایاں اختیار قائم ہونے کے باوجود اسلام کے جبراً نفاذ کی ممانعت تھی۔ عمر نے نہایت سختی سے کسی بھی شخص کا عقیدہ تبدیل کرنے یا اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے سے پابندی لگادی تھی اور ہمیشہ اس روش کی حوصلہ شکنی کی۔ وہ اسلام کو اس کی خالص صورت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یعنی یہ کہ لوگ اپنی مرضی سے اس میں شامل ہوں اور ترجیحاً اسلام صرف عربوں کے یہاں، پوری نفاست کے ساتھ ،اصل حالت میں باقی رہے۔ عمر کا یہی رویہ تھا جس کے سبب فارسیوں میں وہ کبھی مقبول نہیں ہو سکے۔ فارس کے لوگ عربوں کی یوں اسلام پر اجارہ داری کے سخت خلاف تھے اور یہی وجہ ہے کہ عمر کے انتقال کے بعد فارسی علاقوں میں ایک بڑی تعداد دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئی۔ عمر نے فارس میں خلیفہ کی مقبولیت کے گراف کو مد نظر رکھتے ہوئے، دو نئی چھاؤنیاں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ دو چھاؤنی نما شہر بصرہ اور کوفہ تھے۔ بصرہ فارس کے جنوب اور کوفہ وسط میں واقع تھا۔ نئی چھاؤنیوں کی تعمیر کا مقصد اسلامی ریاست کے انتظام کاروں کو تحفظ فراہم کرنا اور فارسیوں کے یہاں زور پکڑتے انحطاط اور ممکنہ طور پر کسی بغاوت سے نبٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا تھا۔

جزیرہ عرب سے باہر لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کی حوصلہ شکنی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ عمر

نے اپنے دور اقتدار میں ایک نظام متعارف کرایا تھا۔ اسے 'دیوان' کہا جاتا تھا۔ اس نظام کے تحت، امت کی اکائی ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ یہ ویسا ہی نظام تھا جیسا کہ آج خلیج عرب کی ریاست دبئی میں رائج ہے، جس کے تحت یہاں کے مستقل عرب شہریوں کو حکومت کی طرف سے تیل اور دوسری آمدنوں میں سے برابر حصہ دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت چونکہ تمام کمائی برابر تقسیم ہوتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کی تعداد جتنی کم ہوتی، ان کا وظیفہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا۔ یہ وظیفے، ان محصولات سے نکالے جاتے تھے جو غیر مسلم جزیہ کی صورت ادا کرتے تھے۔ چونکہ مقامی آبادیاں مسلمانوں سے پہلے بازنطینیوں اور فارسیوں کو بھی یوں ہی ٹیکس ادا کیا کرتے تھے، اس سے ان کی زندگیوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تو جزیرہ عرب سے باہر کے خطے میں دبے الفاظ میں خلافت اور خلیفہ کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ ریاست کو کئی جگہوں پر چھوٹی موٹی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ہم آج بھی دنیا میں جابجا دیکھتے ہیں کہ جب ایک راج کا خاتمہ ہوتا ہے تو دوسرے کا جھنڈا فوراً بلند ہو جاتا ہے۔ ایک حکمران کی تصویریں اور مجسمے تاراج ہوتے ہیں تو فوراً ہی دوسرا حاکم سر پر آن بیٹھتا ہے۔ جزیرہ عرب سے باہر، تقریباً تمام علاقوں نے عربوں کی حکومت اور اختیار قبول کر لیا تھا لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو کسی طور اس طرز حکومت سے متفق نہیں تھے۔

مدینہ کے اکثر لوگوں نے روایت کر رکھا ہے کہ عمر کا قتل غیر متوقع تھا۔ یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ فارس سے تعلق رکھنے والا ایک مجوسی غلام بیٹھے بٹھائے اپنا دماغ کھو دے اور اس قدر گھناؤنی حرکت کر بیٹھے؟ بلکہ، وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟ ایک غلام؟ وہ مسجد میں، نماز کے دوران جب خلیفہ وقت رکوع کی حالت میں تھے، پشت سے خنجر کے چھ وار کرتا ہے اور پھر وہی خنجر اپنے سینے میں گھونپ لیتا ہے؟ یہ انتہائی حیران کن اور نا قابل فہم بات تھی۔

یہ سازش بھی ہو سکتی ہے۔ بجائے یہ کہ خلافت اور خلیفہ کے دشمنان حکومت الٹنے کے لیے بنا ٹھنا طریقہ، سوچا سمجھا پلان بناتے، انہوں نے شاید ایک تن تنہا پیادے کا استعمال کرتے ہوئے، نئی اسلامی سلطنت اور خلافت کو الٹنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے آج اکیسویں صدی میں، ویسے ہی تب ساتویں صدی میں لوگ نا معقول اور بظاہر استدلال سے خالی باتوں پر مایوس ہو جایا کرتے تھے۔ سازشی نظریات تب بھی

ویسے ہی کاری ہوا کرتے تھے جیسے آج ہیں۔اس معاملے میں کہیے تو شاید لوگ اس کی معقول وجہ تلاشتے، سچ جاننے یا شاید ممکنہ طور پر سچ گھڑنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

اس بابت ایک کہانی یہ تھی کہ فارسی غلام کے مالک نے اس کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وقت آنے پر زبان سے پھر گیا۔اس غلام نے عمر کے یہاں انصاف فراہم کرنے کی عرضی ڈالی تھی جو ٹھکرا دی گئی۔ چنانچہ یہ شخص خلیفہ سے بیر کھاتا تھا اور اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ سو موقع ملتے ہی حملہ کر دیا۔ یہ کہانی سادہ مگر معنی خیز تھی۔ بعد میں اس کہانی میں کئی مزید کڑیاں بھی ملائی گئیں جن کے تحت فارس کے مجوسی طبقات کا قتل میں ہاتھ تھا۔ مدینہ کے لوگوں نے بخوشی واقعات کے یوں ہی قبول بھی کر لیا۔ عمر زخموں سے بے حال، مرنے کے قریب تھے۔اگرچہ لوگوں کے سامنے بارہ سال کے عرصے میں یہ تیسرا رہنما دم توڑ رہا تھا مگر اس کے باوجود عوامی سطح پر لوگوں میں بے چینی نہیں تھی۔ وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ قاتل، ان میں سے ایک نہیں ہے۔ حملہ آور عرب نہیں بلکہ فارس سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک مسلمان نہیں، مجوسی تھا۔ اگرچہ قاتلانہ حملہ انتہائی گھناؤنی حرکت تھی، خلیفہ اپنی جان سے جا رہے تھے لیکن بہر حال یہ ایک خارجی کی حرکت تھی۔ یہ پاگل پن تھا جس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ مسلمان کبھی دوسرے مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ حرام ہے۔ بدستور حرام ہے بلکہ اس کا تصور بھی حرام ہے۔

ایک بار پھر، ایک مرتے ہوئے خلیفہ کے سامنے اپنا جانشین مقرر کرنے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔اور ایک بار پھر، طریقہ کار وضع نہ ہونے کی وجہ سے اس مرحلے کا اب کی بار تجویز کردہ حل بھی متنازعہ قرار پائے گا۔ آنے والی کئی صدیوں تک اس حل پر کبھی نہ ختم ہونے والی بحث جاری رہے گی۔ انتقال سے چند گھنٹے قبل، عمر نے شوریٰ کے کھلے عام متفقہ فیصلے اور خلیفہ کی تقرری کے اپنے انفرادی اختیار کے بیچ کا راستہ اپنایا۔ جیسا کہ پہلے سے لوگوں کو توقع تھی، انہوں نے علی نام جانشینی کے لیے پیش کر دیا، لیکن غیر متوقع طور پر انہوں نے علی کے ساتھ پانچ دوسرے لوگوں کے نام بھی اس معاملے میں سامنے لا رکھے۔ یوں، انہوں نے ایک نہیں بلکہ چھ لوگوں کے نام خلیفہ کے لیے دے دیے۔ ان میں سے کسی ایک شخص کے انتخاب کا طریقہ یہ تھا کہ یہ چھ لوگ بیک وقت خلافت کے امیدوار اور رائے دہندہ ہوں گے۔ ان میں سے

صرف ایک شخص عمر کا جانشین ہو گا لیکن وہ کون ہو گا۔۔۔اس کا فیصلہ ان چھ پر چھوڑ دیا گیا۔ مزید تفصیلات یہ تھیں کہ یہ چھ لوگ عمر کی موت کے بعد ایک بند کمرے میں جمع ہوں گے اور تین دن کے اندر نئے خلیفہ کا فیصلہ کریں گے۔

کیا عمر کا خیال یہ تھا کہ جیسے لوگوں کو عرصے سے توقع تھی، باقی پانچ بھی علی کو خلیفہ مقرر کر دیں گے؟ یقیناً یہی بات تھی لیکن امیدواروں میں سے دو عائشہ کے بہنوئی تھے۔ زبیر جو عائشہ کے چچازاد تھے اور دوسرے طلحہ تھے جنہوں نے کسی زمانے میں محمد ﷺ کے بعد عائشہ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن انہیں فوراً ہی ابو بکر کی دوسری بیٹی سے بیاہ دیا گیا تھا۔ تیسرے آدمی عثمان تھے جن کا تعلق بنو امیہ سے تھا اور امیر کبیر تھے۔ محمد ﷺ کے انتقال کے بعد ابو بکر نے شوریٰ کے سامنے عثمان کی بطور خلیفہ نامزدگی کی تھی۔ انتہائی مشکل تھا کہ یہ تین لوگ علی کی بطور خلیفہ تقرری پر راضی ہو جاتے۔

عمر کو محمد ﷺ اور ابو بکر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس کمرے میں یہ کھدنے والی آخری قبر تھی۔ جیسے ہی تدفین مکمل ہوئی، یہ چھ امیدوار اور رائے دہندگان مسجد کے اندر ہی ایک کمرے میں جمع ہو گئے اور دروازے مقفل کر دیے گئے۔ عمر نے انہیں عجب مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ان میں اتفاق رائے انتہائی ضروری تھا کیونکہ بہت کچھ داؤ پر لگا تھا۔ یہ عمر کی آخری مگر نہایت عمدہ حکمت عملی تھی۔ چھ لوگ جو اسلامی ریاست میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے، ان کے آپس میں جو بھی معاملات رہے ہوں یا ہوں، وہ ایک مقفل کمرے میں بند تھے۔ جب تک ان میں اتفاق قائم نہیں ہو جاتا، وہ یہاں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان چھ اشخاص کے لیے انتہائی ضروری تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں لیکن تعاون ہی ایسی چیز تھی جس کے لیے وہ ابھی پوری طرح تیار نہیں تھے۔ مطلب، عمر پر قاتلانہ حملہ ناگہانی لگتا تھا اور امت نے اس مرحلے کی سرے سے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ ان چھ میں سے ہر شخص رہنمائی کا خواہاں تھا لیکن ان چھ پر لازم تھا کہ وہ آپس میں طے کر لیں کہ کون سا شخص ہو گا جو بالآخر رہنمائی کا حقدار قرار پائے گا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس عہدے کا شدید خواہش مند ہے مگر کوئی ایک بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

تیسری صبح کا سورج طلوع ہوا تو طویل بحث اور مباحثے کے بعد وہ چھ میں سے دو امیدواروں پر متفق ہو چکے تھے۔ یہ دو، محمد ﷺ کے داماد یعنی علی اور عثمان تھے۔ اس کمرے سے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر جمع تھا اور سبھی کو توقع تھی کہ بالآخر ان دونوں میں سے خلیفہ کون ہو گا؟ عوام کو یہ توقع ایک عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ ایک طرف علی تھے جو اب چالیس کے پیٹے میں تھے۔ وہ جانے مانے فلاسفر اور جنگجو تھے۔ پہلا شخص جس نے اسلام قبول کیا اور اس نے پہلے محمد ﷺ کی نیابت اور پھر خلیفہ عمر کے نائب کی حیثیت سے کردار ادا کر رکھا تھا۔ دوسری جانب عثمان تھے۔ نیکوکار اور پرہیزگار تھے۔ دولت مند شخص تھے اور ان کی سخاوت کا چرچا تھا۔ اگرچہ وہ بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن مکہ کی اشرافیہ میں پہلے شخص تھے، جس نے اپنے کنبے کی بھرپور مخالفت کے باوجود تحریک کے اوائل دنوں میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ عثمان نے اپنی زندگی میں کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور ستر سال کی عمر میں اس دور کے حساب سے اچھی خاصی عمر گزار چکے تھے۔ ایک زمانہ دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑھاپے میں تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ وہ عمر رسیدگی کے باعث زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہیں گے۔ یہی نکتہ تھا، جس کا بالآخر عثمان کو فائدہ پہنچا۔

اگر یہ مختصر شوریٰ علی کی بجائے عثمان کی حمایت کرتی ہے تو جلد ہی وہ وقت آئے گا کہ انہیں رہنمائی حاصل کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ یہ عثمان کو خانہ پری کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے، عارضی انتظام سمجھ رہے تھے۔ خیال یہ تھا کہ جلد ہی جب عثمان ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے سبب دنیا سے کوچ کر جائیں گے، تب تک ان میں سے ایک یا دوسرا عوامی حمایت حاصل کر لے گا، جو بالآخر اس کی بطور خلیفہ تقرری کا سامان بن جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ خواہش بر آنے میں عارضی تعطل تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال کی بات تھی، پھر قصہ یہیں آ کر ٹک جاتا۔ گٹھ جوڑ کر کے حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ وقت کافی تھا۔ علی صاف دیکھ رہے تھے کہ کمرے میں کس طرح کا ماحول بنتا جا رہا تھا۔ وہ دوسروں کے ذہنوں کو صاف پڑھ رہے تھے لیکن وہ اس روش کو روکنے سے قاصر تھے۔ جب تیسرے دن کا سورج غروب ہوا تو کمرے میں باقی سب ایک طرف تھے اور علی سے ان کا حتمی فیصلہ، فوری طور پر مانگ رہے تھے تا کہ وہ شرط کے مطابق تیسرے دن کے ڈھلنے پر باہر نکل کر مسجد میں عوام کے سامنے اعلان کر سکیں۔ علی جان چکے تھے کہ 'خاک اور خار کے سال' ابھی ٹلے نہیں تھے۔ باقی پانچ ایک طرف ہو گئے تو ان کے پاس سوائے اس کے کوئی

چارہ نہ رہا کہ وہ ایک بار پھر آگے بڑھ کر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

علی کے لیے یہ کس قدر ترش فیصلہ ہو گا کہ ایک بار پھر رہنمائی سے محروم کر دیے گئے تھے؟ آخر، وہ کب تک صبر کرتے؟ امت کے اتحاد اور یگانگت کے نام پر کب تک وہ شرافت اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے؟ اپنی سمجھ اور بصیرت کے مطابق، وہ یقیناً اندر ہی اندر اپنے حق اختیار کو ایک بار خود سے دور ہوتے دیکھ کر بجھ گئے ہوں گے۔ لیکن، اگر وہ حسد سے جلنے لگتے اور اندر ہی اندر گھل جاتے۔ پھٹ پڑتے یا بغاوت پر اتر آتے تو ظاہر ہے، علی وہ شخص نہ ہوتے جیسا کہ ہم انہیں جانتے ہیں۔ علی تو اپنی اعلیٰ ظرفی، شائستگی اور راست بازی کے لیے مشہور تھے۔ ایک ایسا شخص جو اتنا معزز اور عالی مرتبت تھا کہ اس کے سامنے سیاسی چالیں بے معنی تھیں، اسے ان کی شاید سمجھ تو تھی لیکن یہی چالیں چلنا، ان کے شایان شان نہیں تھا۔

یا شاید، کیا خبر۔۔۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو کیا وہ بھی دوسروں کی طرح یہی سوچ رہے تھے کہ عثمان تا دیر زندہ رہنے والے نہیں تھے۔

باب 7

اگر عثمان کا تعلق اشرافیہ سے نہ ہوتا تو عین ممکن ہے، امت اتنی خوں ریزی اور صدیوں سے جاری قتل و غارت سے بچ جاتی۔ یہاں تک کہ خود عثمان کی اپنی جان بھی نہ جاتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ عثمان چونکہ ہر لحاظ سے بھرے پرے تھے۔ خون، خاندان اور خوسب کچھ تو تھا۔ اچھی خوراک، فضا اور صحت بھی تھی تو لمبی عمر پائی۔ سوال یہ ہے کہ ان کی قسمت میں لکھی ہوئی یہ طویل شاہانہ زندگی، کیا واقعی نعمت تھی؟ لوگ آج بھی اس پر خوب بحث کرتے ہیں۔ ہوا یہ کہ غیر متوقع طور پر عثمان نے طویل عمر پائی اور خلافت سنبھالنے کے بعد بھی، جیسا کہ مختصر شوریٰ کے لوگوں کا خیال تھا، یہ صرف سال دو کی بات نہیں رہی۔ وہ مزید بارہ برس تک جیے۔ اور پھر جب بیاسی سال کی عمر میں ان کی موت واقع ہوئی تو تب بھی، مرنے کی وجہ قدرتی نہیں تھی۔ ان سے پہلے عمر بھی قاتلانہ حملے میں موت کا شکار ہوئے تھے، اب تیسرے خلیفہ عثمان بھی قتل کر دیے جائیں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب کی بار قاتل مسلمان تھا اور کئی لوگوں کا خیال ہے کہ بھلے وہ مسلمان ہو، چاہے کسی مسلمان کے خون کی حرمت پامال کر دی گئی ہو، یہ گھناؤنا فعل رہا ہو، قاتلوں کے پاس بہر حال اس انتہائی قدم کی معقول وجہ تھی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، عثمان کا تعلق قریش مکہ کے نامی گرامی کنبے بنو امیہ سے تھا۔ وہ ہمیشہ سے امیرانہ طرز زندگی کے عادی تھے اور جیسا کہ اشرافیہ کا طریق ہوتا ہے، وہ بھی رہن سہن کے اس طریقے کو اپنا حق، استحقاق سمجھتے تھے۔ وہ مردانہ وجاہت اور چہرے کے خوبصورت خدوخال کے لیے مشہور تھے۔ چونکہ امراء کے طبقے سے تعلق تھا تو لازمی، شاہانہ آداب اور طمطراق کے سبب، خوش لباس واقع ہوئے تھے۔ اسی سبب، عام لوگوں میں ان کے حسن اخلاق، نفاست اور طبیعت میں سخاوت کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اگرچہ ان کے چہرے پر چیچک کے ہلکے داغ تھے لیکن اس کے باوجود کئی لوگوں نے روایت میں ان کی 'سنہری جلد' اور 'سرخ و سپید رنگت' کا ذکر کیا ہے۔ کئی روایات میں کہا گیا ہے کہ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ سجی رہتی تھی۔ جب کھلکھلا کر ہنستے تو چمکتے ہوئے دانت واضح ہو جاتے۔ چمک کاری کی وجہ دانتوں کی سفیدی نہیں بلکہ سونے کی وہ تار تھی جو وہ ہمیشہ دانتوں پر زیبائش کی غرض سے پہنے رکھتے تھے۔ لیکن بات یہ ہے کہ نفاست،

زیبائش کا شوق، امیرانہ روش اور سونے اور جواہرات سے عثمان کا یہی لگاؤ آگے چل کر پیش آنے والے دل خراش واقعات کا سبب بن جائے گا۔

عثمان کے پیش رو، عمر کو بہت پہلے ہی اس بات کا ادراک ہو گیا تھا۔ فتح کے بعد جب فارس کے شاہی دربار سے ہیرے، جواہرات اور دوسرا قیمتی سامان مدینہ پہنچا تو انہوں نے خوشی اور اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ غیر متوقع طور پر، وہ سونے کے اونچے ڈھیر کو دیکھ کر رنجیدہ ہو گئے تھے۔ بیش قیمت زیور اور جواہرات، تلواریں جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے اور ریشم کے انتہائی مہنگے بنڈل۔۔۔ یہ سب دیکھ کر عمر زار و قطار رونے لگے۔ 'میں روتا ہوں'، وہاں جمع لوگوں کے ہجوم کو مخاطب کر کے کہا، 'دھن دولت اور امارت سے ما سوائے نفرت، عداوت اور کڑواہٹ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا'۔

عثمان کے دور خلافت میں بھی اسلامی سلطنت میں مزید کئی فتوحات ہوئیں۔ سرحدیں پھیل کر مغرب میں مصر، مشرق میں فارس کے آخری کونے اور شمال میں بحیرہ قزوین تک پہنچ چکی تھیں۔ جتنی تیزی سے سلطنت پھولی، اتنی ہی سرعت کے ساتھ مدینہ میں امت کا خزانہ بھی بھرنے لگا، بے پناہ وسائل جمع ہو چکے تھے اور سمجھ میں نہ آتا کہ آخر اس مال و دولت کو کہاں خرچ کیا جائے؟ نتیجہ وہی نکلا جس کا عمر کو ڈر تھا۔ محمد ﷺ نے ایک طویل جد وجہد کے بعد مکہ کا اقتدار و اختیار قبیلہ قریش میں عثمان کے کنبے بنوامیہ سے حاصل کیا تھا۔ اگرچہ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے قریش اور بنوامیہ کے کئی نامی گرامی افراد کو اختیارات سونپے تھے، مگر اب بہر حال پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ اب تک یہ حکام خلافت، بالخصوص مدینہ کو جوابدہ چلے آ رہے تھے۔ اب بنوامیہ سے ہی تعلق رکھنے والے عثمان نے دوبارہ سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی، بنوامیہ کے لوگوں نے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے وہی پرانی روش، یعنی اشرافیہ کی طرز حکومت والی عادات اپنا لیں۔ یہ امراء اختیار ہاتھ آتے ہی ایک بار پھر سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگے۔ وہ دوبارہ سے امور ریاست میں دخل اندازی کرنے لگے، جدی پشتی خاندانی امتیاز اور تکبر عام ہو گیا۔ عثمان کا حال یہ تھا کہ وہ انہیں روکنے سے قاصر تھے یا شاید وہ انہیں روکنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

دین اسلام سے عثمان کی وفاداری پر کسی کو شک نہیں تھا لیکن وہیں یہ بات بھی صاف ہے کہ وہ اپنے

خاندان اور کنبے کے بھی خیر خواہ تھے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خاندان کی بھرپور مخالفت کے باوجود اسلام قبول کیا تھا۔ اوائل دور اسلام میں جب تحریک کا مستقبل بھی خاصا مخدوش لگتا تھا، وہ سب کچھ چھوڑ کر محمد ﷺ کے ساتھ مدینہ چلے آئے تھے۔ اپنے خاندان کو وداع کہہ دیا تھا لیکن اس کا قطعی یہ مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے کنبے سے دور ہو گئے تھے۔ عرب معاشرے میں خاندان، کنبہ یا قبیلہ اکائی کی حیثیت رکھتا تھا، انفرادی شناخت کا سرے سے کوئی تصور نہیں تھا۔ بہرحال، ہوا یہ کہ پھیلتی ہوئی سلطنت میں اہم فوجی عہدے دار، گورنر اور اعلیٰ حکام۔۔۔ تقریباً سب ہی عہدے بنو امیہ کے لوگوں میں بٹ گئے۔ اہل لوگوں کو نظر انداز کر کے اقربا، یعنی دوستوں اور رشتہ داروں کو آگے لایا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر ایسے معاملات میں ہوا کرتا ہے، اقربا پروری کے نتیجے یا کہیے اس چور دروازے سے حکومت، بالخصوص اہم عہدوں تک پہنچنے والے افراد خود کو ہر شے سے مبرا سمجھتے ہیں اور جلد ہی بدعنوانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس دور کے تقریباً سب ہی عہدے داروں نے، جو سفارش اور نور نظری کی بنیاد پر ترقی حاصل کیے ہوئے تھے، بلاشک وشبہ بے انتہا درجہ کے بدعنوان کہلائے جا سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں اس دور کی لاتعداد مثالیں درج ہیں۔ ایک مثال کچھ یوں ہے کہ محمد ﷺ کے ایک انتہائی قریبی ساتھی جو ابو بکر اور عمر کے دور سے اور اب عثمان کی اسلامی فوج میں سپہ سالار چلے آ رہے تھے، امت کے خیر خواہ تھے، بالآخر پھٹ پڑے۔ ہوا یہ کہ وہ بھرپور محنت کرتے، جہاں ان کی عمل داری تھی وہاں امن اور خوشحالی لاتے، ٹیکس جمع کرتے مگر اس کا صلہ تو ان کو ملتا جنہیں خلیفہ کی جانب سے حکومت اور انتظام کے لیے مقرر کیا گیا تھا بلکہ ساتھ ہی یہ کہ ذرا ان کا دھیان بٹتا، بدعنوانی شروع ہو جاتی۔ ان کے زیر اطاعت حکام لوٹ کھسوٹ کرنے لگتے۔ جلد ہی ان کا اثر رسوخ بھی بڑھنے لگا اور عمل دار کا اختیار محدود ہو کر کسی قابل نہ رہا۔ وہ عثمان کے سامنے پھٹ پڑے، 'دوسرے لوگ تو گائے کا دودھ نکال کر لے جائیں اور میرا کام صرف یہی ہے کہ میں ان کے لیے گائے کو سینگوں سے پکڑ کر قابو کیے رکھوں؟'

ابو بکر اور عمر کے دور میں محمد ﷺ کی روایت، یعنی سادگی اور عقیدہ مساوات انسانی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اب حال یہ ہو چکا تھا کہ شاہانہ طرز زندگی اور طمطراق عام تھا۔ لوگ نمایاں طور پر ٹھسے سے شاہی زندگی بسر کرنے لگے اور ایک دوسرے سے برتر نظر آنے کا سامان کرنے لگے۔ خود عثمان نے اپنے لیے

مدینہ میں ایک نہایت شاندار محل تعمیر کروایا جس کے گرد باغات تھے۔ اس محل کے مینار سنگ مرمر سے تعمیر کیے گئے اور اندر خوب آرائش کی گئی۔ خطے کے کونے کونے سے لائے گئے کئی باورچی تھے جو طرح طرح کے کھانے پکایا کرتے۔ ابو بکر اور عمر نے جہاں نسبتاً اعتدال پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے لیے خلیفہ یعنی 'محمد ﷺ کے نائب' کا خطاب اپنایا تھا۔ مگر عثمان نے بجائے اپنے لیے پر شکوہ اور ان دونوں سے برتر میریت منتخب کی۔ وہ خود کو 'اللہ کا نائب' کہلوانے پر زور دینے لگے۔ مراد یہ تھی کہ محمد ﷺ کے بعد اب وہ زمین پر خدا کے نمائندہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عثمان کے بعد ایک ایسی روایت چل پڑی جس کے تحت مستقبل کے رہنما دنیاوی طاقت اور اختیار ہتھیانے کے لیے بھی خدائی تصدیق کا دعویٰ کریں گے۔ رہنما تو رہے ایک طرف، ہم دیکھیں گے کہ کئی ایسے بھی آئیں گے جو بعد ان کے، انہی خطوط پر چلتے ہوئے تقریباً نبوت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پائے جائیں گے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہوں گے، جو نبوت کے دعویدار تو نہ ہوں گے مگر بہر حال اپنے فائدے کے لیے کوئی نہ کوئی خدائی جواز ڈھونڈ ہی لائیں گے۔

جلد ہی قدیم دور سے چلی آرہی، مکہ کی حکومت امراء جس کا محمد ﷺ نے قلع قمع کر دیا تھا، ایک بار پھر سر اٹھانے لگی۔ اب یہ مکہ کی اشرافیہ نہیں بلکہ مسلم اشرافیہ کہلائی جانے لگی۔ عثمان نے کئی قیمتی املاک اپنے رشتہ داروں کو بخش دیں۔ ان میں کئی ایسی تھیں جن میں ہزاروں گھوڑوں والے اصطبل اور سینکڑوں غلام ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح دجلہ اور فرات کے بیچ واقع وسیع زرعی اراضی بنو امیہ سے کے رئیسوں میں بانٹ دی گئیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس قدیم نشیبی خطے، یعنی العراق کو 'باغ امیہ' کہا جانے لگا۔ عثمان کی خلافت کئی تاریخی کارناموں اور انتہائی اہم کامیابیوں سے تعبیر ہے۔ جیسے، پہلی بار قران کو ترتیب دے کر واقعی ایک تحریری کتاب کی شکل دی گئی، اس کے علاوہ سلطنت اسلامی یعنی خلافت کی سرحدیں شمال میں قدیم یونان کی آڑی تہذیب یعنی ایجین، مغرب میں شمالی افریقہ کی ساحلی پٹی اور مشرق میں ہندوستان کی فصیلوں تک پھیل چکی تھیں۔ یہ فتوحات اور قران کی ترتیب اور کتابی شکل کا کارنامہ بنو امیہ کو بڑے پیمانے پر بااختیار بنانے کے سبب گہنا کر رہ گئیں۔

مکہ کا وہ طبقہ جو کبھی سرداری پر فائز تھا، ایک بار پھر اقتدار میں آ گیا اور انتقامی کاروائیاں شروع کر دی گئیں۔ اس بات میں کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ گائے کا دودھ کون دوہتا ہے، کون لے جاتا ہے اور وہ کون ہیں جو سینگ پکڑے، منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ وہ جن کے ذمے صرف سینگ تھامے رکھنا تھا، بدعنوانی اور اقربا پروری کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ اس کے جواب میں اعلیٰ حکام نے بھی وہی سلوک کیا جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ جن لوگوں پر ان کا اختیار چلتا، املاک اور جائیدادیں ضبط ہونے لگیں، آئے دن ملک بدری کے احکامات جاری کیے جاتے، جو زیادہ چوں چراں کرتا اسے پابند سلاسل کر دیا جاتا۔ یہی نہیں، تاریخ میں درج ہے کہ اس زمانے میں کئی لوگوں کو سیاسی، سماجی اور معاشی تباہی کے ساتھ ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ محمد ﷺ کے دیرینہ ساتھی یہ حال دیکھ کر چپ نہ رہ سکے اور احتجاج کرنے لگے۔ جس مختصر شوریٰ نے عثمان کو خلیفہ چنا تھا، اس میں عثمان کے علاوہ باقی پانچ بھی اب کھل کر سامنے آ گئے اور گاہے بگاہے تنقید کرنے لگے۔ احتجاج کا حصہ بن گئے۔ اس تحریک میں سب سے آگے علی تھے۔

علی نے متنبہ کیا کہ اسلام کی املاک اور امت کی تجوری میں نقب لگائی جا رہی ہے۔ بنو امیہ کی مثال بھوکے جانوروں جیسی تھی جو نظر میں آنے والی ہر چیز کو چیر پھاڑ کر ہڑپ کر رہے تھے۔ تاریخ میں اس بابت خلیفہ کا ردعمل کچھ یوں بیان ہوا ہے، 'عثمان ان باتوں پر چنداں کان نہیں دھرتے تھے۔ ان کے گرد ہر وقت بنو امیہ کے لوگوں کا جمگھٹا رہتا اور وہ انتہائی خود پسندی اور تکبر سے شانے اچک کر تمام الزامات رد کر دیتے۔ بنو امیہ خدا کی نعمتوں اور سامان اسباب کو یوں چٹ کرتے جا رہے تھے جیسے اونٹ بہار کے موسم میں چراہ گاہیں صاف کر لیتے ہیں'۔ علی اور دوسرے نامی گرامی اصحاب محمد ﷺ کا کہنا یہ تھا کہ جلد ہی یہ ہریالی ختم ہو جائے گی اور پیچھے بنجر صحرا کے کچھ نہیں بچے گا۔

اگرچہ سب ہی احتجاج میں ایک عرصے سے حصہ ڈال رہے تھے لیکن عائشہ کی شعلہ بیانی نے فوراً ہی سب کی توجہ حاصل کر لی۔ وہ پہلی اور شاید آخری بار علی کی کسی بات سے متفق دکھائی دے رہی تھیں۔ 'وہ سٹھیایا ہوا سترا بہترا۔۔۔' عائشہ عثمان کے بارے کہنے لگیں۔ دوسری روایات میں وہ عثمان کو کئی دوسرے القابات سے بھی نوازتی نظر آتی ہیں۔ جیسے قبر میں پاؤں لٹکے ہیں، ٹنڈ منڈ رعشہ زدہ، کانپتا ہوا بوڑھا آدمی

اپنے رشتہ داروں میں محبوس ہے۔ اس کے بعد تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہر شخص کے منہ میں گز گز بھر لمبی زبان نکل آئی ہے اور وہ خلیفہ کو لعن طعن کرنے لگا۔ لوگ عثمان کا مذاق اڑانے لگے اور جہاں موقع ملتا، ان کی برائی کرتے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ عائشہ نے اچانک خاموشی اس وجہ سے توڑی ہے کہ عثمان نے سالانہ وظیفے کو گھٹا کر باقی امہات المومنین کے برابر کر دیا تھا۔ یعنی انہوں نے عائشہ کی برتری کو چیلنج کیا تھا۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے خیال میں عائشہ کی دیرینہ خواہش یہ تھی کہ ان کے چچازاد، یعنی طلحہ خلافت سنبھالتے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ دوسروں کی طرح عائشہ بھی واقعی اس بات پر بالضرور ہی غصہ تھیں کہ بدعنوانی ناسور کی طرح بڑھتی جا رہی تھی اور بنوامیہ تمام حدوں کو پھلانگ رہے تھے۔ جلد ہی اس کا واقعی ثبوت بھی سامنے آ گیا جب عثمان کے سوتیلے بھائی ولید کے بارے انتہائی رسوا کن بات منظر عام پر آ گئی۔

ہوا یہ کہ ولید کو عراق کے وسطی شہر کوفہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنی اور نہ ہی خاندان کی عزت کی پرواہ کرتے ہوئے کوفہ کے لوگوں کے ساتھ بدتمیزی اور ہتک آمیز سلوک کرتا۔ یہاں تک کہ اسے اشرافیہ سے منسوب آداب اور اخلاق کا بھی پاس نہ رہا۔ عربوں کی روایتی ادعا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئے روز شہر کے لوگوں، بالخصوص وہاں کی اشرافیہ کو سامنے بلا کر، نام لے کر گنوار، نامعقول اور مقامی آبادی کو ایرے غیرے، گھٹیا قرار دیتا۔ وہ لوگوں کے الزامات اور زیادتی پر سر جھٹک کر کہتا، 'ناانصافی سے پابند سلاسل کرنا؟ زمین اور املاک پر ناجائز قبضہ؟ عوامی خزانے میں لوٹ مار؟' ولید کے مطابق یہ ساری شکایتیں، 'ادوم کے میدانوں میں چرنے والی بکریوں کے پاد سے زیادہ کچھ نہیں تھیں'۔

تاہم ان شکایتوں میں سے، یا کہیے بکریوں کے پادوں میں سے ایک، کسی نہ کسی طرح اڑتی ہوئی مدینہ پہنچ ہی گئی۔ شکایت یہ تھی کہ ولید شراب کے نشے میں دھت مسجد جا پہنچا۔ عین اس وقت جب عبادت کے لیے صفیں ترتیب دی جا رہی تھیں، یہ لوگوں کے سامنے لڑکھڑاتا ہوا آیا، نشے میں دھت تھا۔ منبر کے پیچھے قے کر دی۔ کوفہ کے عوامی حلقوں کی جانب سے ایک نمائندہ وفد یہ شکایت لے کر مدینہ پہنچا اور تقاضا تھا کہ فی

الفور ولید کو واپس بلا کر سخت سزا دی جائے۔ لیکن عثمان نے ان کی شکایت پر ذرا بھی کان نہیں دھرا اور ان کا مطالبہ یکسر رد کر دیا۔ یہی نہیں، بد تر تو یہ تھا کہ عثمان نے انہیں اس طرح کی الزام تراشی اور گورنر کے خلاف زبان درازی پر سختی سے جھڑک دیا اور سخت سزا کی دھمکی دے ڈالی۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو یہ وفد عائشہ کے پاس جا پہنچا اور پیروی کی درخواست کی۔ عثمان تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے ناک سکیڑ کر کہا، 'کیا عراق کے سرکش لچے اور لفنگوں کو عائشہ کے گھر میں پناہ لینے کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں ملتی؟'

اگرچہ عثمان نے اپنے تئیں کوفہ کے وفد کو بے نقط سنائی تھیں۔ ان پر چوٹ لگائی تھی مگر اس کا اثر عائشہ پر ہوا۔ اب یہ صرف 'عراق کے سرکش لچے اور لفنگوں' کا ہی نہیں، عائشہ کی بھی عزت اور بے عزتی کا مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ جب عثمان کے یوں، وفد کے ساتھ ناروا اور استہزائی سلوک کی خبر پھیلی تو لوگوں کا تقریباً یہی خیال تھا کہ یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ شاید عائشہ کا عثمان کے بارے یہ خیال کہ وہ 'سٹھیا' گئے ہیں، درست ہی تھا۔ شاید عثمان کی گرفت واقعی کمزور ہوتی جا رہی تھی، یا کم از کم ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت تو بالضرور ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اور پھر جب مدینہ کے انصار سے تعلق رکھنے والے ایک انتہائی عزت دار بزرگ کے ساتھ ان کا رویہ دیکھ کر تو لوگوں کو اس بات کا پوری طرح یقین ہو گیا۔ یہ بزرگ آدمی ایک دن مسجد میں کھڑے ہوئے اور عراق سے آئے وفد کے مطالبات کی عوامی حمایت کا اعلان کیا۔ اس پر عثمان غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ انہوں نے اس شخص کو اٹھوا کر مسجد سے باہر پھینکوا دیا۔ پہلے دھکم پیل اور پھر اس قدر درشتی سے باہر نکالا کہ گرنے سے اس کی چار پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

اگر اس سے پہلے عائشہ کو عثمان کے رویے پر صرف بے عزتی محسوس ہوئی تھی، اب وہ سخت برہم ہو گئیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ مجرم تو آزاد پھرتا ہے مگر جو انصاف کا نام بھی لے تو اسے یوں مارا پیٹا جائے؟ اب انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ کسی میں اتنی مجال نہیں تھی کہ ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا۔ وہ کسی پردے، حجاب یا حکم کی پرواہ نہیں کریں گی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے منہ پر چادر ڈال کر پردے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی آواز بھی دبا دی جائے گی۔ مسجد میں تو وہ بالکل بھی چپ نہیں بیٹھیں گی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد، جوں ہی لوگ جمعہ کے دن فجر کی نماز کے لیے جمع ہوئے تو عائشہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ہاتھ میں محمد

ﷺ کے زیر استعمال رہنے والی چمڑے کی چپل اٹھائے ہوئے تھیں۔ 'کیا تم پیغمبر کی یہ چپل دیکھتے ہو؟ یہ ابھی تک ادھڑی بھی نہیں ہے۔' عائشہ نے منبر پر بیٹھے عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے چلا کر کہا، 'یہ ابھی تک صحیح سلامت ہے۔ اسی کی سلائی بھی ویسی کی ویسی ہے اور تم نے سنت کو بھلا دیا؟ ان کے طریق کو چھوڑ دیا؟'

آخر عثمان نے کیا سوچ کر عائشہ کے بارے یہ گماں کر لیا تھا کہ وہ دب جائیں گی؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ طویل عرصے سے انہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی؟ ویسے بھی اگر سوچیں تو چپل جیسی حقیر شے کو یوں علامت بنا کر استعمال میں لانا، اخیر حکمت عملی ہے۔ عثمان، ایسی عورت کو کیونکر نظر انداز کر گئے؟ بہر حال عائشہ کے اس انوکھے احتجاجی مظاہرے کے نتیجے میں مسجد میں ایک دم ہڑبونگ مچ گئی۔ لوگ فوراً ہی ان کی حمایت میں نکل آئے اور ہر شخص اپنی چپل اٹھائے عثمان کی طرف لہرانے لگا۔ چاروں طرف سے خلیفہ پر آوازے کسے گئے اور ملامت ہونے لگی۔ یوں اسلامی ریاست اور امت میں ایک نیا ہتھیار نکل آیا اور اس کا بھرپور اور انتہائی پر اثر مظاہرہ شروع ہو گیا۔ یہ ہتھیار اس کے بعد کبھی خاموش نہیں ہوا اور آنے والے وقتوں میں تقریباً ہر دور کے خلفاء، شاہوں اور سلاطین کے خلاف استعمال ہوتا رہا۔ اگر کوئی پراپگنڈے کا ایک ہتھیار نکالتا، جواب میں حکمران کوئی دوسرا سامان پیدا کر لیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیغمبر کی نشانیاں جیسے چپل، چوغہ، دانت، ناخن، سر اور داڑھی کے بال۔۔۔ جسے جو ملا، اس کو اختیار اور اپنا اثر ورسوخ پکا کرنے کے لیے استعمال کرنے لگا۔ آج بھی ہم اسلامی دنیا میں ہر جگہ یہ نشانیاں جا بجا سنبھالی ہوئی دیکھتے ہیں۔ مساجد، خانقاہوں اور درباروں میں یہ باقیات عام مل جاتی ہیں۔ عام مسلمان دیوانہ وار ان نشانیوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

خیر، عثمان کے پاس ولید کو واپس بلا لانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ تاہم وہ اس کا حکم دینے میں پس وپیش سے کام لیتے رہے اور سخت سزا جیسے کوڑے مارنے پر تو سرے سے پہلو تہی کر گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کوڑے مارنے کے لیے کوئی شخص راضی نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ مدینہ کا ہر شخص اور کوفہ کے وفد کے نمائندے ولید کو سبق سکھانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس ضمن میں ان کے پیش رو، عمر کی مثال ابھی زندہ تھی۔ لوگوں کی یادداشت میں ابھی تک اس واقعے کی یاد تازہ تھی جب انہوں نے اپنے سگے بیٹے کو

شراب نوشی اور بازار میں غل غپاڑہ مچانے پر کوڑے مارنے کی سخت سزا سنائی تھی۔ کوئی رعایت نہیں برتی تھی اور جب ان کا بیٹا سزا کے بیچ میں ہی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تو انہوں نے ماتم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ عمر کے دور میں تو اسلام کے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا تھا اور خاندان اور کنبے کے ساتھ تو ہر گز، ہر گز رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ اس دور کے یہی اصول اب عثمان کی خلافت میں بری طرح پامال ہو رہے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ سزا دینے میں پس و پیش سے کام لے رہے تھے بلکہ کنبے اور خاندان کے دباؤ میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی حالات اس قدر نازک ہو گئے کہ عثمان کے لیے سوتیلے بھائی کو واپس بلا کر صرف عہدے سے برخاست کرنا کافی نہیں تھا۔ عرب، مصر اور عراق میں ہر طرف خطوط لکھے گئے جن میں سخت ترین اقدامات اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان خطوط میں سب سے زیادہ جذباتی اور آتش ناک وہ تھے جو خود عائشہ نے تحریر کروائے اور اپنی نگرانی میں اسلامی سلطنت کے کونے کونے میں پھیلا دیے۔ انہوں نے تمام امہات المومنین کی طرف سے سچے مسلمانوں کو اپیل کی تھی کہ وہ آگے آئیں اور اسلام کی حفاظت کریں۔ نا انصافی اور بد عنوانی کی حوصلہ شکنی کریں اور ان کے شانہ بشانہ تحریک کا حصہ بنیں۔ ان خطوط کی ترسیل کے نتیجے میں ملنے والا ردعمل دیکھ کر خود عائشہ بھی حیران تھیں۔ چند ہفتوں کے اندر ہی جنگجوؤں کی تین مسلح ٹکڑیاں مدینہ پہنچ گئیں۔ ان میں سے دو عراق کی چھاؤنیوں کوفہ اور بصرہ جبکہ تیسری مصر کی چھاؤنی فسطاط سے یہاں پہنچی تھی۔ فسطاط اسلامی ریاست میں مصر کا پہلا دارالحکومت تھا جو بعد میں قاہرہ کہلائے جانے والے شہر کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔

یہ جنگجو 'ایرے غیرے' یا 'لچے لفنگے' نہیں تھے۔ یہ سینکڑوں کی تعداد میں انتہائی منظم، اسلامی افواج کے جانباز سپاہی تھے۔ ان کی سپہ سالاری انتہائی قابل اور عالی نسب اشخاص کے ہاتھوں میں تھی، جنہوں نے ایک عرصے تک اسلام کی سربلندی کے لیے مشرق وسطیٰ کے کونے کونے میں فوجی اور تبلیغی مہمات چلائی تھیں۔ اس سے یہ بات تو طے ہو گئی کہ مطالبہ جائز تھا اور اب لوگ کسی بھی صورت پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ عثمان فیصلہ کن کاروائی کا حکم دے کر ان کی شکایات کا ازالہ کریں یا پھر خلیفہ کے

عہدے سے استعفیٰ دے دیں۔ اس تحریک میں اب کئی نامی گرامی لوگوں نے بھی خاموشی توڑ کر شمولیت اختیار کرلی تھی۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ، پہلے خلیفہ ابو بکر کے فرزند، یعنی عائشہ کے سوتیلے بھائی، محمد بن ابو بکر چیدہ لوگوں میں شامل تھے۔ یہ وہی ہیں جن کی والدہ سے علی نے نکاح کیا تھا اور انہیں لے پالک بیٹا بنا لیا تھا۔ اب وہ لڑکا علی کے سائے میں پرورش پاکر کڑیل جوان ہو چکا تھا۔ لیکن اس میں اپنے والد جیسی متانت اور اور نہ ہی سوتیلے باپ جتنی فراست تھی۔ محمد بن ابو بکر کے حکم پر تینوں فوجی ٹکڑیوں نے، بجائے یہ کہ مدینہ پہنچ کر طاقت کے مظاہرے کے بعد بکھر جاتے، مدینہ سے باہر صحرائی پٹی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ایک طرح سے یہ حملے کی تیاری سمجھی جاسکتی ہے۔

مدینہ میں اس قدم سے بے چینی پھیل گئی اور سبھی سراسیمگی کے عالم میں اگلے مرحلے، بلکہ نتائج کا انتظار کرنے لگے۔ کیا خلافت کا تختہ الٹنے کی تیاری ہو رہی تھی؟ کیا یہ فوجی ٹکڑیاں محل پر دھاوا بول دیں گی؟ کیا خلیفہ پر بھی حملہ کیا جائے گا؟ یقیناً یہ ناممکن تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ جنگجو بجا طور پر باغی ہی تھے۔ وجہ یہ کہ ریاست کی نظر میں وہ منتخب شدہ خلیفہ کی مرضی اور اختیار سے منحرف تھے اور تقریباً بغاوت پر آمادہ تھے۔ باوجود یہ کہ وہ باغی تھے، انہوں نے ابھی تک صرف فوجی طاقت کا صرف منظر ہی پیش کیا تھا، نخلستان کے اندر داخل ہونے سے کترا رہے تھے۔ بجائے یہ کہ وہ فوری طور پر کوئی انتہائی قدم اٹھاتے، ان باغیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ علی سے رجوع کریں گے۔ ان کی نظر میں مدینہ کے اندر علی واحد شخص تھے جو اتحاد کو ہمیشہ سے باقی ہر چیز پر فوقیت دیتے چلے آئے تھے۔ اب ثالثی بھی انہی کے ذمے لگادی گئی۔

اگلے دو ہفتے تک علی نے ثالثی اور مصلح کا بھرپور کردار ادا کیا۔ اگرچہ فریقین میں سے ایک گروہ کی سربراہی ان کے لے پالک بیٹے کے ہاتھ میں تھی۔ علی اس کے مطالبات سے پوری طرح متفق بھی تھے لیکن وہ دیکھ سکتے تھے کہ محمد بن ابو بکر انتہائی ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، فوجی طاقت کے استعمال میں عجلت برت رہا تھا۔ وہ ہر قدم پر بلا سوچے سمجھے فوجی چڑھائی کی دھمکی دینے لگتا۔ علی کو اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ دوسرے فریق کی سربراہی عثمان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بھلے ان کے طرز حکومت

سے اختلاف رکھتے ہوں بلکہ کہیے ہر اس چیز کی نفی کرتے چلے آرہے ہوں جس پر علی کا یقین تھا لیکن بہر حال، وہ منتخب شدہ خلیفہ تھے۔ علی نے عثمان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اب اس مشکل مرحلے پر وہ وفاداری کا بھرپور ثبوت دیں گے۔ یہ وفاداریاں خلیفہ سے نہیں بلکہ خلافت سے جڑی تھیں۔ اسلام اور امت کے مفادات عزیز تھے۔ ان کا کردار ایک ایماندار ثالث کا رہے گا، جس میں وہ دونوں فریقین میں سے کسی کے بھی طرف دار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کی تمام تر نیک خواہشات اسلام کے ساتھ ہوں گی۔ جو دین اور امت کے حق میں بہتر ہو گا، وہی فیصلہ کرائیں گے۔ شاید وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے مگر ہر قدم پر انہیں عثمان کے ایک رشتہ دار، جو ان کا چچازاد تھا اور خلیفہ کی نیابت پر فائز تھا، مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ مروان نامی یہ شخص، مفاہمت کے ہر قدم پر روڑے اٹکانے لگا۔

مروان ایک دوسرے نام یعنی ابن ترید سے بھی جانا جاتا تھا۔ ابن ترید سے مراد 'جلاوطن کا بیٹا' ہیں، یا کم از کم یہ اس وقت کا نام ہے جب اس کے خاندان کو ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ مروان کے باپ کا نام حکم تھا جو بنو امیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ عثمان کا چچا تھا اور محمد ﷺ کا سخت مخالف تھا۔ جب آپؐ نے مکہ فتح کر لیا تو قریش کو ایک آخری موقع دیا، جس کے تحت وہ اسلام قبول کر کے امت میں شامل ہو سکتے تھے۔ یہ رعایت قریش کے ہر شخص سوائے مروان کے باپ، صلاح عام تھی۔ مروان کے باپ پر محمد ﷺ نے کبھی اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ یہ آخری شخص تھا جس نے بالکل آخری وقت پر ایمان تو قبول کر لیا لیکن اس کے طریق میں خاصی تضحیک تھی، جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ اس پر محمد ﷺ نے حکم جاری کیا کہ وہ اور اس کے خاندان کو جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ اپنے کنڈے سمیت مکہ کے جوار میں واقع طائف شہر منتقل ہو گیا۔ ابو بکر اور عمر دونوں نے ہی محمد ﷺ کے حکم، یعنی اس کی جلاوطنی کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن جب عثمان نے خلافت سنبھالی تو اپنے چچازاد یعنی مروان کی جلاوطنی ختم کر کے نہ صرف اسے مدینہ واپس بلا لیا بلکہ اسے خلیفہ کا نائب بھی مقرر کر دیا۔ مہر خلافت اب زیادہ تر اسی کے پاس جمع رہتی۔ یہ نیابت کا عہدہ تھا۔ بے انتہا اختیار ہاتھ میں آتے ہی مروان نے اس کا فائدہ اٹھانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔

مصر فتح ہوا تو مال غنیمت میں سب سے زیادہ حصہ مروان نے اپنے لیے رکھ لیا۔ اسی طرح جانوروں کے

لیے جو چارہ بازار میں بکنے آتا، اس کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرلی اور گاہے بگاہے ذخیرہ اندوزی کرتا اور مصنوعی قلت پیدا کر کے خوب فائدہ اٹھاتا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ یہ انتہائی چالاک آدمی تھا جس کی شاطر نظریں اس سے بھی کہیں بڑے حصے پر لگی تھیں۔ تقریباً چالیس برس بعد یہ خلافت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر تب اس کی حکومت صرف ایک سال ہی چل پائے گی۔ اس کا انجام یہ ہو گا کہ یہ ایک معزز آدمی کو معزول کرے گا جو اس صدمے سے چل بسے گا۔ پھر یہ اس کی بیوہ سے زبردستی شادی رچا لے گا۔ اس شخص کی بیوہ نوکروں کو ساتھ ملا کر اسے بستر پر قابو کرے گی اور تکیوں اور رضائیوں تلے سانس گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ یہ انتہائی ذلت آمیز موت کا شکار ہو گا اور لوگ مزے لے لے کر اس کی موت کا قصہ سنایا کریں گے۔ تاریخی حوالوں میں بھی اس بابت لوگوں کے بیان میں اس سے چھٹکارے پر خوشی دیدنی ہے۔

فی الوقت عثمان کی خلافت میں مروان چڑھتا ہوا سورج تھا۔ خلیفہ تک کس کی پہنچ ہو گی، امت کا ہر معاشی فیصلہ، اطلاعات اور نشریات کا سارا ذمہ اور باقی کئی اہم امور اب اس کے ہاتھ میں تھے۔ کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر خلیفہ سے بات کرنے کا بھی مجاز نہیں تھا۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ عثمان عمر رسیدگی کے باعث اب امور ریاست چلانے کے قابل نہیں رہے، اسی لیے انہوں نے کنارہ کر لیا ہے اور اب وہ زیادہ تر وقت عبادت اور پڑھنے لکھنے میں گزارتے ہیں اور یہ مروان ہے جو خلافت کی باگ دوڑ چلا رہا ہے۔ اب عثمان کا زیادہ تر وقت قران کا تحریری نسخہ ترتیب دینے میں گزرتا تھا اور انہیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے ان کے رشتہ دار کس طرح ان کے اختیار کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ اگر روایت میں ان بیانات پر غور کیا جائے تو کئی لحاظ سے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے یا پھر دوسری طرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد ازاں عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ سیاسی کثافت کو دور کرنے کا صرف طریقہ یہی تھا کہ بجائے منتخب شدہ خلیفہ عثمان، مروان کو اس سارے قضیے کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جائے۔

خیر باغیوں نے شہر کے باہر پڑاؤ جاری رکھا۔ مروان نے ان کے مطالبات نہ ماننے پر زور دیا اور اس کا خیال تھا کہ ان سے کسی بھی قسم کی رعایت نہ برتی جائے۔ بلکہ آہنی ہاتھوں سے نبٹا جائے۔ وہ اصرار کرتا رہا

کہ اگر آج ان کو منہ لگایا تو آئے دن لوگ یوں ہی مدینہ پر چڑھائی کرتے رہیں گے اور جلد ہی صوبوں میں کھلی بغاوت شروع ہو جائے گی۔ کمال ہوشیاری سے مروان نے اس نکتے کو یوں توڑ مروڑ دیا کہ اس پر راست بازی اور خلیفہ کے حق استحقاق کا گمان ہونے لگا۔ فریب اور مکر کی بہترین مثال، مروان نے چھل پرت کر کے عثمان کو اس بات پر قائل کر لیا کہ بحیثیت خلیفہ انہیں ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کی حاجت نہیں اور ڈرنے کی تو قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ، آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ مروان کا یہ خیال غلط ثابت ہو گا۔ مروان نے انتہائی نیکو کاری کا انداز بنا کر کہا، 'اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ آپ خطا پر خطا کرتے جائیں کیونکہ خدا کے یہاں توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ لیکن، خوف کے ہاتھوں ڈر کر پیچھے ہٹ جانا، اپنے کیے پر نادم ہونا اور تائب ہو جانا۔۔۔ یہ انتہائی رسوا کن بات ہے'۔ اگلا قدم اس نے مدینہ کے باہر جمع باغیوں کو دھمکانے کی غرض سے یہ اٹھایا کہ وہ خود ان کے خیموں میں چلا آیا اور ان کے بیچ کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریر کی، انہیں لعن طعن اور ملامت کرنے لگا۔

'تم لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ کیا تم خلافت کو تاخت و تاراج کرنا چاہتے ہو؟' مروان چلایا، 'تمہاری شکلیں بگڑ جائیں، تم غارت ہو جاؤ۔ تم یہاں ہماری زمین پر، ہم سے ہماری املاک چھیننا چاہتے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔ واللہ، اگر تمہارا ارادہ یہی ہے تو جان لو، تمہارا احشر اچھا نہیں ہو گا۔ وہیں واپس چلے جاؤ جہاں سے تم آئے ہو کیونکہ ہم اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے جو ہمارا ہے'۔

یہ علی کی ثالثی کی کامیابی کہلائی جا سکتی ہے کہ اس دن مروان کو لوگوں نے وہیں کھڑے قتل نہیں کر دیا۔ باغیوں نے اس پر تیر نہیں برسائے بلکہ گالیاں دے کر وہاں سے نکال دیا۔ آج تو بچت ہو گئی لیکن علی جانتے تھے کہ اگر یہی چلن رہا تو مزاحمت کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے عثمان کو خبردار کرنا مناسب سمجھا۔ کہا کہ دیکھیے، مروان کی وجہ سے انہیں انتہائی مشکل ہو رہی ہے۔ اس کی شعلہ انگیز باتوں اور اقدامات سے وہ کسی بھی طرح سے ثالثی نہیں کر پا رہے اور اگر اس کے بعد، اس کے اقوال و افعال کی وجہ سے کوئی مشکل ہوئی، بدامنی پھیلی یا لوگوں نے دھاوا بول دیا تو وہ کسی بھی طرح سے ذمہ داری قبول نہیں کریں گے۔ عثمان کو چاہیے کہ وہ اپنے چچازاد کو روک لگا کر رکھیں، اس کا منہ اور ہاتھ بند کروائیں۔

لیکن عثمان نے علی کی اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ انہوں نے اپنی پسندیدہ بیوی نائلہ کو بھی جھڑک دیا، جو حالات کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے اس معاملے میں علی کی طرف دار تھیں۔ وہ مروان کی حرکات میں چھپے خطرات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں۔ مگر عثمان اپنی بات پر اڑے رہے۔ کیا وہ اپنے کنبے سے وفاداری جتا رہے تھے؟ یا کیا وہ واقعی عمر رسیدگی کے باعث اب سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو چکے تھے؟ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔ ویسے بھی، اب اس بات سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

تین دن بعد جمعہ کا دن تھا۔ عثمان مسجد میں آئے اور منبر پر نشست سنبھال لی۔ لوگوں نے سیٹیاں بجا کر اور پھبتیاں کس کر ان کا استقبال کیا۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے تو اپنی چھڑی بھی دکھائی۔ وہ ہاتھ میں کچھ چیزیں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ عثمان پر چلایا، 'دیکھو! ہم تمہارے لیے ایک ناکارہ اونٹنی لائے ہیں۔ اس کے ساتھ اون کا ایک ادھڑا ہوا، پھٹا پرانا چوغہ اور لوہے کا طوق بھی ہے۔ اس منبر سے اترو تاکہ ہم تمہارے گلے میں طوق پہنائیں، پھٹے ہوئے چوغے میں لپیٹ کر اونٹنی پر سوار کرائیں اور باہر جہاں مدینہ کا کوڑا کرکٹ سڑتا ہے، وہاں چھوڑ آئیں'۔

اس شخص کا یہ کہنا تھا کہ چاروں طرف لوگوں نے شور شرابہ شروع کر دیا۔ ہجوم مشتعل ہو گیا اور لوگ منبر پر پتھراؤ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک پتھر سیدھا عثمان کی پیشانی پر لگا اور وہ گر کر بے ہوش ہو گئے۔

مسجد کے منبر پر بیٹھے خلیفہ پر پتھراؤ؟ یہ ہر طرح سے کھلی بغاوت تھی۔ جیسا کہ مروان زور دیا تھا، شاید بغاوت کو آہنی ہاتھوں سے کچل دینے کا وقت آن پہنچا تھا۔ لیکن عثمان جو ابھی تک پتھراؤ کی وجہ سے بے حال تھے، لوگوں کے یوں ایک دم، الٹا ان ہی پر برسنے پر دم بخود تھے، انہوں نے طاقت کے استعمال سے انکار کر دیا۔ بھلے ان سے خلافت میں کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، وہ آخر کار ایک پارسا، سچے اور خدا پرست مسلمان تھے۔ وہ کسی بھی صورت کسی مسلمان کا خون بہانے کا حکم نہیں دے سکتے تھے۔ جہاں انہوں نے سختی کے ساتھ طاقت کے استعمال سے روک دیا، وہیں اتنی ہی سختی سے خلیفہ کا عہدہ چھوڑنے، استعفیٰ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ شاید وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہے تھے یا شاید وہ واقعی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ محمد ﷺ نہیں بلکہ خدا کا نائب ہیں؟ ان کا اصرار تھا کہ ایک خلیفہ کے مستعفی ہونے کی کوئی صورت نہیں

ہے۔ زور دے کر کہا، 'میں خدا کی طرف سے عطا کیے ہوئے کپڑے کیسے اتار دوں؟' یوں کہیے، یہ کہہ کر عثمان نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔

مگر سوال یہ تھا کہ خلیفہ کی موت کا پروانہ کون لکھے گا؟ جو موجود تو تھا مگر لکھنا ابھی باقی تھا۔ جلد ہی یہ پروانہ بھی منظر عام پر آ گیا جسے ہم آج 'خفیہ خط' کے نام سے جانتے ہیں۔ حالات جب حد سے آگے بڑھ گئے تو چاروں طرف سے سفارت اور مفاہمت کی کوششیں شروع ہوئیں۔ جب واقعی یہ لگ رہا تھا کہ فتنہ ٹل گیا ہے، یہ خط اچانک منظر عام پر آ گیا۔ جیسے، کوئی جادوگر اپنی ٹوپی سے کبوتر نکال لاتا ہے۔

مسجد میں پتھراؤ کے بعد عثمان کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ صحیح معنوں میں ہکا بکا تھے۔ جیسے کسی نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو، وہ حالات کے اس نہج پر پہنچتا دیکھ کر خاصے افسردہ تھے۔ آخر کار انہوں نے باغیوں کے تقاضے کو سمجھنا شروع کیا اور ان کے مطالبے کے عین مطابق وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف دو انتہائی نزاعی گورنروں یعنی کوفہ میں اپنے سوتیلے بھائی ولید اور مصر میں فسطاط کے گورنر، یعنی اپنے بہنوئی کو عہدے سے برطرف کر دیں گے۔ بلکہ مصر میں علی کے لے پالک بیٹے محمد بن ابو بکر کو نیا گورنر بھی مقرر کر دیا۔ مزید یہ کہا کہ اگر کسی کو ان کی نیت اور فرمان پر شک ہے تو علی ان کے ضامن ہیں۔

اگر کوئی یہ سمجھنا چاہے کہ ایک دم امن قائم ہونے پر جو احساس ہوتا ہے، وہ کیا ہوتا ہے تو وہ اس دن مدینہ کی حالت دیکھا کرے۔ بحران ٹل گیا تھا اور انصاف کے تقاضے پورے ہو چکے تھے۔ علی کی ضمانت پر باغیوں نے فوراً ہی خیمے اکھاڑے اور واپس اپنی چھاؤنیوں کی طرف لوٹ جانے کا قصد کیا۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے چل رہا تھا لیکن صرف تین دن بعد یہ ہوا کہ مصر واپس جاتے ہوئے، راستے میں محمد بن ابو بکر اور ان کے آدمیوں نے ایک قاصد کو دیکھا، جو ان کے پیچھے پیچھے گھوڑے پر سرپٹ چلا آ رہا تھا اور مبینہ طور پر قافلے سے آگے نکل کر پہلے ہی مصر پہنچنا چاہتا تھا۔

محمد بن ابو بکر کے حکم پر اس قاصد کو بیچ راستے میں دھر لیا گیا اور اس سے پوچھ گچھ کی۔ پتہ چلا کہ یہ قاصد خلیفہ کے لیے کام کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے گھوڑے کی زین کے تھیلے کی تلاشی لی۔ اس تھیلے میں

پیتل کی ایک بڑی دوات تھی جو عام طور پر پیشہ ور انشاء نویسوں کے استعمال میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ، سیاہی کا پاؤڈر اور گھولنے کے لیے سیال بھی تھا۔ اسی طرح تھیلے میں چرمی کاغذ اور پروں سے بنے قلم، چاقو اور مہریں بھری ہوئی تھیں۔ اس تھیلے میں ایک خفیہ خانہ بھی تھا جس میں انہیں عثمان کی طرف سے جاری ہونا والا، ذاتی مہر بند خط ملا۔ یہ خط ان کے بہنوئی کے نام تھا۔ وہی بہنوئی جو مصر کا گورنر تھا اور جسے عثمان نے برطرف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس خط کے مندرجات کے مطابق واپس لوٹنے والے باغیوں کے سپہ سالاروں کو فوری گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکید کی گئی تھی کہ پہلے ان کے سر کے بال اور داڑھیاں مونڈ دی جائیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارے جائیں۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی زندہ بچتا ہے تو اسے پابند سلاسل کر دیا جائے۔

اس کے بعد کیا بچتا ہے؟ دھوکے اور فریب، دوہری چال کا تحریری ثبوت ہاتھ میں آتے ہی باغیوں نے آگے بڑھنے کی بجائے واپسی کی راہ لی۔ تین دن کے اندر وہ مدینہ پہنچ گئے اور اس دفعہ انہوں نے نخلستان سے باہر مضافات میں ٹھہرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کسی بھی صورت مذاکرات پر آمادہ نہیں تھے اور پہنچتے ہی محل کا گھیراؤ کر کے محاصرہ کر لیا۔

خط پر مہر یقیناً عثمان کی ہی تھی۔ انہوں نے مہر دیکھ کر اس کا اعتراف بھی کر لیا کہ مہر انہی کی تھی۔ لیکن خط کا کیا؟ انہوں نے قسم اٹھائی کہ خط اور اس کے مندرجات کا انہیں قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا پورا سچ کیا ہے، یہی سچ ہے یا پھر تردید کا معقول جواز پیدا کیا جا رہا تھا؟ بعض لوگ طرح قائل تھے کہ عثمان جھوٹ بول رہے ہیں، دوسروں کا خیال یہ تھا کہ عثمان کی سچائی اور راست بازی پر کوئی شک نہیں تھا بلکہ یہ مروان کی کارستانی ہے۔ انہوں نے خط کی تحریر کی طرف اشارہ کیا، جو ان کے مطابق مروان کے ہاتھ کی لکھائی تھی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خط کس نے تحریر کیا، کس کی لکھائی تھی یا اس کے پیچھے کون تھا۔ اگر عثمان کی مرضی کے بغیر، ان کے علم سے باہر خلیفہ کی مہر کا یوں استعمال ہو سکتا ہے تو یہ انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت تھا۔ اسی بنا پر وہ مزید اس عہدے کے لائق نہیں تھے۔ ایک افواہ یہ بھی اڑی کہ دراصل یہ علی تھے جنہوں نے پورے پلان کے تحت یہ خط لکھوایا تھا، پھر اسے مصر

روانہ کیا اور جانتے بوجھتے قاصد کو پکڑوا دیا تھا تاکہ عثمان کو ہٹانے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس افواہ کے جواب میں بھی ایک نئی بات فوراً ہی منظر عام پر آ گئی کہ دراصل علی کے خلاف یہ مروان کی رچائی ہوئی سازش ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مدینہ کی فضا کا کیا حال ہو گا، جتنے منہ اتنی باتیں۔ جس کا جو جی چاہتا بے پر کی اڑا دیتا اور یوں ایک کے بعد دوسرا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی سازشی نظریے جمع ہو گئے۔ اس سارے غبار میں صرف ایک بات یقینی تھی، سب ہی جانتے تھے کہ عثمان کا خاتمہ قریب ہے۔

باغیوں کی نیت عثمان کو قتل کرنے کی نہیں تھی۔ یا کم از کم پہلے پہل ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مدینہ پہنچتے ہی صرف محل کا محاصرہ کیا تھا، دھاوا نہیں بولا تھا۔ ان میں سے چند ایک ایسے ضرور تھے جو شروع دن سے خلیفہ کے خلاف 'کھلم کھلا جہاد' پر زور دیتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن وہ بھی ہچکچا رہے تھے کہ نا سمجھی میں ایسا قدم اٹھ جائے جس کے بعد قتل و غارت کی ایک لہر شروع ہو جائے گی۔ جو آنے والی صدیوں میں اسلامی تاریخ کو گہنا کر رکھ دے گی اور آج بھی اس کا اثر ختم ہونے میں نہیں آ رہا ہے۔ تقریباً سب ہی لوگ اس بات پر متفق تھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرے، یہ آخری حد ہو گی۔ یہ تو ایک عام مسلمان کے خون کی حرمت تھی، خلیفہ پر وار کرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

باغیوں کا مطالبہ کسی بھی صورت عثمان کو قبول نہیں تھا۔ وہ خلیفہ کی فوری اور غیر مشروط علیحدگی چاہتے تھے۔ بات چیت اور مذاکرات کا اب کوئی راستہ باقی نہیں تھا۔ علی نے پوری کوشش کر کے دیکھ لی لیکن ان کی تمام تر سعی بے سود تھی۔ وہ معاہدے کے ضامن تھے اور جس قدر باغی اس دغا پر رنجیدہ تھے، اتنا ہی علی بھی اس دھوکے پر خفا تھے۔ وہ صاف صاف دیکھ سکتے تھے کہ اس کے نتیجے میں پر تشدد کاروائیاں شروع ہو گئیں تو وہ کس قدر بھیانک رخ اختیار کر سکتی ہیں۔ چنانچہ، انہوں نے اپنے بیٹوں حسن اور حسین علیہ السلام جواب جوانی میں تھے، انہیں عثمان کے محل پر پہرہ بٹھا دیا۔ ان کے ہاتھ میں اس کے سوا کرنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عثمان کس قدر ضدی اور ضرورت پڑی تو کسی بھی صورت پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ وہ اب تقریباً بے بس ہو چکے تھے اور آنے والی تباہی کو روکنے سے قاصر تھے۔ یہ انتظام کر کے وہ مسجد میں جا بیٹھے اور اب ان کا زیادہ تر وقت وہیں گزرنے لگا۔

حالات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ عائشہ کا حال بھی اب علی سے مختلف نہیں تھا۔ وہ بھی اب اس مسئلے کا حتمی حل تلاشنے سے قاصر تھیں۔ مناسب یہی تھا کہ علی کی طرح وہ بھی کنارہ کر لیتیں اور اپنے طریقے سے انہوں نے یہی کیا۔ جیسے علی علیہ السلام، ویسے ہی معاملات اب عائشہ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اب وہ کچھ بھی کر لیں، اس 'سٹھیائے ہوئے سترے بہترے' کے خلاف لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں ناکام رہتیں۔ عائشہ کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے۔ انہوں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چپل کو علامت بنا کر عثمان کو ہوش دلانے کی کوشش کی تھی، انہیں خبردار کیا تھا۔ لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ جس راستے پر وہ عثمان کو واپس لانا چاہتی تھیں، وہ کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ 'خفیہ خط' جیسی گھناؤنی سازش بھی رچائی جا سکتی ہے۔ آخر یہ کیونکر ہوا کہ حالات ایسے بن گئے کہ ایک طرف علی اور دوسری جانب عائشہ، دونوں ہی بے بس تھے۔ وہ دونوں ہی ایک کشتی کے سوار تھے اور مدینہ کے گنے چنے فہم و فراست، سمجھ رکھنے والوں میں سے یہ دو نامی گرامی لوگ بھی ہار مان چکے تھے؟ عائشہ کا سوتیلا بھائی، ابو بکر کا بیٹا خلیفہ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا؟ یہ کیسی مشکل تھی کہ اب وہ پورے ہوش و حواس میں، نہ تو اپنے بھائی اور نہ ہی عثمان کی طرف داری کر سکتی تھیں؟ جب روز بروز یہ کشمکش بڑھتی ہی گئی، عائشہ بھی گہرے ہوتے تصادم اور خیر خواہی اور بد خواہی، اپنے اور پرائے کے گھن چکر میں پھنس کر رہ گئیں۔ دونوں طرف ان کے اپنے ہی تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن ان کے اعصاب جواب دے گئے اور انہوں نے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کنی کنارہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے قصد کیا کہ وہ عمرے کی غرض سے مکہ چلی جائیں گی۔

جیسے ہی مروان کو عائشہ کے اس ارادے کی خبر ہوئی، وہ فوراً ہی خطرے کو بھانپ گیا۔ عائشہ کا ان حالات میں چلے جانے کا مطلب یہ تھا کہ باغیوں کو کھلی چھٹی مل جاتی اور وہ اس کو یوں سمجھتے کہ وہ کچھ بھی کرنا چاہیں کر سکتے تھے۔ ان کو یہ پیغام ملتا کہ عائشہ ان کے راستے میں حائل نہیں ہوں گی۔ بلکہ وہ تو اس کا یہ مطلب بھی سمجھیں گے کہ اس فعل سے وہ باغیوں کے مطالبات اور اقدامات کی خاموش مگر انتہائی موثر انداز میں حمایت کر رہی ہیں۔ مروان رات کی تاریکی میں محل سے نکلا اور عائشہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے زور دیا کہ وہ یوں نہیں جا سکتیں۔ اس کے بیان کا لب لباب یہ تھا کہ عائشہ نے اپنی تقاریر اور خطوط سے یہ حالات

پیدا کرنے میں حصہ ڈالا تھا، اب دوسروں کے ساتھ یہ ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مدینہ میں ہی ٹھہریں اور مسئلے کا حل تلاش کریں۔ اگر عثمان نے انہیں 'لچے لفنگوں کو پناہ دینے' کا طعنہ دیا تھا تو یہ ان کے حصے پر غلطی تھی۔ عثمان کو اس وقت عائشہ کے اثر ورسوخ کی اشد ضرورت ہے اور اس سے پہلے کہ معاملات ہاتھ سے پوری طرح نکل جائیں، عائشہ آگے بڑھیں اور اپنا کردار ادا کریں۔

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ مروان نے عائشہ سے رجوع کرنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اگر خلیفہ کا دست راست چند ہفتے پہلے اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر ان کی طرف چلا آتا تو وہ یقیناً کچھ نہ کچھ کر ہی لیتیں۔ وہ اس وقت اسے لعن طعن کرتیں اور پھر جو ہو سکتا، کر گزرتیں۔ مسئلے کو حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتیں بلکہ اپنے لیے بھی کوئی نہ کوئی راہ نکال لاتیں۔ لیکن اب کرنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

یہ حال دیکھ کر مروان آپے سے باہر ہو گیا اور چلانے لگا۔ اس نے عائشہ پر الزام لگایا، 'تم ملک کو یوں فتنے میں جھونک کر اب الٹے قدم بھاگ رہی ہو؟' عائشہ نے اس کے الزام کے جواب میں غصے سے کہا، 'اللہ کرے تم اور تمہارا وہ چچا زاد، جس نے تم پر اعتبار کیا۔۔۔ دونوں ہی کے پاؤں میں چکی کے باٹ باندھے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو میں اپنے ہاتھوں سے تم دونوں کو سمندر کی تہہ میں دفنا کر آؤں گی'۔ یہ کہہ کر انہوں نے رخصت لی اور مکہ روانہ ہو گئیں۔

خاتمے کا آغاز ایک افواہ سے ہوا۔ باغیوں میں یہ بات پھیل گئی کہ محاصر خلیفہ کی مدد کے لیے شام کے گورنر کی جانب سے روانہ کی گئی کمک راستے میں ہے اور جلد ہی مدینہ پہنچ جائے گی۔ یہ کمک کبھی نہیں آئی اور کوئی نہیں جانتا کہ شام کے گورنر کو کبھی خلیفہ کی جانب سے کمک بھجوانے کا کوئی حکم بھی دیا گیا تھا یا نہیں؟ اور اگر گورنر کو یہ حکم ملا بھی تھا تو اس نے اس کو نظر انداز کر دیا تھا، کیونکہ یہ کمک کبھی مدینہ نہیں پہنچی اور اس کے اجراء کا تاریخ میں بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہر دو صورت، اگر شام سے کمک روانہ بھی ہوتی تو یہ بے سود تھا۔ بلکہ اس خبر یا کہیے افواہ سے تو جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ قصہ تمام ہو گیا۔ افواہ نے اپنا کام کر دکھایا اور انجام آن پہنچا۔

حتمی جھڑپ میں پہلی موت، محمد ﷺ کے ایک دیرینہ مگر عمر رسیدہ ساتھی کی ہوئی۔ وہ بیسا کھیوں کے سہارے چلتے ہوئے آگے آئے اور محاصرے کی حد میں داخل ہو گئے۔ وہ اپنے تئیں مفاہمت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے چلا کر عثمان کو آواز دی اور کہا کہ وہ بالکونی پر نکل کر خلافت سے علیحدگی کا اعلان کریں۔ عثمان کی بجائے اندر سے مروان کا ایک آدمی نکلا اور اس نے دور سے نشانہ باندھ کر اس عمر رسیدہ بزرگ کو پتھر دے مارا۔ یہ پتھر ان کے سر پر لگا اور وہ موقع پر ہلاک ہو گئے۔ یہ شخص جس نے پتھر مارا تھا، بعد میں بلک بلک کر روتا ہوا پایا گیا۔ دھاڑیں مارتا اور کہتا، 'اللہ، اے اللہ! میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے لوگوں کے بیچ لڑائی شروع کروائی'۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا یہ اس شخص کا انفرادی فعل تھا یا اس نے مروان کے حکم پر ایسا کیا تھا؟

تاریخ میں اس روز کو 'محل کا دن' کے نام سے یاد کیا گیا ہے حالانکہ ساری کاروائی بمشکل ایک گھنٹے کے اندر مکمل کر لی گئی تھی۔ محل کے محافظوں کی تعداد باغیوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ جب مروان اور علی کے بڑے بیٹے حسن زخمی ہو گئے تو باقی محافظ پیچھے ہٹ کر بھاگ نکلے۔ راستہ صاف ہو گیا تو باغیوں کا ایک چھوٹا گروہ، جس کی قیادت محمد بن ابو بکر کے ہاتھ میں تھی، موقع دیکھ کر محل میں داخل ہو گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر عثمان کے ذاتی رہائشی کمرے میں پہنچ گئے جہاں اس وقت عثمان اور ان کی شامی بیوی نائلہ موجود تھے۔

بزرگ خلیفہ عثمان غیر مسلح تھے اور فرش پر بیٹھے چرمی کاغذ پر تحریر شدہ قرآن کے ایک نسخے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ قرآن کا یہی نسخہ بعد ازاں حوالے کے طور پر استعمال کیا جائے گا اور پوری مسلم دنیا میں قرآن کی یہی حالت اور اس کی ترتیب مستند تسلیم کی جائے گی۔ باغیوں کا مسلح گروہ کمرے میں داخل ہو کر ان کے سر پر آن پہنچا مگر وہ بدستور اطمینان سے بیٹھے، قرآن کا مطالعہ کرتے رہے جیسے یہ لازوال الہامی نسخہ، ان کی حفاظت کرتے ہوئے فانی انسانوں کی تلواروں کے وار سے بچا لے گا۔ شاید عثمان کا یہی اطمینان اور یوں باغیوں کو نظر انداز کر کے مطالعے میں مشغولیت دیکھ کر محمد بن ابو بکر کو طیش آ گیا۔ عثمان ابھی بھی، جب کہ یہ لوگ ان کے سر پر آن پہنچے تھے، خود کو ناقابل تسخیر سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ دنیاوی

طاقتوں کے ضرر سے محفوظ ہیں۔ وہ مبرا ہیں؟ حالانکہ صاف طور پر وہ ایک انتہائی خطرناک حالت میں گھر چکے تھے۔ یا شاید شدت پسندی نے باغیوں کے ذہنوں میں اب تک اپنے قدم اس قدر مضبوطی سے جما لیے تھے کہ اب تشدد اور مار دھاڑ، خلیفہ پر حملہ مبرم ہو چکا تھا۔ اس کا کوئی علاج نہ تھا، گویا یہ بس ایک کام تھا۔ ان کا سامنا گریز ناپذیر سے تھا۔

محمد بن ابو بکر نے پہلا وار کیا۔ اسلام کے پہلے خلیفہ ابو بکر کا بیٹا، تیسرے خلیفہ کے قاتلوں میں سب سے آگے تھا۔ خنجر کا تیز وار جو عثمان کی پیشانی کو چیرتا ہوا نکل گیا اور خون کا فوارہ پھوٹ گیا۔ خون دیکھتے ہی دوسرے بھی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ عثمان اپنی پشت پر گر پڑے اور باغی ان کے سینے پر چڑھ گئے۔ کئی خنجروں سے پہلے ایک، دوسرا اور پھر تیسرا حملہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پے در پے وار ہونے لگے اور چند منٹوں کے اندر اسلام کے تیسرے خلیفہ عثمان کا کام تمام ہو گیا۔ خون کے چھینٹے دیواروں، قالین اور سامنے پڑے رحل پر سجے قران کے صفحات پر بھی پڑے۔ یہ اس قدر عجیب و غریب، بے حرمتی کا منظر رہا ہو گا کہ آج بھی اس کا تصور کریں تو عثمان خون کے چھینٹے پوری تاریخ اسلام پر اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ منظر اسلامی تاریخ کے کونے کھدرے تک ہولناکی پھیلا دے گا اور یہ منظر آج بھی اور آنے والے وقت کے آخری لمحے تک شیعہ اور سنی سمیت تمام مسلمانوں کا پیچھا کرے گا۔ اگرچہ عثمان کی جان بہت پہلے نکل چکی تھی مگر کمرے میں ہیجان بھرا ہوا تھا۔ قاتل دیر تک ان کے مردہ جسم میں خنجر گھونپتے رہے۔

نائلہ نے یہ منظر دیکھا تو وہ دوڑ کر عثمان کی جانب لپکیں۔ وہ قاتلوں کو خدا اور رسول کے واسطے دے کر روکنے کی کوشش کرنے لگیں کہ کم از کم لاشے کی بے حرمتی نہ کریں۔ وہ ہاتھ جوڑے خون میں لت پت عثمان کی میت پر گر پڑیں اور ایسے میں ایک جانب سے خنجر لہرایا اور نائلہ کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کاٹتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ وہ درد سے چیخ اٹھیں۔ نائلہ کی چیخ اس قدر تیز اور دل خراش تھی کہ کٹے ہوئے ہاتھ سے نکلتے ہوئے خون نے سر پر جھکے قاتلوں کے منہ رنگے اور خطرے کی سیٹی جیسی، کان چیرتی ہوئی نائلہ کی چیخ ان کے کانوں میں پڑی تو تب جا کر انہیں روک لگی۔ وہ سب ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ محمد بن ابو بکر نے عثمان پر پہلا وار کیا لیکن ان کے خنجر نے جان ضبط کرنے والی ضرب

نہیں لگائی۔ اس بات کا کبھی پتہ نہیں چل سکے گا کہ عثمان کی جان کس کے خنجر نے لی، قاتلوں میں سے کون تھا جس کے ہاتھ نے انہیں ہلاک کیا۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے۔ اصل سوال جو ہمیشہ ہی اسلام کا پیچھا کرتا رہے گا، وہ یہ ہے کہ آخر اس ہاتھ، خنجر کو کون لایا تھا؟ اس سب کے پیچھے کون تھا؟ یا، اس سب کے پیچھے کون نہیں تھا؟ بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے بعد ازاں تاریخ میں درج کروایا کہ، 'یہ ایسی تلوار تھی جسے عائشہ نے میان سے نکالا، طلحہ نے دھار تیز کی اور علی نے اسے زہر میں تر کیا'۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ سب مروان کی کارستانی تھی۔ مروان نے ہی تلوار کھینچی، اسی نے دھار تیز کی اور یہی وہ شخص ہے جس نے اسے زہر میں ڈبو کر قاتلوں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جن کا ماننا تھا کہ یہ مدینہ سے دور، شام میں بیٹھے طاقتور گورنر معاویہ کا کیا دھرا تھا۔ معاویہ کے بارے افواہ تھی کہ انہوں نے کمک بھجوانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ امداد کبھی نہیں پہنچی۔

اس تمام قصے میں صرف ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تیسرے خلیفہ عثمان کے قتل میں معلوم اور نامعلوم، سب ہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ قاتلوں کے ارادے ایک ہی وقت میں نیک اور بد تھے۔

قتل کے وقت عثمان نے جو قمیض پہن رکھی تھی، وہ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور خون سے تر تھی۔ عثمان تو مر گئے مگر ان کی یہ قمیض اب ایک لمبے عرصے تک زندہ رہے گی۔ قتل کے بعد کسی نے، کوئی نہیں جانتا کہ کس نے، مگر اس کی اہمیت کو سمجھتے بوجھتے، دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکال لایا اور اس میں نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور چند دوسری باقیات لپیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اگلی صبح، مدینہ اور اس کے مضافات میں عثمان کے قتل کی خبر کے جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور پتہ چلا کہ علی نے نئے خلیفہ کی حیثیت سے منصب سنبھال لیا ہے۔ ایسے میں، ایک چھوٹا سا قافلہ مدینہ سے نکل کر ایک سفر پر گامزن تھا۔ اس قافلے کا رخ ستر میل دور دمشق کے شہر کی جانب تھا اور ایک گھوڑے کی زین میں کسے ایک عام سے تھیلے میں کچھ سامان بھرا ہوا تھا۔ یہ سامان، عثمان کی خون سے آلودہ تار تار قمیض اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں تھیں۔

کیا اس قافلے کو روانہ کرنے والی عثمان کی شامی بیوی، نائلہ تھیں؟ یا مروان تھا؟ یا ام حبیبہ تھیں جو محمد

ﷺ کی بیواؤں میں واحد اموی تھیں اور شام کے گورنر معاویہ کی بہن تھیں؟ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کا مقصد واضح تھا۔ یہ ڈراؤنی اور مہیب باقیات بالآخر انتقام کا تقاضا کرنے کے لیے انتہائی موثر ہتھیار ثابت ہوں گی۔ جب یہ باقیات دمشق پہنچیں اور معاویہ کو پیش کی گئیں تو حکم جاری ہوا کہ عثمان کی قمیض اور کٹی ہوئی انگلیوں کو دمشق کی مرکزی مسجد میں نمایاں جگہ پر نمائش پر رکھ دیا جائے۔ یہ باقیات اگلے ایک برس تک یہیں عوام کی نظروں کے سامنے پڑی رہیں گی۔

اس زمانے کے ایک شامی تاریخ دان نے درج کر رکھا ہے، 'ہر روز قمیض کو منبر پر سجا دیا جاتا۔ بعض اوقات اسے منبر پر بیٹھنے کی جگہ پر بچھا دیا جاتا اور کبھی کبھار پورے منبر کو اس سے ڈھک دیا جاتا۔ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں قمیض کے کف سے بندھی ہوتی تھیں۔ ان میں سے دو انگلیاں پوری طرح جوڑوں سمیت سلامت اور ہتھیلی کے ایک حصے سے جڑی ہوئی تھیں۔ دوسری دو انگلیاں کٹ کر علیحدہ ہو گئی تھیں اور آدھا انگوٹھا تھا۔ لوگ روز آتے اور ان باقیات کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگتے۔ کئی شامی فوجیوں نے قسم اٹھائی کہ جب تک وہ عثمان کے قاتلوں کو قتل نہ کر دیں یا اگر ان کے مقصد کے اس راستے میں کوئی رکاوٹ ڈالے، اسے بھی قتل نہ کر دیں، وہ اپنی عورتوں کے ساتھ شب بسری نہیں کریں گے۔'

مدینہ میں عثمان کو انتہائی جلدی اور خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ انہیں ابو بکر اور عمر کی طرح محمد ﷺ کے پہلو میں نہیں بلکہ نخلستان کے مرکزی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اگر اس موقع پر کسی نے ماتم کیا یا سوگ منایا تو وہ ذاتی سطح پر اپنے گھر میں محدود رہا۔ عوامی سطح پر تو مدینہ میں نسبتاً سکون کی فضا تھی۔ مدینہ کے لوگ، باغیوں کی قیادت میں علی کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اپنا اگلا رہنما مقرر کر دیا۔ ویسے بھی، ان حالات میں اب مدینہ میں علی کے سوا سربراہی کے لائق کوئی دوسرا بچا ہی نہیں تھا۔ وہ شخص جو ہمیشہ سے حق رہبری پر اصرار کرتا آیا تھا، بالآخر اسے وراثت مل ہی گئی۔ مدینہ کے لوگوں کو بالآخر ان کا من چاہا خلیفہ مل گیا تھا۔ عوامی سطح پر نخلستان کی فضا میں اسی وجہ سے طمانیت بھری تھی۔

16 جون، 656ء کے دن، لوگ جوق در جوق مسجد میں جمع ہو کر علی کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ بالآخر 'خاک اور خار' کے سال تمام ہو گئے۔ یہ نہ صرف علی بلکہ ان کے حامیوں اور امت کے دوسرے

لوگوں کے لیے بھی ان کے تیئں مشکل وقت کا اختتام تھا۔

لیکن انہیں کون بتاتا کہ خاک اور خار سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ منہ میں بھری مٹی اتنی آسانی سے کہاں ہضم ہوتی ہے؟ کانٹوں سے لگے زخم، ناسور بن جائیں تو پھر کہاں بھرتے ہیں؟ لوگوں کو بالکل خبر نہیں تھی کہ علی کا دور صرف پانچ سال پر مشتمل ہو گا۔ اس وقت تو وہ خوشیاں منا رہے تھے، ہر طرف نئے رہنما کا خیر مقدم جاری تھا۔ علی نے اپنے لیے خلیفہ کا خطاب پسند نہیں کیا بلکہ امیر المومنین ہی کہلوایا۔ کہنے لگے کہ خلیفہ صرف اور صرف ابو بکر اور عمر کا خطاب تھا۔ ان کے بعد تو بنو امیہ نے اس خطاب کو بد عنوانی اور اقربا پروری سے آلودہ کر دیا تھا۔ بجائے اس کے، وہ اپنے لیے ایک نیا خطاب، 'امام' پسند کریں گے۔ امام کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو پہل کرے، آگے کھڑا ہو۔ ایک طرف تو یہ خطاب نہایت عاجزانہ اور انکسار سے پُر تھا کہ یہ وہ شخص ہے جو نماز میں جماعت کی رہبری کرتا ہے۔ مگر دوسری طرف امام سے مراد یہ تھی کہ علی تمام مسلمانوں کے روحانی اور سیاسی رہنما ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ آگے چل کر 'خلیفہ' اور 'امام' کے خطابات کے بیچ، سیاست اور دینیات کی ایک پوری دنیا جگہ گھیرنے کو تیار کھڑی ہو گی۔

علی کی منزل یہ تھی کہ وہ محمد ﷺ کے بعد واقعی وہ رہنما ثابت ہو سکتے تھے، جنہیں شیعہ اور سنی دونوں کی ہی حمایت حاصل ہوتی اور وہ اسلام کے واقعی رہنما قرار پاتے۔ اگرچہ سنی علی کی اسی طرح عزت و حرمت کرتے ہیں جیسا کہ وہ ان سے پہلے تین خلفاء کے قائل ہیں اور وہ انہیں چوتھا خلیفہ گردانتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ چار، خلفاء راشدین کہلاتے ہیں۔ یعنی سیدھی راہ پر، راہنمائی کے اہل ہیں۔ لیکن شیعہ خلافت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ علی کو بھی خلیفہ نہیں مانتے اور ان سے پہلے تین خلفاء کا حق اختیار تو ان کے نزدیک وجود ہی نہیں رکھتا۔ ان کے مطابق علی تب، آج اور ہر زمانے میں محمد ﷺ کے جائز اور واقعی جانشین رہیں گے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے روحانی رہبر ہیں جن کا علم، فہم اور فراست ان کے بعد ان کے فرزندوں حسن اور حسین علیہ السلام کو منتقل ہوا تاکہ وہ آگے چل کر اپنی اولاد کو یہ حق اور خدائی دین منتقل کر سکیں۔ علی بارہ اماموں میں پہلے امام تھے جو محمد ﷺ اور فاطمہ کے ساتھ، ان کا گھرانہ شمار ہوتے ہیں۔ صرف، اور صرف یہی لوگ ہیں جو واقعی محمد ﷺ کا گھرانہ ہیں۔

جون کی اس دوپہر، جب سب لوگ قطاروں میں کھڑے علی کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، اس وقت کسی کے ذہن میں شیعہ اور سنی کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی باری آنے پر آگے بڑھتا، علی کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر، بازو جوڑتا اور خدا کے حضور حلف اٹھاتا کہ علی کا دوست اس کا دوست ہے اور علی کا دشمن بھی اس کا دشمن ہے۔ لوگوں میں عام خیال یہ تھا کہ آخر کار، تقسیم اور پھوٹ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ علی وہ شخص ہیں جو دین اسلام کی حفاظت کریں گے اور امت کو یکجا کر دیں گے۔ اس کے بعد لالچ نہیں رہے گی، کوئی شخص اپنے آپ کو دوسرے سے برتر نہیں سمجھے گا، سرفرازی اور برگزیدگی کا دعویٰ نہیں کرے گا اور بدعنوانی کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ بنو امیہ نے جو جال بچھایا تھا، ان کی تمام تر چالیں اب ناکام کر دی جائیں گی۔ مستقبل میں ان کی طرف سے کی جانے والی ایسی کوئی بھی کوشش دوبارہ ہوئی تو امت ان سے نبٹ لے گی، لوگ اپنے ہاتھ سے ایسی کسی بھی سازش کا خود گلا گھونٹ دیں گے۔ ایک نئی صبح طلوع ہو چکی تھی، ایک نئے دور کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ علی کی رہنمائی میں، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر پیغمبر کے دکھائے سچے راستے پر گامزن ہو جائیں گے۔ انہیں کوئی دوبارہ بھٹکا نہیں سکے گا۔

اسی احساس کے تحت یہاں مدینہ میں جشن کا سماں تھا۔ ڈھول بج رہے تھے اور بچے یہاں وہاں کھیل کود اور رقص کرتے پھرتے تھے۔ عورتوں نے جوش میں آکر شور مچانا شروع کیا تو کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ فضا میں ایک خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ جب مدینہ میں یہ سب ہو رہا تھا، وہاں عثمان کی خون آلودہ قمیص اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق میں مرکزی مسجد کے منبر پر نمائش کے لیے پہنچائی جا رہی تھیں۔ عائشہ کا اب مکہ میں قیام تھا، وہ آگے کی حکمت عملی پر غور کر رہی تھیں۔

باب 8

جوں ہی کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو عائشہ سمجھ گئیں کہ یہ براشگون ہے۔ آخر کتوں کا بھونکنا براشگون کیسے ہو سکتا ہے؟ کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں۔ صحرا میں شام ہوتے ہی جب بھیڑیے، لگڑ بگڑ اور لومڑیاں گہری ہوتی تاریکی میں شکار کے لیے نکلتے تو پالتو اور جنگلی کتے بھونکا ہی کرتے تھے۔ کتوں کے بھونکنے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اصل بات تو اس مقام سے متعلق تھی جہاں کتے بھونک رہے تھے۔ عائشہ کو فوراً ہی بے چینی شروع ہو گئی۔ یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے محمد ﷺ نے اپنی بیویوں کو بہت پہلے خبردار کر دیا تھا۔

عائشہ کی فوج نے مکہ اور عراق کے دور دراز نشیبی علاقے میں چھوٹے سے نخلستان میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یہاں رات بسر کرنے کا ارادہ تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ معمول کے مطابق کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ عائشہ نے پوچھا، 'یہ کونسی جگہ ہے؟' جواب سن کر وہ سخت خوفزدہ ہو گئیں۔ یہ حوئب کا چشمہ تھا۔

'اناللہ واناالیہ راجعون'، عائشہ چلائیں۔ یہ کلمہ قران کی دوسری سورت کی ایک آیت کا آدھا حصہ ہے جو عام طور پر مسلمان نقصان، موت، موت کے منہ میں یا بری خبر سن کر ادا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، 'ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں'۔ عائشہ کی حالت دیکھ کر سب کو پریشانی لاحق ہوئی اور لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ 'کیا تم دیکھتے نہیں؟' وہ التجائی انداز میں بولیں، 'یہ کتے مجھ پر بھونک رہے ہیں۔ پیغمبر نے ایک دفعہ اپنی تمام بیویوں کو نہایت پراسرار طریقے سے مخاطب کر کے کہا تھا، 'اے کاش میں جان سکتا کہ تم میں سے کس پر حوئب کے کتے بھونکیں گے'۔ وہ دیوانہ وار کہتی جاتیں، 'افسوس، صد افسوس! وہ میں ہوں۔ مجھے واپس لے جاؤ۔ مجھے واپس لے چلو!'

آخر عائشہ نے ایسا کیا کر دیا تھا؟ کیا چیز تھی جو انہیں اب یہاں پہنچ کر پریشان کر رہی تھی؟ وہ ایک منظم فوج کو لیے عراق کے میدانوں کی خاک کیوں چھان رہی تھیں؟ پچھلے چند مہینوں میں یہ پہلی بار تھی کہ ان

کے دل و دماغ میں شک گھر کر گیا تھا اور اب جب کہ وہ یہاں تک پہنچ ہی چکی تھیں، انہیں اپنا اندر مفلوج ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

جب عثمان کی موت کی خبر پہنچی تو وہ اس وقت مکہ میں ہی تھیں۔ انہیں ہر گز یقین نہ آیا۔ پتہ چلا کہ ان کے سوتیلے بھائی محمد بن ابو بکر قاتلوں میں شامل تھا اور سب سے بد تر بات یہ تھی کہ لوگوں نے علی کو اگلی ہی صبح آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا؟ سننے میں آیا تھا کہ مدینہ میں خوشی کے ڈھول بجائے گئے ہیں۔ ہر طرف منادی کی گئی اور علی کو انتہائی جوش و خروش کے ساتھ 'امیر المومنین' چن لیا گیا ہے۔ اگرچہ عائشہ نے عثمان کو 'سٹھیایا ہوا بڈھا' قرار دیا تھا یا وہ محمد ﷺ کی چپل اٹھائے مسجد میں چلی آئی تھیں اور کھلے عام عثمان پر محمد ﷺ کی سنت سے رو گردانی کا الزام لگایا تھا۔ یہ بھی درست تھا کہ انہوں نے خط لکھ کر لوگوں کو خلیفہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ پھر یہ بھی کہ مدینہ سے نکلتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ان کو موقع ملے تو وہ عثمان کے پیروں سے چکی کے باٹ باندھ کر سمندر میں ڈبو آئیں۔ وہ عثمان کو سبق ضرور سکھانا چاہتی تھیں لیکن ان کے اقوال و افعال کا ہر گز مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یوں قتل کر دیے جائیں۔ ہر گز نہیں۔ عثمان کا قتل تو رہا ایک طرف، بھلا وہ کب چاہتی تھیں کہ بعد ان کے خلافت کی باگ ڈور علی کے ہاتھ میں آجائے؟

عثمان کا قتل اور پھر علی کی خلافت، عائشہ کو دونوں ہی باتوں سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ غصے سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ بلکہ بوکھلا گئیں۔ اس لیے بغیر سوچے سمجھے سیدھا کعبہ کے احاطے میں جا پہنچیں۔ کالے پتھر کے پہلو میں کھڑے ہو کر اونچی آواز میں، تاکہ سب سن لیں انصاف کے تقاضے میں تقریر کرنے لگیں،

'مکہ کے لوگو!' وہ منادی کرتے ہوئے بولیں، 'بلوائیوں نے، چھاؤنیوں سے آئے بدمعاشوں نے، جاہل اور اجڈ بدوؤں اور خارجی غلاموں نے مل کر سازش رچائی ہے۔ ان ظالموں نے نہ صرف یہ کہ مقدس خون کی حرمت پامال کی ہے بلکہ وہ تو شہر مدینہ کی حرمت اور تحریم کی خلاف ورزی کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔ یہ ایک انتہائی قبیح اور کریہہ جرم ہے۔ انہوں نے ظلم کیا ہے!' یہ سنتے ہی پورا مجمع جوش سے پاگل ہو گیا۔ لوگ اس ظلم عظیم کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ اب عائشہ فیصلہ کن انداز میں تقریر کو جاری رکھے ہوئے تھیں، 'اللہ کی قسم! عثمان کی انگلی کی پور ایسی دنیا سے بہتر ہے جہاں ان کے قاتلوں جیسے لوگ بھرے

ہوں۔اے لوگو! باہر نکلو اور عثمان کے خون کا بدلہ لو۔یہی امت کی طاقت ہے۔یہی اسلام کی خدمت ہے!'

عائشہ کی شعلہ بیانی پر مجمع میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔چاروں طرف ان کے انصاف کے حق میں تقریر پر نعرے بازی ہونے لگی اور لوگ یک زبان ہو کر چلانے لگے، 'عثمان کا انتقام لو! عثمان کا انتقام لو!'۔لوگوں کے جذبات اس لیے بھی آسمان کو چھو رہے تھے کہ اگرام المومنین، یعنی ماننے والوں کی ماں انصاف کی پیروی میں اپنے سوتیلے بھائی کے جرائم پر اسے موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار ہے تو اللہ کی قسم، ہر شخص ان کا اس مقصد میں ساتھ دے گا۔اگر وہ عدل کو رشتہ داری سے مقدم سمجھتی ہیں، اگر ان کے نزدیک راست بازی خون کے بندھنوں سے مقدم ہے تو بخدا ان کا طریق بھی یہی ہو گا۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے نام پر وہ، یعنی مکہ کے بیٹے عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے اور مدینہ کے باغیوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔

عائشہ کی شعلہ بیانی پر مجمع میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔چاروں طرف ان کے انصاف کے حق میں تقریر پر نعرے بازی ہونے لگی اور لوگ یک زبان ہو کر چلانے لگے، 'عثمان کا انتقام لو! عثمان کا انتقام لو!'۔لوگوں کے جذبات اس لیے بھی آسمان کو چھو رہے تھے کہ اگرام المومنین، یعنی ماننے والوں کی ماں انصاف کی پیروی میں اپنے سوتیلے بھائی کے جرائم پر اسے موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار ہے تو اللہ کی قسم، ہر شخص ان کا اس مقصد میں ساتھ دے گا۔اگر وہ عدل کو رشتہ داری سے مقدم سمجھتی ہیں، اگر ان کے نزدیک راست بازی خون کے بندھنوں سے مقدم ہے تو بخدا ان کا طریق بھی یہی ہو گا۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے نام پر وہ، یعنی مکہ کے بیٹے عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے اور مدینہ کے باغیوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔

عائشہ نے کبھی رک کر ان محرکات پر غور نہیں کیا جس کے نتائج آگے چل کر مسلمانوں میں باقاعدہ خانہ جنگی کے آغاز کی صورت برآمد ہوں گے۔انہوں نے کبھی ان نتائج کی پرواہ نہیں کی۔وہ بلاشبہ فن خطابت میں یکتا تھیں لیکن ایک لمحے کو بھی انہوں نے خود سے یہ سوال نہیں پوچھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ کیا وہ عثمان کو مشکل میں گھرا، تن تنہا چھوڑ کر مدینہ سے نکل آنے پر خود کو ان کے قتل کا ذمہ دار

سمجھ کر ایسا کر رہی تھیں؟ یا اب ان کے اس ہیجان کی اصل وجہ علی تھے؟ شاید وہ علی کو چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے قبول نہیں کر پا رہی تھیں؟ یہ سوالات ان کے ذہن میں تب کوندے جب وہ حوائب کے چشمے تک پہنچ آئیں مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کعبہ کے احاطے میں سیاہ پتھر کے پہلو میں کی گئی تقریر کے نتیجے میں اتناز بردست رد عمل آیا تھا کہ وہ اپنے تئیں یہی سمجھنے لگیں کہ انصاف کے حصول میں واحد راستہ یہی ہے۔ وہ اس وقت ہیجان میں خود کو ہمیشہ سے زیادہ راہ راست پر گامزن دیکھ رہی تھیں۔

مرنے کے بعد عثمان کو بالآخر وہ جاہ و جلال، بڑائی اور عظمت مل ہی گئی تھی جو بعض لوگ الزام لگاتے آئے ہیں کہ زندگی میں وہ کبھی اس کے اہل ہی نہیں رہے۔ مکہ کے باسیوں کا موقف تھا کہ وہ علی کے پڑوس میں انتہائی بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔ علی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی موت کا ذمہ دار کون ہے۔ بلکہ صرف علی ہی نہیں، مدینہ کا ہر شخص جانتا تھا کہ قاتل کون ہے؟ لیکن اس کے باوجود اس گھناؤنے جرم کے ذمہ داروں کو ابھی تک انصاف کے کٹہرے میں لانے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ انہیں تو فوراً سزا ملنی چاہیے تھی مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا بلکہ انہیں تو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رائے عامہ یہ بن گئی کہ علی نے قاتلوں کو پناہ دے رکھی ہے اور اس طرح وہ بھی اس جرم میں اتنے ہی سزاوار ہیں جتنا خود قاتل تھے۔ بعض لوگوں نے تو یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ دراصل یہ علی ہی تھے جنہوں نے قاتلوں کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ انہیں شہ دلائی تھی، جب ہی تو وہ ہر حد سے گزر گئے۔ مکہ میں اس بابت ہیجان کی کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں علی کو ہر چیز کے لیے مورد الزام ٹھہرایا جا رہا تھا، وہاں کسی ایک شخص نے بھی مروان کی طرف انگلی نہیں اٹھائی۔ مروان عثمان کے قتل کے بعد مدینہ سے فرار ہو کر مکہ پہنچ چکا تھا۔ یہاں اس کا استقبال ایک ہیرو کی طرح کیا گیا تھا۔ وہ خلیفہ کے دفاع میں آخری جھڑپ کے نتیجے میں آنے والے زخم دکھاتا پھرتا اور لوگ اس کی مدح سرائی کرتے۔ مروان نے اعلان کی صورت میں ایک شعر بھی کہا جو مکہ میں خاصا مقبول ہوا۔ وہ شعر کچھ یوں تھا کہ، 'علی علیہ السلام! اگرچہ تم نے مقتول کو، خود اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا/ لیکن یقیناً تم نے ہی، چوری چھپے یہ کام ضرور کروایا ہے'۔

پیشہ ور شاعروں نے ہمیشہ کی طرح یہ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ فوراً ہی اپنے کام پر لگ گئے۔ 'تمہارے اپنوں نے اے علی علیہ السلام! پرائیوں کی طرح عثمان کو مار ڈالا۔ اس کے خون پر ان کا کوئی، سچ کہو حق تو نہیں تھا'۔ ایک شاعر نے کہا کہ اس فعل کی اسلامی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ 'جان لو اے علی علیہ السلام! تم ہی ان کے سردار ہو، تم ہی قیمت چکاؤ گے'۔ آگے چل کر لکھا ہے، 'اور یقیناً، تمہیں ہی، کیونکہ تم سردار ہو، قیمت تو چکانی ہی پڑے گی!'۔

ابھی علی مدینہ میں پوری طرح سنبھلے بھی نہیں تھے کہ مکہ میں رائے عامہ ان کے سخت خلاف ہو چکی تھی۔ علی نے شہر کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک خط لکھا جس میں عوام الناس سے نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جب یہ خط مکہ پہنچا تو ان کے خلاف عوامی جذبات اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ جب کعبہ کے احاطے میں با آواز بلند اس خط کو پڑھ کر سنایا جا رہا تھا، چاروں طرف شور و غل اور لعنت و ملامت ہو رہی تھی۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جو خط کے مندرجات کو سن سکا ہو بلکہ سننا چاہتا ہو۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا اور شور میں کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بنو امیہ کا ایک نوجوان کعبہ کی سیڑھیاں چڑھ کر آیا اور قاصد کے ہاتھ میں سے خط چھین لیا۔ غصے میں چرمی کاغذ کو منہ میں ڈال کر اچھی طرح چبایا اور گودے کو نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

عائشہ کو انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے ایک شہر کی صورت نئی منزل مل چکی تھی۔ مگر جذبات سے بھڑکی ہوئی عوام کو اپنے ارادوں پر عمل کرنے کی اصل شہ اس وقت ملی جب عائشہ کے بہنوئی طلحہ اور زبیر بھی مدینہ چھوڑ کر یہاں پہنچ گئے۔ یہ دونوں بھی اس مختصر شوریٰ کا حصہ تھے جس نے عمر کی موت کے بعد بند کمرے میں طویل مکالمے کے بعد نئے خلیفہ، یعنی عثمان کے انتخاب میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت یہ دونوں اجلاس کی ابتداء سے ہی علی کے مخالف تھے۔ بعد ازاں علی کی ہی طرح یہ دونوں بھی عثمان کے طرز حکومت پر صدا احتجاج بلند کرتے رہے اور ان کے خلاف تحریک میں پیش پیش رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، ان کی ہرگز مرضی یہ نہیں تھی کہ جب عثمان ہٹائے جائیں تو ان کی جگہ علی خلافت سنبھال لیں۔ اگرچہ طلحہ اور زبیر ، دونوں ہی خاصے باہمت اور پر عزم ہوا کرتے تھے لیکن خاصے جاہ طلب واقع ہوئے تھے۔ یہ دونوں ہی

خلیفہ بننے کے خواہاں تھے مگر مشکل یہ تھی کہ عثمان کے خلاف ایک جان دار تحریک میں پیش پیش رہنے کے باوجود بھی وہ عوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے جو علی کو بہر حال مل چکی تھی۔اسی وجہ سے ان دونوں کے پاس اب آپس میں گٹھ جوڑ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

تو کیا ہوا اگر ان دونوں نے ابھی چند ہفتے پہلے ہی، مکہ چلے آنے سے پہلے عوام و خاص کے سامنے علی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی؟ یہاں پہنچ کر دونوں نے قسم اٹھائی کہ باغیوں نے انہیں زبردستی بیعت لینے پر مجبور کیا تھا۔ کہنے لگے کہ انہوں نے تو ایسا بے انتہا مجبوری کی حالت میں کیا تھا۔ان کا بیان کچھ یوں رقم ہے کہ مدینہ میں دندناتے، مسلح خارجیوں نے ان کے سر پر تلوار سونت کر علی سے وفاداری کا حلف لیا۔ ان کے الفاظ میں، انہوں نے تو 'مرجھائے ہوئے دل اور پر مژدہ ہاتھ' کے ساتھ بیعت لی۔یعنی انہوں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا لیا مگر دل، بے دل ہی رہے۔ منہ سے حلفیہ بیان تو دے دیا لیکن ان کا دماغ کسی صورت اس کو ماننے پر راضی نہیں تھا۔ اب سب دیکھ سکتے تھے کہ معاملات کس طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ مکہ کی فضا انتقامی خواہشات سے کثیف تھی مگر اس کے باوجود چند معدودے لوگ ایسے بھی تھے جو گاہے بگاہے خدشات کا اظہار کرتے رہتے۔ 'اس سے کچھ اچھا برآمد نہیں ہو گا'۔ایک شخص کہنے لگا۔ معاملہ جب حد سے بڑھ گیا تو اس صورتحال پر خود طلحہ کا تبصرہ تاریخ میں کچھ یوں درج ہے کہ، 'میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ آخر یہ سب کر کے ہمیں کیا ملے گا؟ بعد اس کے، ہمارے ہاتھ تو مثال ایک کتا آئے گا جو زمین پر بکھری غلاظت میں منہ مارتا پھر رہا ہو گا'۔

لیکن طلحہ اور نہ ہی زبیر کے پاس درکار حمایت پوری تھی۔ وہ اپنے بل بوتے پر کبھی بھی خلافت پر فائز ہونا تو دور کی بات، دعویٰ بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس مقصد کے لیے انہیں عائشہ کی پر زور تائید اور سہارے کی ضرورت تھی۔اب جب کہ عائشہ کی پشت پر پورا شہر مکہ تیار کھڑا تھا، ان دونوں کا کام آسان ہو گیا۔جب انہوں نے مکہ میں رخ بدلتی ہوئی فضا کو دیکھا تو وہ فی الفور مدینہ سے نکل آئے۔اب وہ مکہ پہنچ کر عائشہ کی مدد سے آنے والے دنوں میں علی پر دباؤ بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ان کا مقصد صاف تھا۔ایک ہی نکتہ تھا کہ کسی طرح علی کو خلافت چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔اچھا، اگر علی خلافت چھوڑ بھی دیں تو پھر بھلا ان

دونوں میں سے خلیفہ کون ہو گا؟ یہ سوال انہوں نے بعد کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ فی الوقت تو اہم یہ تھا کہ وہ اکٹھے ہو کر ایک ہی مقصد کے حصول کی طرف پیش قدمی کریں۔ چنانچہ وہ عائشہ کو ساتھ ملا کر، ان کے اثر و رسوخ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے علی کے خلاف انتہائی منظم اور طاقتور فوج کھڑی کر دیں گے۔ وہ مدینہ پر چڑھائی نہیں کریں گے کیونکہ یہ جگہ اب علی کی طاقت کا گڑھ بن چکی تھی۔ بجائے، وہ انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آٹھ سو میل دور عراق میں بصرہ کے مضافات میں لا کر گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بصرہ کا چناؤ اس لیے کیا گیا کہ مبینہ طور پر چھاؤنی نما اس شہر میں زبیر کو خاصی حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی عائشہ کے ہوتے انہیں شکست دینا کوئی آسان بات نہیں تھی، لیکن ضروری تھا کہ عوام کے انتقامی جذبات نہ صرف برقرار رکھے جائیں بلکہ جہاں موقع ملے، قوت میں اضافہ کیا جائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عائشہ اس لشکر کی سپہ سالار ہوں گی۔ وہ عائشہ سے کہنے لگے، 'جیسے تم نے مکہ کے لوگوں کو عملی قدم اٹھانے پر راضی کر لیا، ویسے ہی ہم بصرہ کے لوگوں کو بھی عثمان کے قاتلوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر قائل کر لیں گے'۔

عائشہ کو علی کے خلاف منظم فوجی مہم جوئی پر راضی کرنے میں قطعاً کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ عائشہ کو علی کے ہوتے، بہتری کی امید نہیں تھی۔ ہاں اگر ان کے بہنوئیوں میں سے کوئی ایک خلیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے تو پھر ظاہر ہے، ان کی وہی حیثیت بحال ہو جاتی جو کبھی ابو بکر اور عمر کے زمانے میں رہا کرتی تھی۔ وہ اس طرح، اور صرف اسی طرح طاقت اور اختیار کے دھارے میں اپنے شایان شان رتبے تک دوبارہ پہنچ سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ ایک دفعہ پھر کعبہ کے احاطے میں جا کھڑی ہوئیں اور اب دوبارہ انتہائی پر جوش تقریر کی۔ لوگوں کو عثمان کے قتل، یعنی اس ظلم اور گھناؤنے جرم کی یاد دہانی کرائی۔ اب کی بار انہوں نے صرف اس تبصرے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس ضمن میں عملی قدم اٹھانے کو کہا، 'بصرہ میں اپنے بھائیوں کے پاس جاؤ اور علی کے اختیار کی نفی کر دو۔ انہیں اس کے جرم کی خبر کرو اور عثمان کے قتل کا بدلہ لو' وہ انتہائی جذباتی انداز میں مخاطب تھیں، 'بصرہ کا رخ کرو۔۔۔ عثمان کا بدلہ لو!'۔

اور اب، جب لوگ ان کا ساتھ دیتے ہوئے، ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بصرہ کے لیے نکل کھڑے

ہوئے تھے، عائشہ آدھے راستے میں پہنچ کر چند کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے پریشان تھیں؟ مکہ کے لوگ ان کے ساتھ تھے مگر وہ خود الجھن کا شکار ہو چکی تھیں۔ کبھی عائشہ کے لیے لق و دق صحرا میں سفر خاصا رومانوی قصہ رہا کرتا تھا۔ مگر جب 'گمشدہ ہار کا واقعہ' پیش آیا تو سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ صرف حالات ہی نہیں بلکہ کئی لوگوں کے بارے ان کی سوچ بھی ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو گئی۔ تب کے صحرائی سفر اب ماضی کا قصہ بن چکے تھے۔ اس وقت عائشہ بمشکل ایک لڑکی تھیں اور مہمات کے جوکھم میں ہیجان ڈھونڈلا یا کرتی تھیں۔ مگر اب حالات اور تقاضے بدل چکے تھے۔ اب ان کی عمر چالیس کے پیٹے میں داخل ہو چکی تھی اور وہ ہزاروں کی تعداد پر مشتمل جنگجوؤں کے انتہائی منظم لشکر کی سپہ سالار تھیں۔ تب تو عائشہ مہمات کا حصہ بننے میں ایک ذرہ برابر تامل نہیں برتتی تھیں مگر آج وہ پہلی بار تذبذب کا شکار تھیں۔

کیا وہ واقعی ان جری جوان جنگجوؤں کو لڑائی میں جھونک دینا چاہتی تھیں؟ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ پلان یہ تھا کہ نوبت یہاں تک کبھی نہیں پہنچے گی۔ منصوبے کے مطابق مکہ کی یہ فوج بغیر کسی مزاحمت کے چھاؤنی نما شہر بصرہ کو اپنے ساتھ ملا لے گی۔ جب بصرہ کی چھاؤنی میں تعینات افواج بھی ساتھ آ گئیں تو اس لشکر کی تعداد اور حوصلہ بڑھ کر سوا ہو جائے گا۔ اس طرح انہیں فرات کے ساتھ نشیبی علاقے میں کوفہ کی حمایت حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بصرہ اور کوفہ کی حمایت کا مطلب یہ تھا کہ پورا عراق ان کی جھولی میں آن گرے گا۔ جب یہ ہو چکے گا تو پھر یہ عظیم لشکر معاویہ کی شامی فوجوں کے ساتھ جا ملیں گی۔ شام کے شہر دمشق میں پہلے ہی عثمان کی خون سے آلود تار تار قمیض اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دیکھ کر لوگ بھڑکے بیٹھے تھے۔ شام کی فوجیں صرف ایک اشارے کی منتظر تھیں۔ عراق اور شام اکٹھے ہو گئے اتنا مضبوط اتحاد تشکیل پائے گا کہ اس کے سامنے علی کے پاس گھٹنے ٹیکنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں بچے گا۔ جیسے اس سے پہلے وہ تین دفعہ خلافت سنبھالنے سے روکے گئے تھے، اب کی بار پھر پیچھے دھکیل دیے جائیں گے۔ جیسا ہوتا آیا ہے، ویسا ہی ہو گا۔ اصل پلان تو یہ تھا۔ اگر پلان یہی تھا تو پھر کتے کیوں بھونک رہے تھے؟ یہ چپ کیوں نہیں کر جاتے؟

چوبیس گھنٹے گزر گئے اور عائشہ بدستور آگے بڑھنے سے انکاری تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ پر جم کر ایسے بیٹھی

تھیں جیسے انہیں بد شگونی کا لقوہ مار گیا ہو۔ طلحہ اور زبیر نے اپنے تئیں انہیں منانے کی بہتیری کوشش کر لی۔ جو ممکن تھا کر کے دیکھ لیا مگر سب بے سود تھا۔ کہا کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں۔ بھلا وہ مسلسل کیسے بھونک سکتے ہیں؟ اس بات پر تو عائشہ نے دونوں کو بے نقط سنا دیں۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو عائشہ سے کہنے لگے، 'تم توہم پرستی کا شکار ہو گئیں؟ توہم پرستی کی تو اسلام میں سخت ممانعت ہے'۔ اس کے باوجود بھی وہ اڑی رہیں اور اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے سے انکار کرتی رہیں۔ پھر ان سے جھوٹ بھی بول کر دیکھ لیا۔ کہا کہ بتانے والے سے غلطی ہوئی تھی۔ یہ حوئب نہیں بلکہ کوئی اور جگہ ہے۔ مگر عائشہ اپنے دل میں اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ وہی جگہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان دونوں کے حیل بہانوں کی کوئی وقعت نہیں، بالخصوص پیغمبر کی کہی بات کے سامنے تو ان کی بات کیا، خود ان کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ اگرچہ یہ دونوں عائشہ کے بہنوئی تھے مگر ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیا یہ دونوں علی کے ہاتھ پر بیعت کر کے مکر نہیں گئے تھے؟ کیا ان دونوں نے اس طرح خود کو جھوٹا اور ناقابل اعتبار ثابت نہیں کر دیا تھا؟

اگر عائشہ اپنی بات، چھٹی حس پر اس قدر ڈٹی ہوئی تھیں تو پھر انہوں نے آخر حوئب کے کتوں پر دھیان کیوں چھوڑ دیا؟ انہوں نے واپسی پر ہی اصرار کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے پھر بھی بصرہ کی ہی راہ کیوں لی؟ شاید کتوں نے پوری قوت سے بھونکنا بند کر دیا تھا۔ یا شاید عائشہ کی بصیرت اور فہم، پس اندیشی نے بالآخر انہیں پیچھے مڑنے سے روک دیا تھا۔ غالباً اب وہ یہ سوچنے لگی تھیں کہ کتوں کا اس رات بھونکنا پیشن گوئی ضرور تھا مگر اب جب کہ انہوں نے اچھی طرح سوچ وچار کر لی ہے، وہ اب صرف اور صرف چند کتے ہی تھے جن کا کام بھونکنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی عائشہ کی سمجھ کے سب ہی قائل تھے۔ لوگ ان کی بات پر دھیان دیتے تھے، عمل کرتے تھے۔ جس طرح کی وہ شخصیت تھیں، زیادہ دیر تک کسی نیک یا بد شگون کو خود پر حاوی نہ رہنے دیتیں۔

یہ بات تو طے ہے کہ علی نے بے شک عثمان کے قاتلوں کو سزا دینے کے عوامی مطالبے کو نظر انداز کر دیا تھا، بلکہ کہیے انہوں نے بغیر کچھ کہے یا اس پر عمل کیے، مطالبہ رد کر دیا تھا۔ یہی باغی تھے جنہوں نے علی کو خلیفہ مقرر کیا تھا اور انہوں نے ہی سب سے پہلے، چھوٹتے ہی ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر دی تھی۔ باغیوں

کا سپہ سالار کوئی اور نہیں، علی کا لے پالک بیٹا تھا۔ اگرچہ علی نے عثمان کے قتل کی حمایت تو نہیں کی مگر انہوں نے اس فعل کی مذمت بھی تو نہیں کی تھی۔ علی کے الفاظ کچھ یوں درج ہیں، 'میں نہیں کہہ سکتا کہ عثمان کو حق پر قتل کیا گیا یا ان کا ناحق خون ہوا۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود بے انصاف تھے'۔ اس بیان سے واضح طور پر ایسا لگتا ہے جیسے باغیوں کو عثمان کے قتل میں علی کی حمایت حاصل تھی۔ اگر عثمان واقعی نا انصاف تھے یا انہوں نے سنت کو ترک کر دیا تھا یا وہ واقعی اسلام کی حدود کو پھلانگتے ہوئے اس کی روح کو بھلا چکے تھے تو پھر ظاہر ہے، باغیوں نے یہ گھناؤنا جرم کسی اچھے مقصد کے تحت ہی کیا ہو گا؟ ایسا کر کے گویا وہ اسلام کا دفاع کر رہے تھے؟ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ گھناؤنا جرم اور اچھا مقصد، ایک ہی جگہ پر اکٹھے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا لیکن اپنے بیان میں علی، عثمان کو باطل قرار دینے سے بس ایک قدم دوری پر اور نہایت باریک خط پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے عثمان کو مرتد نہیں کہا یا کھلم کھلا بے دین تو قرار نہیں دیا مگر ان کی دلیل صاف ہے۔ یہ وہی منطق ہے جس کے تحت ایک مرتد کو قتل کرنے پر خون بہا ادا نہیں ہوتا۔ جیسے عربوں میں مشہور ہے، 'ایسے شخص کا خون حلال ہو جاتا ہے'۔ مرتد کو قتل کرنے پر کوئی حد لاگو نہیں ہوتی اور کسی بھی قسم کی سزا کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسا کوئی بھی دعویٰ بے معنی سمجھا جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علی نے قتل کے بعد جزا و سزا پر توجہ نہیں دی۔ تلافی نہیں کی بلکہ مفاہمت کا راستہ اپنانے پر زور دیا۔ ان کے خیال میں انتقام کسی بھی صورت آگے بڑھنے کا راستہ نہیں تھا۔ ان کے مطابق اسلام کو ماضی کی بجائے مستقبل پر نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے وقت آنے پر طلحہ اور زبیر کی وفاداری کو بھی قبول کر لیا تھا۔ بھلے یہ دونوں بعد میں کہتے ہوں کہ انہوں نے ایسا بددلی اور تلوار کی نوک پر کیا تھا، علی خود بھی ان دونوں سے کچھ اتنے خوش نہیں تھے مگر بہر حال اس مرحلے پر انا کو آڑے نہیں آنے دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ علی ابھی تک مکہ اور دمشق کو تواتر سے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا صرف کہتے آ رہے تھے۔ عمومی حالات میں کوئی اور ہوتا تو شاید ابھی تک ان دونوں شہروں سے نبٹنے کے لیے فوجیں روانہ کر چکا ہوتا، جو شہر کی فصیلوں پر تیر برساتے ہوئے زبردستی انہیں خلافت کی پیروی کرنے پر مجبور کر رہی ہوتیں۔ اگر اس وقت کوئی یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید ہر قیمت پر تنازعے سے بچنے کی خواہش جاری

رہے گی یا علی ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح پیچھے ہٹ جائیں گے یا یہ کہ شاید اسے علی کمزور ہیں تو ایسا سمجھنے والے جلد ہی غلط ثابت ہوں گے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر علی واقعی خوں ریزی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے تو اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ مکہ سے ایک منظم لشکر عائشہ اور ان کے دو بہنوئیوں کی سربراہی میں بصرہ کی طرف نکل چکا ہے تو علی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اپنے لشکر کو لے کر ان کے پیچھے نکل پڑیں تاکہ انہیں کسی بھی شر انگیزی سے دور رکھا جاسکے، بر وقت روکا جاسکے۔ جلد ہی علی کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ ابھی ان کا لشکر راستے میں ہی تھا کہ وہاں بصرہ میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

عائشہ اور ان کے بہنوئیوں نے درست اندازہ لگانے میں فاش غلطی کی تھی۔ جب مکہ کا لشکر بصرہ پہنچا تو ان کا سامنا ایسے شہر سے ہوا جس کی وفاداریاں پہلے سے بٹی ہوئی تھیں اور لوگ اس پورے قصے میں ابہام کا شکار تھے۔ بصرہ کے لوگ عربوں کی آپس میں جاری کشمکش سے پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔ اب زیادہ تر کا خیال تھا کہ ان کے سروں پر یہ نئی آفت آن پڑی ہے۔ وہ بلاشک وشبہ عائشہ کی بحیثیت ام المومنین قدر کرتے تھے مگر ان کے نزدیک علی کی عزت کسی بھی دوسرے شخص سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وجہ یہ تھی کہ علی نے عثمان کے دور میں تعینات بصرہ کے بد عنوان گورنر کو عہدے سے ہٹا کر نئے گورنر کی تقرری کر دی تھی۔ یہ شخص شہر بھر میں دیانت دار اور اصول پسند مشہور تھا اور یہاں کے شہری اس کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ چنانچہ جب مکہ کا لشکر یہاں پہنچا تو ان کی توقع کے خلاف کسی نے بھی آگے بڑھ کر کھلے دل سے ان کا خیر مقدم نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ انہیں سرے سے شہر میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ نئے گورنر نے اصرار کیا کہ وہ شہر کی حدود سے باہر پڑاؤ ڈال لیں۔ اس نے کہا، 'بہتر یہ ہو گا کہ ہم علی کی آمد کا انتظار کریں'۔ تاہم عائشہ اور ان کے بہنوئی ایسا نہیں چاہتے تھے۔

اسی رات جس کے بارے روایت میں لکھا گیا ہے، 'یہ ایک تاریک اور انتہائی سرد رات تھی۔ آندھی اور بارش کا زور تھمنے میں نہیں آ رہا تھا'۔ ایسے میں طلحہ اور زبیر نے شہر پر دھاوا بول دیا۔ وہ زبردستی شہر میں داخل ہو گئے اور لوگوں سے جھڑپتے ہوئے شہر کی مسجد تک پہنچ گئے۔ ان جھڑپوں میں بیسیوں ہلاک اور

سینکڑوں زخمی ہوئے۔ صبح ہونے تک مکہ کے لشکر نے مال خانے اور اناج کے گوداموں پر قبضہ کر لیا۔ یہیں ان کا سامنا شہر کے گورنر سے ہوا۔ گورنر نے کہا، 'اللہ کی قسم اگر میرے پاس مناسب تعداد میں فوجی ہوتے تو میں تم میں سے ہر ایک کے ساتھ جنگ کرتا اور جنہیں تم نے گزشتہ رات ہلاک کیا ہے، ان کے بدل میں تم سے ایک ایک کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا۔ چونکہ تم نے ہمارے بصری بھائیوں کو ہلاک کیا ہے، تمہارا خون ہمارے لیے حلال ہو چکا ہے۔ آخر تم مسلمانوں کے قتل عام کو جائز کیسے سمجھ سکتے ہو؟ جنہیں تم نے گزشتہ رات ہلاک کیا، کیا عثمان کے قاتل وہ لوگ تھے؟ کیا تمہیں خدا کا ذرہ برابر بھی خوف نہیں ہے؟' لیکن اتنی بڑی فوج کے سامنے گورنر کی ایک نہیں چلی۔ اسے فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا اور کوڑے مارے گئے۔ سر کے بال اور داڑھی نوچ کر مونڈ دی گئی اور پابند سلاسل کر دیا گیا۔ شہر بصرہ پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ گورنر کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر عوام دب گئی اور جیسا کہ تاریخ میں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، 'بصرہ کے لوگ کولھوں کے بل پر بیٹھے' علی کی آمد کا انتظار کرنے لگے کہ وہ آئیں تو دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

علی تک یہ خبر فوراً ہی پہنچ گئی۔ خبر یہ تھی کہ شہر پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ گورنر کی سخت تذلیل کی گئی ہے اور شہر میں سینکڑوں ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ علی یہ سن کر سخت متنفر ہو گئے۔ اگرچہ طلحہ اور زبیر کو خدا کے غیض و غضب کا کوئی پاس نہیں تھا مگر وہ بدستور خوف خدا رکھتے تھے۔ 'اے اللہ، ان کو ہدایت دے اور وہ بخش دے جو انہوں نے کیا۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس دلا، انہیں ان کی برائی دکھا' علی رونے لگے، 'اور اے اللہ، مجھے ان کی طرح گمراہی میں مبتلا نہ کریو۔ مجھے مسلمانوں کا خون بہانے سے محفوظ رکھیو اور ہمیں ان جیسے لوگوں سے پناہ میں رکھیو!'۔ لیکن جہاں علی مثالیت پسند مشہور تھے، اس خبر کے بعد حقیقت پسندی سے کام لینے لگے۔ وہ امن کی دعا بھی کرتے رہے مگر اس کے ساتھ ساتھ جنگ کی تیاری پہلے سے بھی تیز کر دی۔

علی نے جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں ہی اپنے بیٹوں حسن اور حسین علیہ السلام کو شمال کی جانب کوفہ کے شہر قاصد بنا کر روانہ کیا تاکہ وہ اپنے ساتھ کمک لے کر آ سکیں۔ چند ہفتوں کے اندر ہی وہ کئی ہزار فوجیوں کا لشکر لیے علی سے بصرہ کے مقام پر آن ملے۔ اب دونوں افواج کم و بیش دس دس ہزار مسلح اور انتہائی منظم جنگجوؤں پر مشتمل تھیں۔ اگلے تین دن تک یہ دونوں دیو ہیکل لشکر بصرہ شہر سے باہر ایک تنگ گھاٹی میں

خیمے گاڑ کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔

کیا صرف طاقت دکھا دینے سے مکہ کی افواج واپس مڑ جائیں گی؟ یہ علی کا خیال تھا۔ یہی سوچ کر انہوں نے اپنی فوج سے خطاب کیا اور بعد ازاں ان کے الفاظ پر پیشن گوئی کا گماں ہو گا۔ 'میری نیت چیزوں کو درست سمت دینا ہے تا کہ امت دوبارہ سے بھائی چارے کی طرف لوٹ آئے۔ اگر مکہ کے لوگ بیعت کر لیں تو ہم امن قائم کر لیں گے۔ لیکن اگر وہ لڑائی پر بضد رہے تو یاد رکھو، یہ ایسی پھوٹ ہو گی جس کا پھر کبھی ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ تو اے لوگو! خود پر قابو رکھو۔ یاد رکھو، یہ تمہارے بھائی ہیں۔ صبر سے کام لو۔ بغیر سوچے سمجھے، پوچھے بنا کسی بھی چیز میں جلدی مت برتنا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تم آج بحث میں جیت جاؤ مگر اس کا کیا، کل کے دن تم وہی بحث کسی نئی دلیل کے ہاتھوں ہار بھی سکتے ہو!'۔

یہ ایسا بھیانک خواب تھا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کو روکنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ ایک چیز جس کا تقریباً ہر شخص کو ڈر تھا، اب وہی شے آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی سر پر آن کھڑی ہو گئی۔ یہ بلا امت میں پہلا فتنہ تھا۔

عربی ایک دقیق اور پیچ دار زبان ہے۔ باقی سامی زبانوں کی طرح یہ بھی لفاظی پر چلتی ہے۔ مثلاً تین مختلف ہم وضع اور ہم ساز الفاظ مل کر ایک ایسا لفظ بن جاتا ہے کہ جس کے بسا اوقات کئی کئی معنی نکل آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی لفظ کے بہت سارے مفہوم ہو سکتے ہیں مگر ہر مفہوم کو سیاق و سباق اور ماحول کے تحت ہی استعمال کیا جا سکتا ہے یا کہیے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال جانا مانا لفظ 'جہاد' ہے۔ جہاد کے لفظی معنی 'کوشش' یا 'سعی' کے ہیں۔ اس سے کئی مفہوم نکلتے ہیں۔ یعنی اس سے مراد اسلامی طریقے سے زندگی بسر کرنے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے، خواہشات کو قابو میں رکھنے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے اور اسلام کے دشمنوں سے نبٹنے کی مسلح کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ گویا، ایک ہی لفظ کے تین مطلب نکلتے ہیں۔

جبکہ یہ جو 'فتنہ' ہے، یہ ایک انتہائی حساس اسلامی اصطلاح ہے جو عربی زبان کے اصولوں کے مطابق انتہائی پیچیدہ لفظ بھی ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی 'گمراہی' یا 'بھٹکنے' کے ہیں۔ لیکن حساسیت کے تحت نظر

اس کے مفہوم کئی ہیں۔ جیسے اس سے مراد آزمائش یا بہکاوا، سانٹھ گانٹھ یا سرکشی، تنازعہ یا ان بن بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ ہی اس سے مراد اتھل پتھل یا اچانک تبدیلی یعنی انقلاب، افراتفری اور بد نظمی لی جاتی ہے۔ مگر سب سے عام معنوں میں یہ لفظ خانہ جنگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو جنگوں میں سب سے بدتر اور تباہ کن جنگ ہوتی ہے۔ قبیلے اور کنبے، یہاں تک کہ گھرانے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بھائی آپس میں لڑتے ہیں اور عین ممکن ہے باپ، بیٹوں کے خلاف صف آراء ہو۔ چچازاد اور سسرالی ایک دوسرے کے خلاف اسلحہ اٹھائے کھل کر آمنے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ اگرچہ معاشرہ ایک ترپال جیسا مضبوط کپڑا ہی کیوں نہ ہو، فتنہ اس کے سخت ریشوں اور سلائی کو یوں ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے کہ ایک ایک تار علیحدہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ جیسے تب ساتویں صدی میں سمجھداروں کو یہی خدشات تھے، بعد کے ہر دور اور آج بھی دین اسلام کو لاحق خطرات میں سب سے بڑا خطرہ فتنہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس قدر مہلک شے ہے کہ شاید اس نظریہ حیات، یعنی اسلام کے انتہائی کٹر دشمن بھی کبھی اس کے لیے اتنے ضرر رساں نہیں رہے ہوں گے۔

خیر یہ عجیب منظر تھا۔ دو فوجیں بصرہ شہر کے مضافات میں ریتلی زمین پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ خنجروں کی دھار تیز اور تلواروں کو چمکایا جا رہا تھا۔ چاقو سان پر لگے تھے اور ہر شخص اعصاب کو قابو میں رکھنے کی بھتیری کوشش میں جتا ہوا تھا۔ اس دوران فوجی آپس میں صرف ایک ہی نکتے پر بحث کرتے رہے کہ، یہ تو انتہا ہے۔ کیا وہ واقعی اپنے ہاتھوں سے یہ گناہ عظیم کر سکتے ہیں؟ یعنی کیا وہ دوسرے مسلمانوں کا خون کیا کریں گے؟ ہر شخص کے دل میں خوف کے سائے تھے۔ پھوٹ تو بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ اب تو وہ صاف صاف تقسیم کو اپنے سامنے پھن پھیلائے سانپ کی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس سانپ کا نام فتنہ تھا۔

میدان جنگ میں بصرہ سے تعلق رکھنے والے ایک تجربہ کار سپاہی کے الفاظ کچھ یوں رقم ہیں کہ، 'طلحہ اور زبیر نے علی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اب وہ بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ ان کو دیکھو، یہ عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے؟ یہ تو وہ ہیں جنہوں نے ہمارے بیچ پھوٹ ڈال دی ہے'۔

ایک دوسرے سپاہی نے فوراً ہی یوں جواب دیا جیسے یہ تقدیر کا لکھا ہو، 'جنگ ناگزیر ہو چکی ہے'۔ جیسے فرات کو الٹا بہانا ممکن نہیں ہے ویسے ہی اب اس جنگ کو روکنا ناممکن ہو چکا ہے۔ "لوگوں کا کیا خیال ہے کہ وہ بس منہ زبانی 'ہم ایمان لے آئے' کہیں گے اور بات ختم ہو جائے گی؟ کیا بھول گئے کہ وقت آنے پر وہ آزمائے جائیں گے؟"

لیکن کیا یہ واقعی ایمان کا امتحان تھا؟ اب تو مکہ کے فوجی بھی سوچنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ ایک جنگجو کہنے لگا، 'ہم نشیبی علاقے کے چٹیل میدانوں میں پھنس چکے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے، حتیٰ کہ صحت کے لیے بھی نہایت غیر موزوں جگہ ہے'۔ اس شخص کا یہ استعارہ حقیقی تھا کیونکہ جنوبی عراق واقعی ایسی جگہ ہے۔ یہاں پر اتنے وسیع و عریض دریائی میدان ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ پھر یہاں نہریں اور دلدلیں ہیں جس کی وجہ سے نمی بڑھ کر ہوتی ہے۔ مچھروں اور حشرات کی بہتات سے حشر نشر ہو جاتا ہے۔ حجاز کی پہاڑیوں سے تعلق رکھنے والے ان جنگجوؤں کے لیے یہ واقعی انتہائی غیر موزوں جگہ تھی۔ حجاز میں زیادہ تر تیز اور خشک ہوائیں چلتی رہتیں مگر یہاں فضا انتہائی بوجھل اور کثیف تھی۔ آسمان بھی نمی کے سبب بے رونق لگتا تھا۔ مکہ سے وہ عائشہ کی آواز پر لبیک کہہ کر یہاں تک تو آ گئے تھے مگر اب اس جگہ پر پہنچ کر انہیں لگ رہا تھا کہ یہاں ان کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ قصہ مختصر، یہ سب چکرا کر رہ گئے تھے۔

یہاں تک کہ اب طلحہ کو بھی فکر ہونے لگی تھی۔ روایت ہے کہ وہ ان دنوں میں زیادہ تر تن تنہا سوچ میں ڈوبے 'داڑھی کھجاتے' رہتے۔ یہ ایک پریشان حال شخص کی شبیہ ہے۔ طلحہ نے یہ بھی کہا، 'ہم سب دوسروں کے خلاف متحد ہو کر آہنی دیوار تھے لیکن اب ہماری مثال لوہے کے دو پہاڑوں جیسی ہو چکی ہے۔ یہ پہاڑ ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں'۔

کئی ایسے بھی تھے جو اس بات پر نالاں تھے کہ انہیں کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کے لیے دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک انتہائی قریبی ساتھی، جو اب خاصے عمر رسیدہ ہو چکے تھے، شکایت کرنے لگے 'اس سے پہلے اسلام میں کبھی ایسی صورتحال پیدا نہیں ہوئی کہ مجھے اگلا قدم اٹھانے میں مشکل پیش آئی ہو۔ لیکن یہاں تو ماجرا یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، میں آگے بڑھ رہا ہوں یا پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں'۔ ایک

قبائلی سردار نے تو میدان ہی چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فارس کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ اگر یہ دو لشکر ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی کریں۔ وہ یہ کام میرے اور میرے آدمیوں کے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں اس کی انتہائی راست سوچ کچھ یوں عیاں ہے کہ، 'میں ان دونوں فریقین میں سے کسی ایک کا حصہ بن کر دوسرے پر تیر برسانے کی بجائے ساری عمر ایک خصی غلام کی طرح سوکھے تھنوں والی بکریاں چرانے کو ترجیح دوں گا'۔

بصرہ کے لوگ کشمکش کا شکار تھے۔ انہیں سمجھ نہ آتی کہ کس کا ساتھ دیں۔ بصرہ کے ایک شخص نے دوسروں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا، 'ہر وہ شخص جو کسی بھی طرح سے اس فتنے کا حصہ بنا، یاد رکھو وہ کبھی اس داغ سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا۔ اسے کسی بھی صورت خلاصی نہیں ملے گی'۔ بصرہ کے ہی ایک دوسرے شخص نے کہا، 'اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ ہم ایسی بدتر صورتحال میں پھنس جائیں گے جو کسی کو راس نہیں آئے گی۔ اس نفرت انگیز حالت سے نکلنے کی پھر کوئی صورت نہیں ہو گی۔ یہ ایسا چیرا ہے جو بھرنے کا نام نہیں لے گا۔ دین ایسے تڑکے گا کہ مرمت کرنا ممکن ہی نہیں ہو گا'۔ ایک تیسرا شخص جیسے ماتم کرتا ہو، 'اسلام کی چکی کا باٹ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے۔ دیکھو تو یہ چکر کھاتے ہوئے کیسے ڈگمگا رہا ہے'۔

ایک شخص ایسا تھا جس کی تنبیہ تو آج بھی تاریخ میں ایسے گونجتی ہے کہ در و دیوار ہلا دے۔ اتنی صاف، بے باک بات کہی کہ اس میدان میں موجود ہر شخص بعدازاں مرتے دم تک دل میں یہ پھانس لیے جیا ہو گا کہ کاش، اے کاش ہم ابو موسی کی بات پر توجہ دیے دیتے۔ ایک لمحے کو رک کر اچھی طرح سوچ لیتے، ان کی بات پر عمل کر لیتے۔ ابو موسی محمد ﷺ کے دیرینہ ساتھیوں میں سے ایک تھے اور عمر کے دور میں کوفہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا، 'فتنہ معاشرے کو السر کی طرح گلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ ایسی آگ ہے جس کو چار سمتوں کی ہوائیں پوری قوت سے بھڑکاتی ہیں۔ شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب، ہر طرف سے آنے والی ہواؤں میں تباہی کی سڑاند ہوتی ہے۔ فتنہ ایسی بری چیز ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ اندھے اور بہرے وحشی حیوان جیسا ہوتا ہے۔ ایک بار رسا تڑوا لے تو پھر راستے میں آنے والی ہر چیز کو روند کر رکھ دیتا ہے۔ یہ فتنہ تمہیں برباد کر دے گا۔ یہ اس جگہ سے نکلا ہے جہاں تم خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ یہ عالموں اور

جاہلوں میں فرق نہیں کرتا۔ تجربہ کار لوگ بھی اس کے ہاتھوں یوں الجھ گئے ہیں کہ ان پر بھی احمق ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ وہ جو فتنے کے دوران سو یا رہا، اس سے بہتر ہے جو جاگ رہا تھا۔ وہ جو جاگ رہا تھا، اس سے بہتر ہے جو اس دوران کھڑا رہا۔ جو کھڑا رہا، اس سے بہتر ہے جو چل کر اس کے تیز دھارے میں جا پہنچا۔ خدا کے لیے، ہوش کرو اور اپنی تلواریں واپس نیام میں ڈال دو۔ اپنے نیزوں کو پیچھے سرکاؤ اور کمانیں ڈھیلی کر دو'۔

تاہم، اس خوفناک صورتحال میں بھی ایک آخری امید باقی تھی۔ مگر اس امید کو پہنچنے کے لیے دونوں لشکروں کے سپہ سالاروں کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ بیس ہزار لوگ ہاتھوں میں اسلحہ تھامے، ایک دوسرے سے خوفزدہ، سانس روکے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ علی ایک طرف سے سیاہ جنگی گھوڑے کی پشت پر سوار اور دوسرے جانب طلحہ اور زبیر اپنے گھوڑوں پر بیٹھے برآمد ہوئے اور دونوں لشکروں کی صفوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے بات کرنے کے لیے آگے آئے۔ وہ گھوڑوں کو دوڑاتے میدان کے وسط میں یوں رکے کہ ایک جنگجو نے منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ، 'وہ اتنے قریب تھے کہ گھوڑوں کی گردنیں ایک دوسرے کو قلمزن کر رہی تھیں'۔ گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے بات چیت کا آغاز کیا۔ فوراً ہی علی نے خیمہ لگانے کا اشارہ کیا تو چاروں طرف خوشی کے نعرے بلند ہو گئے۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ فریقین مذاکرات پر آمادہ تھے اور سائے میں بیٹھ کر تسلی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مذاکرات کا دور اگلے تین دن تک بغیر کسی وقفے کے جاری رہا۔ صرف سپہ سالار ہی نہیں بلکہ دونوں لشکروں میں شامل لوگ بھی ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔ مکہ کے ایک شخص نے ان تین دنوں کا حال کچھ یوں سنا رکھا ہے کہ، 'بعض دوسروں سے اختلاف رکھتے تھے اور کچھ نے ایک دوسرے کی راہ کاٹنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن ان تین دنوں میں ہم نے صرف امن کی بات کی اور ہر شخص صرف امن اور آشتی کا خواہاں تھا'۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ عائشہ نے مذاکرات میں حصہ نہیں لیا۔ ان تین دنوں میں انہوں نے اس خیمے کا رخ بھی نہیں کیا۔ حالانکہ ان مذاکرات کا جو بھی نتیجہ نکلتا، ان کی منظوری انتہائی لازم تھی۔ عائشہ نے ہی مکہ کے لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر آٹھ سو میل دور اس مرطوب میدانی علاقے میں نکل آنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ عائشہ ہی تھیں جنہوں نے لوگوں کو عثمان کے قتل کا انتقام لینے پر اکسایا تھا اور انہی کے نام پر تو

یہ لوگ جمع تھے۔ کیا وہ بھی اس قضیے کا پر امن حل چاہتی تھیں؟ کیا محمد ﷺ کی کہی بات ابھی تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھی جس میں انہوں نے نزاع اور نا اتفاقی سے دور رہنے کو کہا تھا؟ یا کیا اب عائشہ حوئب کے چشمے اور بھونکتے ہوئے کتوں کو یکسر نظر انداز کر چکی تھیں؟

ہم دیکھیں گے کہ اگر لڑائی کی نوبت آئی تو وہ میدان سے باہر نہیں رہیں گی۔ اب کی بار تو بالکل بھی ایسا نہیں ہوگا۔ وہ گھمسان کی جنگ میں مضبوطی کے ساتھ، مرکز میں جم کر کھڑی دکھائی دیں گی اور اپنے لشکر کو بھرپور انداز میں آگے بڑھ کر وار کرنے پر اکسایا کریں گی۔ وہ جرات مند مشہور تھیں اور کافی عرصہ پہلے تک وہ محمد ﷺ کے شانہ بشانہ جنگی مہمات میں حصہ بھی لے چکی تھیں۔ کیا وہ ذہنی طور پر پہلے سے ہی جنگ کے لیے تیار بیٹھی تھیں؟ کیا ان کا خیال یہ تھا کہ دراصل مذاکرات لاحاصل مشق ہے اور خواہ مخواہ کی کوفت ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عائشہ یہ گمان کیے بیٹھی تھیں کہ بالآخر یہ بات چیت ناکامی کا شکار ہوگی؟ کیا اسی وجہ سے انہوں نے مذاکرات کے خیمے میں آنا گوارہ نہیں کیا؟ ہم نہیں جانتے کہ جب علی علیہ السلام، طلحہ اور زبیر اس خیمے سے تیسرے دن شام کے وقت باہر نکلے، اور جب انہوں نے اپنی افواج کو ہتھیار نیچے کرنے کا اشارہ کیا تو اس وقت عائشہ کی حالت کیا تھی۔ کیا وہ اس پر خوش تھیں یا انہیں مایوسی ہوئی تھی؟ اس دن اور نہ ہی اس دن کے بعد، جب تک وہ زندہ رہیں، انہوں نے اس بات کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔

مذاکرات کے نتیجے میں یہ تینوں امن پر تو راضی نہیں ہوئے لیکن کم از کم جنگ ٹل گئی تھی۔ سادہ الفاظ میں کہیے تو یہ غیر متفق ہونے پر متفق ہو چکے تھے۔

ان میں سے ہر ایک نے حلف لیا کہ اگرچہ مسئلہ حل نہیں ہوا مگر بہر حال مسئلے کا حل طاقت کا استعمال کسی بھی صورت نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی فوج کو پہلے حملہ کرنے کا حکم نہیں دے گا۔ ایک جنگجو نے اس حالت کو کچھ یوں بیان کیا، 'جب اس رات یہ تینوں خیمے سے نکل کر لوٹے تو گہری نیند سوئے۔ وہ اس سے پہلے اتنی پر سکون نیند کبھی نہیں سوئے ہوں گے کیونکہ یہ تینوں اس رات آزاد تھے۔ ان کے سر پر اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی۔ وہ جو غلطی کرنے کے انتہائی قریب پہنچ چکے تھے، پوری قوت سے خود کو کھینچ کر اس تباہی سے دور لے آئے تھے۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ یہ تینوں ہی

جنگی منصوبوں سے پیچھے ہٹ گئے ہیں'۔

یہی شخص آگے چل کر بتاتا ہے کہ جب یہ تینوں آرام سے سو رہے تھے، کئی ایسے بھی تھے جنہیں اس رات نیند ہی نہیں آئی۔ اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں، 'اسی رات، وہ جو اس مسئلے کی جڑ تھے۔ یعنی وہ جنہوں نے عثمان کا سارا قضیہ کھڑا کیا تھا، انہیں اپنے بستروں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی بدترین رات گزاری کیونکہ ان کا انجام نزدیک تھا۔ وہ جلد ہی انصاف کے کٹہرے میں کھڑے کیے جانے والے تھے۔ یہ بدبخت ساری رات جاگتے رہے اور ان میں بات چیت چلتی رہی تاآنکہ انہوں نے اچانک حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ انہوں نے اس منصوبے کو کو خفیہ رکھا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی باہر نکل آئے اور روشنی کی پہلی پو پھوٹتے، اپنے ہی لشکروں کے اندر دھاوا بول دیا'۔

روایت میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ آخر یہ کون لوگ تھے؟ کیا وہ مروان کے آدمی تھے جو اس سے پہلے اس دن بھی لڑائی کا موجب بنے تھے جس دن عثمان قتل کیے گئے؟ یا کیا عائشہ کے حکم پر ایسا کیا گیا جو طلحہ اور زبیر کے لڑائی سے پیچھے ہٹنے پر خاصی مایوس تھیں؟ یا پھر جیسا کہ عام خیال کیا جاتا ہے، یہ وہ سر پھرے نوجوان تھے جو لڑائی جھگڑے کے شوقین واقع ہوئے تھے اور قدیم عربوں کی جرات اور ہٹ دھرمی کے قصے سن سن کر سرکش ہو چکے تھے؟ اس ضمن میں روایات میں خاصی الجھن پائی جاتی ہے۔ حقائق گڈ مڈ ہیں اور کہیں کوئی سرا نہیں ملتا۔ ایسا ہونا قدرتی ہے کیونکہ عام طور پر جنگ سے متعلق یا کہیے جنگ کے میدان سے متعلق ملنے والی روایات یوں ہی بے ترتیب اور خلط ملط ہوا کرتی ہیں۔ جو حقائق صاف ہیں، ان کے مطابق ایک چھوٹا گروہ دونوں لشکروں کو آپس میں بھڑا گیا۔ ایک چھوٹا سا گروہ بھی ایسا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے۔ تین یا چار لوگ بھی بڑی سے بڑی فوج کو حرکت میں لانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اچانک ہی لشکر کے ایک حصے میں تلواریں ٹکراتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے سرے تک افراتفری پھیل جاتی ہے۔ ایک زوردار آواز بھی اتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کہ فوج میں یک دم حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ صبح سویرے تڑکے کے وقت اچانک ہڑبونگ مچی اور دیکھتے ہی دیکھتے سپاہی اپنی تلواریں سنبھالے باہر نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں فوجی لڑائی میں جت گئے۔ ایسے میں جب

چاروں طرف خوف اور بے جگری کا راج ہوتا ہے، اس کے بیچ، لوگوں کے پاس سوال اٹھانے کا موقع نہیں ہوتا۔ جب ایک فوجی کے سر پر موت منڈلا رہی ہو تو اس کو کیا پڑی ہے کہ پہلا وار کرنے والے کی کھوج کرتا پھرے؟ اس کے لیے اس وقت اپنی زندگی کا دفاع اولین ترجیح ہوتا ہے۔

شاید یہاں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہو گا کہ دو انتہائی منظم لشکر جب منہ در منہ کھڑے ہوتے ہیں تو ایسے میں ہر شخص پوری تیاری سے، مسلح ہو کر لڑائی کے لیے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال میں لڑائی کے سوا کسی دوسرے نتیجے کی توقع رکھنی ہی فضول ہے۔ ہم یقین سے صرف یہ جانتے ہیں کہ اس بار کوئی اپنے سر پر ذمہ داری نہیں لے گا۔ اس لڑائی کو شروع کرنے کا بھاری پتھر اٹھانے کو کوئی تیار نہیں ہو گا۔ وہ ہزاروں آدمی جو 656ء میں اکتوبر کے مہینے میں اس دن یہاں انتہائی بے دردی سے قتل کر دیے گئے، ان کی موت کا کوئی ذمہ دار نہیں ہو گا۔

یوں اس جنگ کی ابتداء ہو گئی۔ لوگ اسے جنگ جمل کہتے ہیں مگر اصل میں یہ اس طویل جنگ کی پہلی لڑائی تھی جس کو لڑنے کی خواہش کسی کو نہیں تھی مگر اس سے کنی کترانا بھی ہرگز ممکن نہیں تھا۔ یہ ساتویں صدی میں شروع ہونے والی وہ جنگ ہے جو آج اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ آج یہ جنگ اسی مقام پر ویسے ہی لڑی جا رہی ہے جہاں صدیوں پہلے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ یہ مقام عراق ہے۔ اس دن شروع ہونے والی خانہ جنگی آج بھی یہاں، یعنی عراق میں بدستور جاری ہے۔ بلکہ عراق ہی کیا، اسلامی دنیا کے کونے کونے میں لڑی جا رہی ہے۔ عراق تب بھی مرکز تھا، آج بھی اس کا منبع ہے۔

باب 9

وہ اونٹنی جس پر عائشہ سوار تھیں، جوں ہی میدان جنگ میں داخل ہوئی تو فوجیوں کی دہاڑ کانوں کو پھاڑتی ہوئی چاروں طرف بکھر گئی۔ وہ اس کو دیکھ کر جوش سے پاگل ہو رہے تھے۔ یہ ایک سرخ اونٹنی تھی جو صرف اور صرف سواری کے مقصد کے لیے سدھائی گئی تھی۔ اصیل نسل، نہایت سریع، مضبوط قد کاٹھ اور انتہائی زور آور تھی۔ کوہان پر ہودج نصب تھا جس کے اوپر سایہ قائم کرنے کے ایک چھتر بنایا ہوا تھا۔ اس چھتر کو آج ململ نہیں بلکہ لوہے کی زنجیروں اور زرہ میں لپیٹ کر سرخ ریشم سے ڈھک دیا گیا تھا۔

عائشہ کی اونٹنی کا قد خاصا اونچا تھا۔ اس کے اوپر نصب ہودج بھی حفاظت کی پیش نظر خاصا اٹھا کر باندھا گیا تھا۔ سینکڑوں گھڑ سواروں کے بیچ یہ اونٹنی آہستہ آہستہ لہک کر چل رہی تھی۔ ہودج میدان میں باقی ہر شے سے اونچا اور دور سے ہی واضح نظر آتا تھا۔ گھڑ سوار اور پیادوں کے ہاتھ میں لہراتے ہوئے لشکر کے اونچے جھنڈے بھی ہودج کے سامنے سرنگوں محسوس ہوتے تھے۔ عائشہ کی یہ اونٹنی بجا طور پر لشکر کا مرکز تھی، اسے کسی جھنڈے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ کہیے اس لشکر کو ہودج کے ہوتے کسی نشانی کی ضرورت نہیں تھی۔ فوجی میدان میں جہاں ہوتے، وہ بغیر کسی دقت کے عائشہ کی آواز پر دوڑ کر فوراً ان کے گرد گھیرا ڈال سکتے تھے۔ پیغمبر کی بے باک، بے لاگ اور سب سے عزیز بیوی، وہ جس کی گود میں آپؐ نے دم توڑا تھا۔ آج جنگ کے میدان میں لڑائی کے عین بیچ کھڑی تھی۔ عائشہ آج ہرگز پیچھے نہیں رہیں گی۔ وہ کسی بھی صورت ہار نہیں مانیں گی اور جہاں سب سے زیادہ خطرہ ہو گا، یہ اپنی اونٹنی کو ہانک کر عین خطرے کے بیچ پہنچ جائیں گی۔ کسی شخص میں ہمت نہیں ہو گی کہ انہیں میدان سے باہر رکنے پر مجبور کر سکے۔ وہ جنگجوؤں کے ساتھ میدان میں اتری تھیں اور آخری دم تک یہیں، لڑائی کے گھمسان میں ان کے ساتھ ہی جمے رہنے پر تیار تھیں۔ سب سے مقبول 'ام المومنین' آج دس ہزار فوجیوں کے لشکر کی سپہ سالار تھیں۔ اس فوج کا ہر سپاہی ان کے ایک اشارے پر جان قربان کرنے کو تیار کھڑا تھا۔

ہودج کو محفوظ بنانے کے لیے لوہے کی زنجیریں اور زرہ استعمال کی گئی تھیں جس سے یہ وزنی ہو گیا تھا۔ ممکنہ طور پر اس میں سے باہر کا نظارہ کرنا مشکل رہتا ہو گا مگر اونچائی کے سبب عائشہ کو میدان پر نظر رکھنے میں

قطعاً کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ بلندی پر بیٹھی سارے میدان کی کاروائی کو آسانی سے دیکھ سکتی تھیں، اس لیے کمان آسان ہو گئی تھی۔ جہاں صفوں میں شگاف پڑتا دکھائی دیتا یا انہیں لگتا کہ کوئی ٹکڑی کمزور پڑ رہی ہے، وہ جھٹ اس طرف رخ کرتیں۔ ان کے ساتھ حفاظت پر مامور سینکڑوں گھڑ سوار بھی حرکت میں آ جاتے جو کمزور پڑتی ہوئی ٹکڑیوں کا بھرپور ساتھ دیتے اور آگے بڑھنے میں مدد کرتے۔ گھڑ سواروں کے ساتھ ان کے گرد بیسیوں پیادے بھی جمع تھے جو ان کی اونٹنی کی حفاظت کے ساتھ ساتھ، پیغام رسانی کا کام بھی کر رہے تھے۔ لشکر کے دو بڑے حصے تھے۔ گھڑ سواروں کی کمان طلحہ اور پیادہ فوج کی سپہ سالاری زبیر کے ہاتھ میں تھی۔ عائشہ ان پیغام رساں پیادوں کی مدد سے مسلسل ان دونوں کے ساتھ رابطے میں تھیں اور جہاں ضرورت پڑتی، ان کے لیے بھی ضروری ہدایات جاری کر دیتیں۔

زرہ بند ہودج پر سرخ ریشم جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس کی پھڑ پھڑاہٹ میں عائشہ کی تیز اور حاکمانہ آواز صبح کی خنک ہوا کو چیرتی ہوئی چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ چونکہ ہودج کو اچھی طرح محفوظ بنایا گیا تھا، اس لیے عائشہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہیں تھیں۔ لیکن ان کی آواز ہر کسی تک پہنچ رہی تھی۔ جیسے کسی انجانی سمت سے آ رہی ہو، گویا میدان میں بے جگری سے لڑتے ہوئے جنگجوؤں کو آسمان سے احکامات مل رہے تھے۔ 'اللہ کی قسم! تم سورما ہو۔ تم سا کوئی دوسرا بہادر آج تک جنا نہیں گیا۔ تم پہاڑ کی طرح جم کر کھڑے ہو' وہ اپنے فوجیوں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ پھر ان پر زور دیتیں، 'دلیری اور ہمت کا مظاہرہ کرو، اے میرے بیٹو! ان قاتلوں کو دکھا دو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ ان کا وہ حال کرو کہ یہ اس دن کو روئیں جب دنیا میں آئے تھے۔ اللہ کرے ان کی مائیں ان سے محروم ہو جائیں'۔

وہ ایک لمحے کے لیے بھی چپ نہ رہیں۔ ایک بار، دو بلکہ بار بار فوجیوں کو طیش دلاتیں، 'عثمان کے قاتلوں کا انجام موت ہے۔ قاتلوں کے ساتھیوں کی سزا بھی موت ہے۔ عثمان کا بدلہ لو۔۔۔ آگے بڑھو، عثمان کے قتل کو رائیگاں نہ جانے دو!'۔

جنگ کے میدان میں عورتوں کا روایتی کردار یہی تھا۔ لیکن ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ ایک عورت لڑائی کے بیچ کھڑی یہ کام سر انجام دے رہی تھی۔ عام طور پر عورتیں لشکر کی پشت پر رہا کرتیں، وہیں سے لشکر کا ساتھ

دیتیں۔ جنگجوؤں کو طیش دلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتیں۔ وہ پیچھے رہتے ہوئے دشمن فوج کی مردانگی پر جملے کستیں اور اپنے جنگجوؤں کو آگے بڑھ کر بہادری اور بے جگری سے لڑنے پر اکسایا کرتیں۔ وہ لڑائی کے دوران یک زبان ہو کر منہ سے ایک مخصوص آواز نکالتیں جو اس قدر ہیبت ناک ہوتی کہ دشمنوں کے دل میں خوف بیٹھ جاتا۔ ان آوازوں کی مثال مشکی باجے جیسی تھی جو اس زمانے میں بھی دنیا کے کئی دوسرے علاقوں میں جنگ کے دوران بگل کی طرح زوردار آواز میں بجا کر دشمنان کے اوسان خطا کرنے کے کام آتی تھی۔ یہاں گھمسان کا کارن پڑا ہوتا اور وہاں عورتیں چیخ رہی ہوتیں۔ ایسے میں ایک طرف لڑتے رہنے کا دباؤ اور پھر عورتوں کا یہ شور، اس کے سبب فوجیوں کے دلوں میں ڈر جنم لے لیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف ہیجان اور خوف پھیل جاتا۔ اس ہڑبونگ میں ہر شخص جان کی فکر میں مارا مارا پھرتے، دوسروں کو دھکے مار کر پیچھے ہٹاتا، تلواریں ٹکراتیں، اور ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی کہ مخالفین کو روندتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ کیونکہ پیچھے مڑنے میں موت تھی اور کہیں ایک جگہ ٹک گئے تو پھر بھی مارے جاتے۔ میدان جنگ میں یوں ایک ہی راستہ بچتا جو آگے کی طرف جاتا تھا اور اس راستے پر عورتوں کی یہی آوازیں ان کا پیچھا کرتی رہتیں۔ یوں میدان میں چاروں طرف فوجی ہانپتے ہوئے دکھائی دیتے اور تیز سانسوں کی آواز اس قدر اونچی ہو جاتی کہ لگتا، جیسے کئی اژدھے پھنکار رہے ہوں۔ جیسے ہی تلوار کا پھایا کسی کے جسم میں گوشت چیرتا ہوا دوسری جانب سے نکلتا تو ایک اندوہناک چیخ بلند ہوتی۔ وقفے وقفے سے مرتے ہوئے اشخاص کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور ایسے میں بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کون مر رہا ہے؟ آیا یہ دشمن تھا یا پھر اپنا کوئی جان سے گیا؟ دوسروں کی ویسے بھی کس کو پرواہ ہے جب اپنی جان پر بن آئی ہو؟ کئی زخمی ہو کر زمین پر پڑے کراہ رہے ہوتے۔ سسکیاں بھرتے ہوئے، زخموں سے چور، مرتے ہوئے فوجیوں کی دل خراش چیخیں اس وقت تک سنائی دیتی رہتیں، جب تک کہ موت آ جائے یا پھر لڑائی ختم ہو کر مرہم کا سامان نہ ہو چکے۔

یہ جدید دور کا شاخسانہ ہے کہ آج عورتوں کو اکثر نازک مزاج سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ٹھسے سے انہیں 'صنف نازک' قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں یہ عورتیں ہی تھیں جو اس قدر بھیانک اور دہشت ناک مناظر دیکھ کر بھی اپنی جگہ پر جم کر کھڑی فوجیوں کو آخری دم تک لڑتے رہنے پر اکساتی رہتیں، انہیں

جری دشمن کے چھکے چھڑانے پر مجبور کیے رکھتیں۔ اگر کوئی شک میں مبتلا ہو جاتا یا پیچھے مڑ کر بھاگنے کی سوچتا تو یہ اسے شہ دلا کر واپس میدان میں دھکیل دیتیں۔ لوگ ابھی تک ہند کی مثال زور و شور سے دیتے تھے۔ ہند کا شوہر قریش مکہ کا سردار تھا اور محمد ﷺ کے شدید مخالفین میں سے ایک تھا۔ ابوسفیان سے قبل ہند کا باپ قریش کا سردار ہوا کرتا تھا۔ وہ مکہ اور مدینہ کے بیچ پہلی باقاعدہ جنگ میں مارا گیا تھا اور ہند اپنے باپ کے قاتل کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ محمد ﷺ کے چچا حمزہ تھے۔ چنانچہ جب اگلی دفعہ مکہ کے لشکر نے مدینہ پر دوبارہ حملہ کیا تو یہ ہند تھی جو اپنی افواج کی پشت پر کھڑی باقی عورتوں کے ساتھ مل کر محمد ﷺ کے لشکریوں کو لعن طعن کر رہی تھی اور اپنے فوجیوں کو شہ دلا کر حملے پر مجبور کرتی رہی۔ ہند انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور اس نے اپنے باپ کے قاتل حمزہ کے سر کی منہ مانگی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ پھر جب لڑائی ختم ہو گئی تو ہند میدان میں اتری اور ایک ایک لاشے کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ حمزہ کی تلاش میں تھی، جنہیں ایک حبشی غلام نے نیزے کا وار کر کے موقع پر قتل کر دیا تھا۔

آخر کار ہند کو حمزہ کی لاش مل گئی۔ لاش دیکھتے ہی اس کے حلق سے ایک فلک شگاف، کانوں کو پھاڑتی ہوئی چیخ برآمد ہوئی جو کئی سالوں بعد بھی، لوگ جب اس کے بارے سوچتے یا بات کرتے تو محسوس ہوتا جیسے ان کا خون جم گیا ہے۔ وہ حمزہ کی آسن میں پڑی ہوئی لاش کے پاس کھڑی رہی۔ پھر اس نے ایک خنجر منگوایا اور دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری قوت سے حمزہ کے جسم میں گھونپ کر چیرا لگا دیا۔ لاش کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور اندر ہاتھ ڈال کر کلیجہ نکال لیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دلی مراد بر آنے کے احساس میں، زور زور سے چلاتے ہوئے کلیجے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اپنے سر کے اوپر بلند کر دیا۔ پھر سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ ہند، حمزہ کا کلیجہ دانتوں سے نوچ کر چبا رہی تھی۔ وہ اس کی بوٹیاں چباتی جاتی اور زمین پر تھوکتی جاتی۔ پھر اس چبے ہوئے کلیجے کو دیر تک دیوانوں کے سے انداز میں مٹی پر رولتی رہی۔ اس کا منہ، ہاتھ اور کپڑے حمزے کے کلیجے سے رستے ہوئے تازہ خون سے لال ہو رہے تھے اور وہ مسلسل چیختی چلا رہی تھی۔

کون ہے جو اس منظر کو بھلا سکتا تھا؟ کلیجے سے نکلا گاڑھا خون اس کے منہ سے بہہ کر ٹھوڑی کے نیچے سے ٹپک رہا تھا۔ ہاتھ اور بازو بھی گہرے لال خون سے تر تھے اور آنکھوں میں جیسے انتقام کا خون اترا ہوا تھا۔ یہ

اس قدر بھیانک اور دہشت ناک منظر تھا کہ لوگ اتنے عرصے بعد بھی ہند کے بیٹے کو، بعض طنزاً اور کچھ ستائش سے 'کلیجہ چبانے والی 'کا بیٹا کہہ کر یاد کیا کرتے۔ ظاہر ہے، کوئی بھی شخص انہیں بھی منہ پر ایسا کہنے کی جرات نہیں رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہند کا بیٹا کوئی اور نہیں بلکہ معاویہ تھے۔ معاویہ ایک عرصے سے شام کے گورنر تھے۔ وہ اپنی ماں جیسے ہی واقع ہوئے تھے۔ یعنی ان کے ساتھ دشمنی مول لینے کا خطرہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔

ہند کا خاصا دبدبہ تھا۔ وہ نامی گرامی اور انتہائی سخت دل عورت تھی۔ وہ بھی بے باک مشہور تھی مگر اس کے باوجود کبھی جنگ کے بیچ، میدان میں نہیں اتری۔ ہمیشہ لشکر کے پیچھے رہ کر اپنا کام سرانجام دیا۔ وہ بھلے انتہائی نڈر رہی ہو مگر اس کی شاہانہ طرز کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ وہ لڑائی کے مرکز میں کبھی نہیں جا سکی۔ یہ تو ایسا کام تھا جس کے لیے خانہ بدوش عورتیں ہی مشہور تھیں۔ مثلاً ایک عورت ام سلمہ تھی۔ یہ اپنے قبیلے کی سردار تھی اور اس نے ابو بکر کے دور میں لڑی جانے والی ارتداد کی جنگوں میں اپنے قبیلے کے خلاف جاری مہم میں سپہ سالاری کی تھی۔ شاعر ابھی تک اس کی ہمت اور حوصلے کے گن گاتے تھے۔اس کی دلیری کو صحرا سے منسوب رومان سے جوڑ کر کئی گیت اور نظمیں لکھی جا چکی تھیں۔اس ضمن میں لکھی جانے والی شاعری میں اس سفید اونٹنی کا بطور خاص ذکر ملتا تھا جس پر سوار ہو کر ام سلمہ انتہائی نڈر انداز میں اپنے لشکر سمیت میدان جنگ میں چلی آئی تھی اور آخری دم تک ہمت اور بلند سری کے باعث باقی جنگجوؤں کے حوصلے کا سامان کرتی رہی تھی۔ کئی روایات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ اس نے باقاعدہ لڑائی بھی لڑی لیکن بالآخر اسے اپنی اونٹنی سمیت ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے قبیلے کو اس لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ ام سلمہ مسلمان نہیں تھی۔۔۔ یا کہیے ابو بکر کے مطابق وہ مرتد تھی۔ مگر جب عائشہ بصرہ شہر کے باہر اپنی سرخ اونٹنی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں اتریں تو یہ پہلی بار تھی کہ ایک مسلمان عورت سپہ سالار کی حیثیت سے لشکر کو لیے لڑائی لڑنے نکلی تھی۔ یہ اسلام میں کسی عورت کا جنگ میں سپہ سالاری کا پہلا اور آخری موقع ہو گا۔

اس وقت تک کسی بھی شخص کو عائشہ، یا کہیے ایک عورت کی سپہ سالاری پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کوئی

شخص ان کے وہاں موجود ہونے پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا بلکہ ہر شخص ان کے وہاں اس حیثیت سے موجود ہونے کے حق کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب نقادوں نے عائشہ کے یوں پورے لشکر کی سپہ سالاری پر سوالات اٹھانے شروع کیے، بلکہ کسی بھی عورت کی جنگ میں ہی نہیں بلکہ کسی بھی سیاسی اور معاشی شعبے میں سربراہی پر اعتراضات لگا کر تقریباً ناممکن بنا دیا۔ اس لڑائی کے بعد بچ جانے والے ایک شخص نے انتہائی تلخی سے کہا، 'ہم ایک ایسی عورت کے لیے جنگ لڑ رہے تھے جو اپنے تئیں سمجھ رہی تھی کہ جیسے وہ امیر المومنین ہے'۔ ایک دوسرے شخص نے تو تضحیک کی حد کر دی۔ کہنے لگا، 'بجائے یہ کہ گھر میں بیٹھ کر کپڑوں پر بیل اور بوٹے کاڑھتیں، کشیدہ کاری سیکھتیں، وہ گھوڑے پر سوار ہو کر صحرا پار کرنے نکل پڑیں۔ خود کو اتنا صاف ہدف بنا لیا کہ ان کے بیٹوں کو تیر، نیزے اور تلواروں کے وار سہہ کر دفاع کرنا پڑا'۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر اس روز عائشہ کی فوج میدان مار لیتی تو وہی الفاظ جواب ان کو لعن طعن کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے، ہم دیکھتے کہ کیسے ان کی بہادری، بے جگری اور سپہ سالاری کے گن گانے کے لیے استعمال ہو رہے ہوتے۔ یا اگر وہ ام سلمہ کی طرح میدان جنگ میں ماری جاتیں تو پھر ان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ آج عظیم داستان بن کر امر ہو جاتا اور یہی لوگ اس کو بار بار بیان کرتے نہ تھکتے۔ لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں ہو گا۔

عائشہ اونٹنی پر سوار، اونچائی سے میدان جنگ کا عجیب منظر دیکھ رہی ہوں گی۔ یہ اس قدر خوفناک اور دل دہلا دینے والا منظر رہا ہو گا کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ جس چیز سے مسلمان ڈرتے آئے تھے، اب ان کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل رہا تھا۔ سخت جان اور جانے مانے جنگجوؤں نے بھی بعد میں قسم اٹھا کر بیان دیا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بڑی تعداد میں کٹے ہوئے بازو اور ٹانگیں نہیں دیکھیں۔ لڑائی صبح سویرے شروع ہوئے اور سہ پہر تک جاری رہی اور جب یہ تمام ہوئی تین ہزار افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ ان میں زیادہ تر کا تعلق عائشہ کے لشکر سے تھا، یہ سب منجھے ہوئے جنگجو تھے۔ تین ہزار مر چکے تھے یا مر رہے تھے۔

لڑائی میں بچ جانے والوں نے بعد ازاں میدان میں پیش آنے والے واقعات کی روداد لکھوائی ہے۔ ان

کی کہانیاں پڑھیں تو یہ ویسی ہی ہیں، جیسی کسی بھی افتاد میں بچ جانے والوں کی ہوا کرتی ہیں۔ بعض نے جنگ کے حالات کو انتہائی رومانوی انداز میں بیان کیا ہے،اس سے تحریک کا سامان پیدا کیا ہے۔ کچھ ایسے بیان ملتے ہیں کہ ان پر قدیم یونانی سورماؤں کی لازوال داستانوں کا گماں ہوتا ہے۔ یہ سورما آخر تک ڈٹ کر کھڑے رہے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک جنگجو کے ساتھ یوں ہوا کہ جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ اٹھا کر لڑتا رہا۔ایک دشمن سپاہی نے تلوار کے وار سے اس کی ٹانگ دھڑ سے جدا کردی کیونکہ اس کے ہاتھ سے اپنی تلوار چھوٹ کر دور جا گری تھی اور وہ اس کے وار کو روک نہیں پایا تھا۔اسے لگا کہ شاید اب اس کا کام تمام ہو گیا مگر اسی وقت اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ اٹھالی۔اس سے پہلے کہ دشمن دوسرا وار کرتا،اس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹانگ اتنی زور سے گھمائی کہ وہ شخص جس نے یہ کاٹی تھی،اس کی ضرب سے چکرا کر گر گیا۔اس کا سر پتھر سے ٹکرایا اور وہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔ایک دوسرے جنگجو نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ وہ کٹی ہوئی ٹانگ ہاتھ میں پکڑے میدان میں پڑا تھا اور خون بہہ جانے کی زیادتی سے کمزور ہو کر گر پڑا تھا۔اس کا سر مرے ہوئے دشمن جنگجو کے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔اس سے پوچھا، 'تمہارا یہ حال کس نے کیا؟' جواب میں وہ آنکھ مار کر مسکرایا اور بولا، ' میرے سر کی گدی نے۔۔۔'۔

موت کے سامنے منہ زوری اور سرکشی کی یہ کہانیاں دنیا میں ہر جگہ بہتات میں مل جاتی ہیں۔ ان قصائص میں مرد ہاتھ اور ٹانگیں کٹ جانے کے بعد بھی بے جگری سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دلوں سے لڑتے ہیں، جگرے سے وار کرتے ہیں اور بدترین حالات میں بھی ناممکنات کے خلاف انتہائی بہادری سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک لڑتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو اپنے دانتوں سے تلواریں تھام کر وار کرتے ہیں۔ جیسے پچیس سال بعد حسین علیہ السلام کے سوتیلے بھائی عباس کے بارے بھی ایسے ہی واقعات مشہور ہو جائیں گے۔ آج عباس شیعیت میں عظیم سورما مانے جاتے ہیں۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں،اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ کہانیاں اصل نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مقصد تو میدان جنگ میں اتر کر ہمت اور دیدہ دلیری سے لڑنے کی جرات کو عیاں کرنے کے لیے گھڑی جاتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان داستانوں کا حاصل صرف اور صرف پیچھے رہ جانے والوں کے لیے دلیر پن کا سامان کرنا ہے۔

یہ جنگ کی دہشت اور اس سے منسوب خوف اور ہراس کو جنگجوؤں کے دلوں سے دور رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ جمل (جمل عربی کا لفظ ہے جس کے معنی اونٹنی ہیں) کی تقریباً کہانیوں میں دلیری اور مردانگی اتنی کثرت سے ملتی ہے کہ اس پر صاف صاف حماقت اور بے وقوفی کا گماں ہوتا ہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ ان قصوں کا بغور مطالعہ کریں تو اس جنگ کے پس منظر، اسباب میں بکثرت پائی جانے والی حماقت اور بدحواسی، اس جنگ کے بعد بیان کی گئی کہانیوں میں بھی اتنی ہی عام مل جاتی ہے۔ جنگ جمل کی ہر روایت اور ہر ایک راوی پر قدیم یونانی طائفے کا گماں ہوتا ہے جو جنگوں کے دوران شدید نقصان اور المناک واقعات کو ایک ناٹک کی صورت بیان کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہو؟ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ فتنہ اتنی بری چیز ہے کہ یہ روایات خانہ جنگی کی ناگوار، انتہائی کڑواہٹ کو دور کرنے کا سامان بن جاتی ہیں۔ یہ قصے درشتی اور تندی کا وہ حال ہے جو آنے والی صدیوں میں بھی ویسے ہی طاری رہے گا جیسا کہ پہلے دن تھا۔ یہ تلخی آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

جنگ جمل دست بدست لڑائی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وار کیا جاتا اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوتے جن آنکھوں میں جھانکا جارہا ہوتا، وہ کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنے ہی کسی قریبی عزیز کی آنکھیں ہوتیں۔ اس سے کبھی اچھی دعا سلام، جان پہچان یا ناطہ رہا تھا۔ عائشہ اور علی کی افواج میں پیدا ہونے والے انقسام کا چیرا سماجی نظام کی رگ وپے تک اتر گیا۔ قبائل میں پھوٹ پڑ گئی۔ قبائل کے اندر بھی کنبے اور خاندان بھی تقسیم ہو کر رہ گئے۔ اب یہ ایک امت نہیں بلکہ دو فریق تھے۔ ہمزاد، خونی رشتہ دار یہاں تک کہ باپ اور بیٹوں میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ صحیح معنوں میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔

یہ جدید دور کی جنگ نہیں تھی کہ جہاں فاصلوں کی بدولت نقصان کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ جدید ٹیکنالوجی کا معاملہ یہ ہے کہ دشمن کی آنکھوں میں جھانکنے یا چیخ وپکار سننے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ دست بدست لڑائیاں تو اندر تک کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کیے وار اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ہوئے شخص کو دیکھنا جگرے کا کام ہے۔ چاروں طرف خون ہی خون، خون کے پیاسے اور وہ جو کبھی اپنے تھے، اب ان کی آنکھوں میں خون کون دیکھنا، بھلا آسان کام ہے؟ وہ کیا منظر رہا ہو گا جب دو

جنگجو لڑتے ہوئے تلوار یا خنجر کا وار کرنے ایک دوسرے کے انتہائی قریب آ جاتے ہوں گے؟ وہ ایک دوسرے کو کس طرح دیکھتے ہوں گے؟ ان کی نظریں ملتی ہوں گی تو بھلا وہ کیا سوچتے ہوں گے؟ پھر یہ کہ لڑائی صرف خنجروں، چاقوؤں یا تلواروں تک ہی محدود نہیں رہتی تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے جو چیز ہاتھ میں آتی، ہتھیار بن جاتی۔ یہاں کسی نے دوسرے کو گردن سے دبوچ کر آنکھوں میں چبو رکھی ہیں۔ وہاں دیکھیں تو کوئی دوسرے کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے چوٹ لگا رہا ہے۔ ادھر ایک شخص نے دوسرے کا سر پتھر پر مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ وہ دور دیکھیے، اس شخص کی پسلیوں میں کہنی ماری جا رہی ہے۔ روایات میں ہر جنگجو نے اپنے قصے میں دشمن کے جسم میں تلوار گھونپنے کا ذکر کیا ہے۔ جب ایک ہی وار سے تلوار کی تیز دھار گوشت میں گھس کر پٹھوں کو چیرتی ہو گی تو بھلا کیسا محسوس ہوتا ہو گا؟ آنکھوں کے سامنے انسانی خون کا فوارا پھوٹتا ہوا دیکھنا، کیسا منظر ہوتا ہے؟ چاروں طرف خون کی بو، دہشت، بے لحاظی، افراتفری، بدحواسی، اتنا خوف کہ مردوں کا پیشاب خطا ہو جاتا، پھٹے ہوئے پیٹ سے بہتی ہوئی آنتیں، گھوڑوں کی خوفزدہ ہنہناہٹ، ہیجان کے مارے آدمیوں کا ہذیان اور ذہن میں ایک ہی بات کہ کسی طرح، کسی بھی طرح آج کا دن نکل جائے اور زندگی بچ جائے۔ کسی بھی طرح، اگر اس کے لیے دوسرے کی آنکھیں نکالنی پڑیں تو نکال دی جائیں، اپنی جان بچانے کے لیے اگر سامنے کھڑے اپنے جیسے ہی کسی شخص کے اندر سے جان نکال کر خود کے لیے رکھنی پڑی تو کر گزریں گے۔ ایک ہی مقصد اور وہ یہ کہ بس کسی طرح دن کے آخر میں صرف ہم زندہ کھڑے رہیں۔

دوپہر ڈھلنے تک طلحہ اور زبیر دونوں ہی مارے گئے۔ طلحہ گھڑسواروں کی سپہ سالاری کر رہے تھے اور مردانہ وار لڑے۔ امکان یہ تھا کہ وہ بالآخر غالب آ جاتے اگر انہیں پشت سے تیر کا نشانہ نہ بنایا جاتا۔ انہیں اپنے ہی لشکر میں سے کسی نے قتل کیا۔ مشہور یہ تھا کہ انہیں قتل کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ مروان تھا۔ بعدازاں مروان نے اس کا اعتراف بھی کیا۔ اس نے اس فعل کی عجب مگر پارسائی میں لپٹی منطق دی۔ کہنے لگا کہ طلحہ نے ہمیشہ عثمان پر کڑی تنقید کی تھی جس کے نتیجے میں بغاوت شروع ہوئی۔ بغاوت عثمان کے قتل پر منتج ہوئی۔ مروان کے مطابق اب طلحہ کا عثمان کے انتقام کا نام لے کر جنگ کرنا منافقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ مروان نے اس روایت میں، آگے چل کر کہا ہے کہ وہ تو صرف انصاف کے تقاضے پورے کر رہا

تھا، ایک منافق کو اس کی منافقت کا ذائقہ چکھا رہا تھا۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ متنازعہ شخصیات کا حال کبھی واضح نہیں ملتا۔ اسلامی تاریخ میں بھی یہی بات عام ہے کہ جب بھی مروان کی بات چلتی ہے تو ان روایات میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو مروان کے اس فعل اور اس کے جواز سے اتفاق نہیں رکھتے۔ کچھ روایات میں کہا گیا ہے کہ دراصل طلحہ بے جگری سے لڑ کر مخالفین کے چھکے چھڑا رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ غالب آجاتے مگر مروان نے موقع کا فائدہ اٹھا کر پشت سے وار کیا تاکہ ان کا کام تمام کر کے خلافت کے حصول کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر سکے۔ اگر عائشہ کا لشکر اس روز لڑائی جیت جاتا تو طلحہ ہی خلیفہ مقرر کیے جاتے۔ ایسا ہو جاتا تو ظاہر ہے مروان کے ارادوں پر پانی پھر جاتا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ دراصل مروان جان بوجھ کر پیچھے ہٹا رہا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ جنگ کا اونٹ کسی ایک کروٹ بیٹھے تو وہ بچ جانے والی کروٹ کا ساتھ دے۔ اس نے علی کے سامنے سرخرو ہونے، ان کے دل میں گھر کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تاکہ اس کی اپنی جان بخشی ہو سکے۔ اس ضمن میں ایک تیسرا خیال بھی عام ہے۔ زیادہ لوگ اس بات پر قائل تھے کہ مروان نے یہ قدم اپنے بل بوتے پر نہیں اٹھایا۔ بلکہ اس پتلی کو تو کہیں دور سے اشارے مل رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عائشہ کا لشکر جنگ ہار گیا تو مروان گھوڑے پر سوار ہو کر صحرا میں بھاگ نکلا اور لمبا سفر طے کر کے شام کے شہر دمشق جا پہنچا۔ ادھر پہنچتے ہی وہاں کے گورنر معاویہ نے اسے اپنے دربار میں کلیدی مشیر مقرر کر دیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مروان نے معاویہ کی ایماء پر یہ قدم اٹھایا کیونکہ معاویہ خود خلافت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ رقم تاریخ میں مورخین نے مروان کے معاملے میں چکرا کر یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ آخر سچائی کیا تھی؟ ظاہر ہے، اس کا حتمی جواب تو نہیں دیا جا سکتا لیکن بات یہ ہے کہ مروان کے افعال کی اصلیت جاننے کے لیے ہمیں مروان جیسا ہی شاطر اور پیچ دار دماغ چاہیے۔ ورنہ اس کی چالیں سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

زبیر کی موت کا معاملہ بھی کچھ ایسے ہی دغا کا ہے۔ گو ان کے معاملے میں صاف پتہ نہیں چلتا کہ دھوکہ کس نے دیا؟ مشہور یہ تھا کہ جوں ہی لڑائی شروع ہوئی، زبیر نے میدان چھوڑ دیا اور تن تنہا ہی مکہ کی طرف

واپسی کی راہ لی۔ چند لوگوں نے اسے بزدلی قرار دیا ہے مگر زبیر کا بطور جنگجو ریکارڈ دیکھا جائے تو یہ بات ہضم نہیں ہوتی۔ زیادہ تر روایات میں کہا گیا ہے اور لوگوں کا عام خیال بھی یہی تھا کہ زبیر معاہدے کو یوں بکھرتا دیکھ کر مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ غیر متفق ہونے پر متفق ہونا بھی اچھا خاصا طویل اور جان توڑ مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ اتنی محنت سے حاصل کیا گیا امن، اتنی آسانی سے پارہ پارہ ہونے پر وہ خاصے دل برداشتہ تھے۔ انہوں نے علی کو زبان دی تھی کہ لڑائی کی شروعات ان کی طرف سے نہیں ہوگی، ایسا ہی وعدہ علی کی جانب سے بھی کیا گیا تھا لیکن بہر حال ہوا یہ تھا کہ کہیں کوئی ایسا ضرور تھا جسے ان دونوں کی زبان کا کوئی پاس نہیں تھا۔ ایک طرح سے ان کی بات کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ علی کو ایک دفعہ زبان دے کر پیچھے ہٹ چکے تھے، انہوں نے علی کے ہاتھ پر بیعت لی تھی اور بعد ازاں اس سے منکر ہو گئے تھے۔ وہ بیعت سے مکر جانے پر بھی پشیمان تھے۔ وہ اس وقت تو اپنی زبان پر قائم نہیں رہ سکے تھے مگر اب کی بار وہ اپنے وعدے کا سختی سے پاس کریں گے۔ وہ ہر گز لڑائی نہیں لڑیں گے اور اس کے لیے اپنی جان بھی دے دیں گے۔

مکہ کے لوگوں نے دعویٰ کیا کہ یہ بدوؤں کی کارستانی تھی۔ مکہ کے قریش بدوؤں کو کمتر سمجھتے آئے تھے اور ان کے خیال میں یہ نا قابل اعتبار تھے۔ میدان جنگ سے واپسی پر زبیر تنہا تھے اور راستے میں انہیں اکیلا دیکھ کر بدوؤں نے انہیں قتل کر دیا۔ لیکن کس کے حکم پر؟ اس سوال پر روایات میں ایک دفعہ پھر مروان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس کا مقصد ان دونوں یعنی طلحہ اور زبیر کو راستے سے ہٹانا تھا، جس میں وہ بالآخر کامیاب رہا۔ لیکن اس بات کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زبیر کا ایک ہی بیٹا تھا، بعد ازاں زبیر کے قتل میں محرکات اور اسباب، حقائق کا سامنے آنا تو دور کی بات، اس ان کا نام دوبارہ زندہ کرنے کے لیے بھی کئی برس لگ جائیں گے۔

طلحہ اور زبیر کے بعد عائشہ کو لڑائی میں شکست ہو چکی تھی۔ اصولی طور پر انہیں فوراً ہی ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بدستور اپنے لشکر کے جنگجوؤں کو آگے بڑھنے اور حملہ جاری رکھنے کا حکم دیتی رہیں۔ وہ ابھی تک چلا رہی تھیں۔ تیز اور زور دار آواز میں دشنام کرتی جاتیں، ایک ہی لے میں لعن طعن کرتی رہیں۔ پکار پکار کر جنگجوؤں کو اپنی سرخ اونٹنی کے گرد جمع ہونے کا کہتی رہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شکست

تسلیم کرنے کی حالت میں نہیں تھیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ یا شاید وہ اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ وہ ہر صورت، ابھی بھی اپنی ہی کہی بات پوری ہونے کے انتظار میں تھیں بلکہ اسی پر اڑی ہوئی تھیں۔ یا پھر وہ اپنے گرداتنی خوں ریزی دیکھ کر جذبات میں بہہ گئیں۔ یا شاید وہ سب کو دکھانا چاہتی تھیں کہ وہ اس قدر ناگفتہ بہ صورتحال میں بھی خوفزدہ نہیں ہیں۔ وہ دونوں لشکروں کے جنگجوؤں پر ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ وہ ان کی ہی طرح مضبوط اعصاب اور باہمت ہیں؟ وہ دکھادینا چاہتی تھیں کہ وہ کسی بھی طرح سے مردوں سے کم نہیں ہیں۔ عرب جنگجو ہونا اعزاز کی بات تھی، وہ عورت ہوتے ہوئے بھی کسی سخت جان جنگجو مرد سے کم نہیں ہیں۔ وہ ہر گز ہتھیار نہیں ڈالیں گی۔ وہ آخر تک، کڑوے آخر تک، لڑتی رہیں گی۔

میدان جنگ میں اب لڑائی صرف عائشہ کی اونٹنی کے گرد چند سو جنگجوؤں کے بیچ جاری تھی۔ ایک کے بعد دوسرا جنگجو آگے آتا اور بڑھ کر اونٹنی کی مہار تھام لیتا۔ وہ مہار کو مضبوطی سے پکڑ کر اونٹنی کو پیچھے مڑ کر الٹی چھلانگ لگا کر ہنگامے سے دور بھاگنے سے روکے رکھتا۔ ایک بعد دوسرا شخص، ایک ہاتھ میں مہار اور دوسرے میں جھنڈا اٹھا کر نہتا ہو جاتا اور اگلے ہی لمحے، وہیں کاٹ کر پھینک دیا جاتا۔

ہر بار جب آگے بڑھنے والا جنگجو قتل ہو کر گرتا، کوئی دوسرا شخص مہار تھامنے آجاتا۔ جب بھی کوئی نیا آتا، عائشہ اس کا نام پوچھتیں۔ وہ اپنا نام بتاتا۔ خاندان، کنبے اور قبیلے کا پتہ دیتا۔ عائشہ ہودج کے اندر بیٹھیں، اونچی آواز میں اس کی نسل کے گن گاتیں، اس کو خطاب عطا کرتیں اور اس کی ہمت کی داد دیتیں۔ پھر لوہے کی زرہ کی زنجیروں کے پیچھے سے دیکھتیں کہ وہ بھی قتل کر دیا جاتا۔

علی کے سپاہی یہ حال دیکھ کر چلانے لگے، وہ عائشہ کے لشکر میں شامل جنگجوؤں کو پیچھے ہٹنے کا مشورہ دینے لگے۔ بعض تو منت سماجت بھی کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ اب لڑنے کو لڑائی بچی ہی نہیں، چاروں طرف گھیرا ڈالے وہ گلے پھاڑ کر چلانے لگے۔ اس ضد، اپنے آپ کو یوں بے وجہ قتل کرانے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن ان کی استدعا اور ہر دلیل رد کر دی گئی۔ شاید حال یہ ہو چکا تھا کہ اب دلیل کی کوئی گنجائش بچی ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ قضیہ یہاں تک کس دلیل کی بنیاد پر پہنچا تھا؟ عائشہ کی اونٹنی کے گرد جاری قتل و غارت کا کسی کھاتے میں کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس جنگ میں ہونے والی کوئی بھی ہلاکت کسی شمار میں نہیں تھی۔ یا

شاید، اب یہاں پہنچ کر خبط نے صحیح معنوں میں پنجے گاڑھ لیے تھے۔ سوچ کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا اور ہر طرف صرف دیوانگی کا رقص جاری تھا۔ یا شاید پیروکار اب اپنی جانیں لٹا کر رہنماؤں کے سر میں جو سودا تھا، اسے اس طرح باور کرا رہے تھے؟ انہیں اپنی جان دے کر ٹھوکے لگا رہے تھے؟ جنگ جمل کے پس منظر میں اب تک ہزاروں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے، سب جانتے تھے کہ ان کی موت کے ذمہ داروں کا کبھی تعین نہیں کیا جائے گا۔ کوئی شخص ان کی موت کی ذمہ داری نہیں لگے گا۔ لیکن، اب اونٹنی کے گرد ہو رہیں ہلاکتیں صاف صاف عائشہ کے کھاتے میں ڈالی جا سکتی تھیں۔ تاریخ گواہ ہوتی کہ اگر پہلے ممکن نہیں تھا تو آج، جنگ جمل کے دن سہ پہر کے بعد جاری یہ بے وجہ قتل و غارت لکھی جائے تو اس کا ذمہ دار صاف نظر آنا چاہیے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جنگ کے بعد کئی لوگوں نے صاف کہا کہ عائشہ خود کو ام المومنین کہلواتی ہیں۔ یہ کیسی ماں ہے جو اپنے بیٹوں کو یوں قتل کروا رہی تھی؟

ایک شاعر نے بعد ازاں لوگوں کے انہی جذبات کو یوں سمیٹا کہ، 'اے ہماری ماں! یہ تو کیسی ماں ہے؟ ہم نہیں جانتے تھے کہ ایسی بے درد ماں بھی ہوتی ہے۔' ایک دوسری جگہ پر یہی بات آگے بڑھائی گئی ہے کہ، 'کیا تم دیکھتی نہیں تھیں کہ کس طرح؟ کس طرح بہادر آدمیوں پر چاروں طرف سے، ضربیں لگیں، وار ہوئے، جب کوئی گرتا تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے تھے۔ کلائیاں کٹ جاتیں تھیں اور ہر مرنے والا، کیا ایسا نہیں کہ بے وجہ، تنہا مر گیا؟'

ایک قصہ گو نے لکھا کہ، 'ہماری ماں ہمیں موت کے کنویں پر پانی پلانے لے آئی۔ ہم بھی اس وقت تک یہ جان لیوا پانی پیتے رہے جب تک ہماری پیاس نہیں بجھ گئی۔ ہم نے جب جب اس کے حکم کی تعمیل کی، ہمارے ہوش غارت ہو گئے۔ جب بھی ہم نے اس کا ساتھ دیا، سوائے دکھ اور درد کے کچھ ہاتھ نہیں آیا!'۔

اس اونٹنی کی مہار تھامے رکھنے کی کوشش میں قریباً ستر آدمی کاٹ کر پھینک دیے گئے۔ اونٹنی کے گرد ان کے مردہ جسموں کا ڈھیر لگ گیا۔ اگر یہ دل خراش منظر دیکھ کر عائشہ پر خوف طاری ہوا تھا تو انہوں نے کسی کو اس کا قطعاً پتہ نہیں چلنے دیا۔ اگر اس وقت انہیں خود اپنی زندگی کا خوف تھا تو اس مشکل کا بھی، انہوں نے کانوں کان کسی کو خبر نہیں لگنے دی۔ وہ یقیناً ہودج پر برستے ہوئے تیروں کو سن سکتی تھیں۔ ایک جنگجو

نے روایت کر رکھا ہے کہ ہودج کی زرہ میں اتنے تیر پیوست ہو گئے تھے کہ اس پر 'سیہ' کا گمان ہونے لگا۔ سیہ ایک جانور ہوتا ہے جسے خارپشت یا کانٹے دار جانور بھی کہا جاتا ہے۔ کیا عائشہ کی بے خوفی کی وجہ ہودج پر دفاع کا بہترین انتظام تھا؟ کیا زنجیروں کی موٹی تہوں تلے زرہ بند ہودج کے پیچھے موت پھنکارتی ہوئی سنائی نہیں دیتی تھی؟ کیا وہ آہنی دیواروں کے سبب لوگوں کی مصیبت اور تکلیف دیکھنے سے قاصر تھیں؟ کیا وہ گونگی اور بہری ہو چکی تھیں؟ یا کیا وہ اپنے نظریات کے لیے مرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار بیٹھی تھیں؟ لیکن پھر وہی بات ہے کہ، جس عائشہ کو آپ نے جنگ لڑتے ہوئے دیکھا، وہ عائشہ حقائق نہیں بلکہ سیاست اور اپنے طے کردہ نظریے پر ہر قیمت، نتائج کی پرواہ کیے بغیر چلتے رہنے کی عادی تھیں۔

کون جانتا ہے کہ مزید کتنے آدمی اونٹنی کی مہار تھامے رکھنے کے چکر میں اپنی جان سے ہار جاتے، کٹ کر گرا دیے جاتے اگر علی آگے بڑھ کر دخل اندازی نہ کرتے۔ اس خواہ مخواہ کے پاگل پن، قتل عام کو نہ روکتے۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ ہتھیار ڈالنے کا تقاضا اور دلیل بے سود ہے۔ عائشہ کا تو معاملہ ایک طرف رہا، ان کے پیروکار بھی اپنی سدھ بدھ کھو چکے تھے اور کسی حجت کو ماننے سے انکاری تھے۔ یہ بھی صاف تھا کہ اگر یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا تو جلد ہی عائشہ بھی قتل کر دی جائیں گی۔ عائشہ کا اس میدان میں علی کی افواج کے ہاتھوں قتل، علی کو کسی صورت بھی قبول نہیں تھا۔ یہ انت ہوتی۔ وہ کسی بھی صورت اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے بلکہ وہ بعد میں اس فعل کا کسی صورت دفاع نہ کر پاتے۔ عائشہ کی یہاں موت، خود ان کی اپنی موت ثابت ہوتی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر بڑی وجہ یہ تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، عائشہ بدستور ام المومنین تھیں۔ ان کا ایک رتبہ اور مقام تھا۔

'اونٹنی کی کریلی نس کاٹ دو!' علی چلائے، 'اگر اس کی ران میں بڑی نس کٹ جائے تو یہ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں رہ سکتی، گر جائے گی۔ انہیں منتشر کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے!'۔ اس دیوانگی کو روکنے کا واقعی صرف یہی طریقہ تھا۔ علی کے ایک فوجی کو ان کا مطلب فوراً سمجھ آ گیا۔ وہ عائشہ کے دفاعی حصار پر فائز فوجیوں کے بیچوں بیچ، آنکھ کے جھپکے میں ایک دم چکما دے کر آگے بڑھا اور ایک ہی وار میں اونٹنی کی پچھلی ٹانگوں کی ریشہ دار نسیں کاٹ کر دوسری جانب سے نکل گیا۔

یہ آن کی فان میں ہوا تھا۔ فضا میں ایک دل خراش دہاڑ بلند ہوئی۔ یہ اس قدر دردناک اور گونج دار چیخ تھی کہ ہر شخص جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ دن بھر جاری رہنے والے شور شرابے، بجتے ہوئے بگل کی آوازوں، ہزاروں گھوڑوں کی ہنہناہٹ، مرتے ہوئے آدمیوں کی چیخ وپکار، حملہ کرتے ہوئے جنگجوؤں کی دہاڑ، ہودج سے مسلسل لعن طعن اور ملامت اور جنگ کی افراتفری لوگوں کو روک نہیں پائی تھی مگر اب ایک جانور کی نسیں کیا کٹیں، اس اونٹنی کا درد کی شدت سے ڈکرا کر گرنا تھا کہ لوگ جہاں تھے، وہیں جم کر رہ گئے؟ 'میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی اونچی آواز میں کسی اونٹ کو یوں چیختے، درد سے بے حال ہو کر چکراتے ہوئے نہیں دیکھا'، ایک جنگجو اس وقت کا حال بیان کرنے لگا تو گویا اسے جھرجھری آگئی۔ شاید اس اثر کی وجہ یہ تھی کہ جب اونٹنی کا چیخنا چلانا، درد سے ڈکرانا بند ہوا تو اس کے بعد چاروں طرف ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ دن بھر کے شور شرابے اور ہنگامے کے بعد یہ خاموشی جیسے ہر شخص کے اندر سیپ کر گئی۔

علی کے آدمی، عائشہ کے لشکر کے باقی ماندہ لوگوں کے شانہ بشانہ کھڑے اونٹنی کو کافی دیر تک پہلے لڑکھڑاتے اور پھر ایک دم زمین پر گرتے ہوئے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ اونٹنی دھڑام سے زمین بوس ہوئی تو انہیں بھی ایک دم ہوش آگیا، گویا کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ وہ دوڑ کر آگے بڑھے اور ہودج کو تھامنے والی رسیاں کاٹ کر اسے الگ کیا۔ عائشہ بدستور اندر ہی رہیں۔ ہودج کو اسی حالت میں اٹھا کر سیدھا زمین پر ٹکا دیا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ جیسے اونٹنی سے گرتے ہی انہیں بھی اچانک حقیقت کا ادراک ہو گیا ہو۔ جیسے باقی لوگوں کی طرح وہ بھی، ابھی ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ ہودج کے اندر سکوت اتنا ہی شل کر دینے والا تھا جتنا کہ دن بھر اس کے اندر سے ابھرنے والا شور رہا تھا۔

بالآخر ام المومنین کو قابو کر لیا گیا تھا لیکن اب سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آگے کیا کریں؟ کسی شخص میں ہمت نہیں تھی کہ بڑھ کر ہودج کے اندر جھانکے یا عائشہ کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرے۔ یہ دیکھ کر علی نے محمد بن ابو بکر، یعنی اپنے لے پالک بیٹے اور عائشہ کے سوتیلے بھائی کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا اور ہودج کو اوپر اٹھایا، پھر لوہے کی زرہ کے پردے کو ہٹایا اور پوچھنے لگا،

'کیا آپ ٹھیک ہیں؟'

'میرے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا ہے'، عائشہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ان کے بازو میں کاندھے کے قریب واقعی ایک تیر گوشت میں پیوست تھا۔ ہودج کی زرہ میں سے صرف ایک ہی تیر پار ہو سکا اور یہی تیر عائشہ کو زخمی کر گیا۔ عائشہ کے سوتیلے بھائی نے آگے بڑھ کر تیر کو پکڑا اور ایک ہی دفعہ میں کھینچ کر باہر نکال لیا۔ یقیناً عائشہ درد سے بے حال ہو گئی ہوں گی مگر انہوں نے منہ سے ایک آہ بھی نہیں نکلنے دی۔ شکست کھا کر بھی، عائشہ کی طبیعت اور انا انہیں کسی بھی طرح سے کمزوری ظاہر کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔

ہودج کے اندر ہی سے عائشہ نے اگرچہ جنگ تو نہیں مگر اس لڑائی میں شکست مان لی۔ وہ اونچی آواز میں گویا ہوئیں، 'اے علی علیہ السلام، ابو طالب کے بیٹے! تمہیں فتح مل گئی ہے۔ تم نے اپنی فوجوں کو خوب لڑایا اور وہ اس امتحان میں کامیاب رہے۔ اب تمہیں چاہیے کہ صلہ رحمی کرو!'۔ 'اے ماں! اللہ تمہیں معاف کرے'، علی نے جواب دیا۔

'اور تمہیں بھی!' عائشہ نے جیسے ذو معنی انداز میں کہا۔ علی نے ان کے اس طرح جواب کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

جیسا کہ عائشہ نے کہا تھا، صلہ رحمی کا ہی سلوک کیا گیا۔ علی نے اپنے لے پالک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ عائشہ کو اپنی حفاظت میں بصرہ پہنچائے۔ ان کے زخموں کا علاج کیا جائے اور ان کے ساتھ ہر طور عزت اور احترام کا سلوک کیا جائے۔ جب علی نے یہ حکم جاری کر دیا تو تب جا کر عائشہ ہودج سے باہر نکلیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر میدان سے لے جائی گئیں۔ کیا وہ اب اس سارے وقوعے پر پشیمان تھیں؟ کیونکہ وہ کہے جاتیں، 'اے اللہ! کاش میں اس دن کو دیکھنے سے دو دہائیاں پہلے ہی مر کیوں نہ گئی؟' یہ کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ شکست کی وجہ سے ایسا کہہ رہی تھیں؟ یا انہیں اپنے اقوال و افعال پر پشیمانی تھی؟ یا کیا وہ اپنی کمان میں مرنے والے ہزاروں جنگجوؤں کے نقصان پر افسردہ تھیں؟

علی میدان میں ہی رکے رہے۔ جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے گئے، علی لاشوں سے بھرے میدان میں پیدل چلتے رہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، وہ بھی یہی بات کہتے جاتے جو کچھ دیر پہلے عائشہ کہتی ہوئی رخصت ہوئی تھیں، 'اے اللہ! یہ دن دیکھنے سے دو دہائیاں پہلے ہی میں مر کیوں نہیں گیا؟' وہ بھی واضح طور پر میدان کا حال دیکھ کر سخت مایوس اور افسردہ تھے۔ چنانچہ رات گئے تک میدان میں یوں ہی پیدل پھرتے رہے۔ ان کے لشکر کے فوجیوں نے دیکھا کہ وہ ہر لاشے پر جا کر کھڑے ہو جاتے۔ کچھ دیر کے لیے ٹھہرتے اور مرنے والے کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے۔ وہ ہر لاشے، اپنی اور عائشہ کی فوج، دنوں کے جنگجوؤں کی لاشوں پر فاتحہ پڑھتے جاتے۔ مرنے والوں میں کئی ایسے تھے جنہیں علی ذاتی طور پر جانتے تھے۔ علی ان لاشوں پر کھڑے ہو کر ان کی بہادری کا ذکر کرتے اور ان کی موت پر دکھ کا اظہار کرتے۔ وہ اس منظر کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی اتنی لاشیں دیکھ کر وہ خود پر قابو نہیں کر پا رہے تھے۔ مسلمانوں نے دوسرے مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ وہ میدان جنگ کے اس ہولناک منظر کو دیکھ کر بولے، 'آج میرے زخم تو مندمل ہو گئے'، وہ رونے لگے، 'مگر افسوس، میں نے اپنے ہی لوگوں کا خون کر دیا!'۔

علی اگلے تین دن تک یہیں قیام کریں گے۔ اپنے تئیں وہ تلافی کرنے کی کوشش میں جت جائیں گے مگر یہ گھاؤ اس قدر گہرا ہو گا کہ پھر کبھی بھرنے میں نہیں آئے گا۔ جنگی قیدیوں اور زخمیوں کو زک پہنچانے یا قتل کرنے سے روک دیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ یہ مرتد نہیں بلکہ نیکوکار مسلمان ہیں۔ ان کے ساتھ انتہائی عزت اور احترام کا سلوک کیا جائے۔ وہ جو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، ان کا پیچھا نہ کیا جائے۔ وعدہ کیا گیا کہ تمام قیدیوں کو علی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد رہا کر دیا جائے گا۔ میدان سے اکٹھا ہونے والا مال غنیمت، تلواریں، خنجر، زیورات اور سامان واپس لوٹانے کا حکم بھی ہوا۔ علی نے اپنی فوج کے جنگجوؤں کو ازالے اور لوٹا دیے جانے والے مال غنیمت کے عوض بصرہ کے مال خانے سے ادائیگی کرنے کے احکامات جاری کیے۔

دشمن کی فوج سے تعلق رکھنے والے مقتولین کو بھی اسی عزت اور احترام سے دفن کیا گیا جس طرح علی

کی فوج میں جاں بحق ہونے والوں کے ساتھ عزت اور منزلت کا سلوک ہوا۔ سینکڑوں کی تعداد میں کٹے ہوئے ہاتھ، بازو اور ٹانگیں ایک ہی جگہ پر جمع کر کے ایک اجتماعی قبر کھود لی گئی اور یہ سب اس میں دبا دیا۔ جب یہ سب ہو چکا، یعنی مرنے والے آخری فوجی کی لاش بھی احترام کے ساتھ دفن ہو چکی تو علی نے میدان سے کوچ کیا اور بصرہ جا پہنچے۔ یہاں انہوں نے پورے شہر کے سامنے خلیفہ کی حیثیت سے دوبارہ حلف لیا اور لوگوں نے قطاریں بنا کر پھر سے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

علی نے لڑائی کے بعد پوری کوشش کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح تصفیہ کو ممکن بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ احسن سلوک جاری رکھنے کی تاکید کی تاکہ تلخی کم کی جا سکی۔ جہاں باقیوں کے ساتھ صلہ رحمی برتی گئی، علی عائشہ کے ساتھ کہیں بڑھ کر نرمی کے ساتھ پیش آئیں گے۔ عائشہ ہی اس لشکر کو میدان تک لائی تھیں مگر اب ان کے ساتھ سختی برتنا یا خواہ مخواہ کسر شان کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو شرمندہ کرتے پھرتے۔ اس سے کہیں بڑھ کر یہ اسلام کی بے عزتی تھی۔ چنانچہ علی نے اس موقع پر ایک دفعہ پھر سے انتقام کی بجائے اتحاد اور یگانگت کا راستہ چنا۔ جب عائشہ کے بازو میں آنے والا زخم مندمل ہو گیا تو علی نے محمد بن ابو بکر کو ذمہ داری سونپی کہ وہ اپنی حفاظت میں انہیں واپس مدینہ لے جائیں۔ ان کے اس سفر میں یقینی بنایا گیا کہ بصرہ سے چند عورتیں بھی ان کے ہمراہ رہیں تاکہ راستے میں ان کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھا جا سکے۔ پھر جب ان کا قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا، عائشہ نے علی کی طرف سے برتی جانے والی مہربانی اور تواضع کا اعتراف کیا، یا کہیے کم از کم انہیں اس کا پوری طرح سے ادراک ہو چکا تھا۔

'میرے بیٹو!' عائشہ نے رخصت ہونے سے قبل بصرہ کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا، 'یہ درست ہے کہ ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کے ناقدین میں شامل ہیں لیکن خدارا، آج کے بعد کبھی اپنے دل میں دوسروں کے لیے کدورت اور بخل کو جگہ نہ دینا۔ اللہ کی قسم، میرے اور علی کے بیچ اس سے زیادہ کبھی کوئی چپقلش نہیں رہی جتنی کہ ایک عورت اور اس کے سسرالیوں کے بیچ عام ہوتی ہے۔ ماضی میں، میں نے جو کچھ بھی کہا، اس کے باوجود علی نے اپنے آپ کو ایک بہترین اور اعلیٰ ظرف مرد ثابت کیا!'

عائشہ کی طبیعت اور انہیں قریبی جان پہچان والے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کسی دوسرے شخص، بالخصوص علی کی جانب سے برتی جانے والی عنایت اور رعایت پر اعترافی تقریر میں یہیں، اسی حد تک جاسکتی تھیں۔ ان کا لہجے میں مسکینی اور عاجزی جھلک رہی تھی۔ یہی بہت تھا کہ انہیں اب جا کر ادراک ہو گیا تھا یا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اگر کچھ بھی نہ کہتیں تو بھی سچائی صاف صاف نظر آرہی تھی۔ مگر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ عائشہ نے ایک وسیع اور طاقتور سلطنت کے امور کو گھریلو جھگڑوں میں خلط ملط کر دیا تھا۔ انفرادی سطح پر رنجشوں کا اجتماعی پیمانے پر خمیازہ اتنا بڑا تھا کہ سوچ دنگ رہ جاتی ہے۔ سلطنت کو بے تحاشہ نقصان اٹھانا پڑا اور ہزاروں کی تعداد میں امتی اپنی جان سے گئے۔ عائشہ کا یہ بیان ایک طرح سے علی کو بطور خلیفہ ماننے کا بھی عندیہ تھا۔ انہوں نے خود اپنی زبان سے اس کا کبھی صاف اظہار تو نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے باقاعدہ رسمی طور پر علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ لیکن علی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہیں۔ عائشہ کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی، شاید ایسا کبھی نہ کر سکتیں۔ ویسے بھی، اس بات پر زور دے کر یا زبردستی ان کو منوانے میں کچھ نہیں رکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی اور اب بھی اگر بات بڑھائی تو اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلے تھے۔ 'اللہ کی قسم، اے مسلمانو! ' علی نے عائشہ کی تقریر کے جواب میں کہا، 'عائشہ نے سچ کہا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ یاد رکھو، عائشہ رسول خدا کی بیوی ہیں اور وہ ہمیشہ ان کی بیوی رہیں گی'۔ پھر وہ اپنے بیٹوں حسن اور حسین علیہ السلام کو ہمراہ کیے عائشہ کے قافلے کو رخصت کرنے خود ساتھ نکلے۔ جیسا کہ اس زمانے میں عزت بخشنے کا رواج تھا، وہ سفر کے پہلے چند میل گھوڑے پر سوار ہو کر، عائشہ کے قافلے کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ بصرہ شہر سے باہر پہنچ کر انہوں نے رخصت لی اور عائشہ کا مختصر قافلہ مدینہ کی طرف نکل گیا۔

عائشہ کی مندرجہ بالا اعترافی تقریر، انہوں نے اپنی مرضی سے انتہائی ضروری کام اور سوچ سمجھ کر کی۔ ایک قرض تھا جو انہوں نے گویا چکتا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن واپسی کے اس سفر پر، جب وہ جلد ہی واپس اپنے آبائی حجاز کی پہاڑیوں میں گھر پہنچ جائیں گی تو انہیں یہ خیال عود کر آرہا تھا کہ انہیں صرف لڑائی میں شکست نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی انہیں کئی دوسرے محاذوں پر پسپا ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے یہ خود کو کس مصیبت میں ڈال دیا تھا؟ یہ کیسی اذیت جھیل رہی تھیں؟ اگرچہ علی نے شکست کے بعد ان کے ساتھ

انتہائی بہترین رویہ روا رکھا تھا، انہیں عزت بخشی تھی۔ مگر سب لوگ علی جیسے تو نہیں تھے۔ علی کے حمایتیوں میں کئی ایسے بھی تھے جو علی کی طرح صرف اچھائی میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ عائشہ یہ سفر مکمل کر کے مدینہ میں مستقل سکونت اختیار کر لیں گی اور علی کی عنایت اور ضمانت کے باعث مزید کئی برس تک جئیں گی مگر جب تک زندہ رہیں، انہیں علی کے ایک ہمزاد کی کہی باتیں ہمیشہ کچوکے لگاتی رہیں۔ ابھی وہ بصرہ میں تھیں۔ علی کا یہ رشتہ دار اجازت لیے بغیر ہی عائشہ کے رہائشی کمرے، جہاں وہ زیر علاج تھیں، گھس آیا اور انہیں بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ اس کے نتھنے غصے سے پھول رہے تھے اور وہ دیر تک دشنام طرازی کرتا رہا۔

وہ انہیں یاد دہانی کرانے لگا کہ دراصل یہ وہ تھیں جنہوں نے لوگوں کو عثمان کے خلاف اکسایا تھا۔ پیغمبر کی چپل اٹھا کر مسجد میں چلی آئی تھیں۔ کہنے لگا کہ آخر اس تماشے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو ہر اس چیز کی نفی تھی جس کے لیے محمد ﷺ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے۔ وہ عائشہ کو طعنے دیتے ہوئے کہنے لگا، 'اگر تمہارے ہاتھ پیغمبر کا ایک بال بھی آ جائے تو تم اس کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کرو گی'۔ اس کی زبان درازی رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ بدتر تو یہ ہوا کہ اس نے کہا کہ عائشہ نے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے لڑایا، گویا اس طرح قران کے احکامات کی نفی کی۔ الہامی پیغام کو رد کر دیا۔ یہ تو انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اب وہ چونکہ ہتھے سے اکھڑ چکا تھا، عائشہ سے مزید کہنے لگا، 'تمہاری ہمت کس طرح ہوئی کہ اہل بیت (یعنی محمد ﷺ کے گھرانے) کو للکارتی رہی ہو؟ ان پر ٹوک لگاتی آئی ہو؟' وہ کہتا رہا، 'ہم محمد ﷺ کے گھر سے ہیں۔ ہم ان کا خون ہیں۔ ہم ان کی اولاد ہیں۔ تم کون ہو؟ بلکہ، تم ہوتی کون ہو؟ تم تو ان کے پیچھے رہ جانے والی، نو بیویوں میں سے صرف ایک بیوی ہو، ان کے گھر کا مال ہو۔ ویسے بھی، تمہاری حیثیت کیا ہے؟ تمہارے یہاں تو اولاد بھی نہیں ہے۔ تم ٹنڈ منڈے درخت جیسی ہو جس کی جڑ ہوتی ہے، ہرے پتے اور نہ ہی سایہ ہوتا ہے۔ بس اسے ٹیک مل جائے تو بڑی بات ہے'۔

عائشہ کے لیے یہ سب سننا کس قدر دشوار رہا ہو گا؟ انہوں نے اس طرح لعنت و ملامت پر خود پر کیسے قابو کیے رکھا؟ عام حالات ہوتے تو شاید وہ اس شخص کا منہ نوچ لیتیں، زبان گدی سے کھینچ کر ہاتھ پر دھر

دیتیں۔اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ انہیں محمد ﷺ کی نو بیویوں کے برابر گردان رہا تھا؟ وہ بھی اتنی تلخی سے؟ انہیں محمد ﷺ کے گھر کی صرف جنس، مال قرار دے رہا تھا؟ وہ عورت جو ہمیشہ یکتائی پر مصر رہی، اسے دعوی رہا کہ وہ محمد ﷺ کی پسندیدہ بیوی تھی اور ان کے انتہائی قریب تھی۔اس کے لیے تو یہ بے انتہا بے عزتی کی بات تھی۔یہی نہیں، اس شخص نے عائشہ کو لاولدی کا طعنہ کیسے دے دیا؟ اتنی تضحیک؟ مثال بھی ایسی کہ اندر تک کاٹ کر رکھ دے۔جڑ، شاخیں، پتے اور نہ ہی سایہ۔۔۔یہ کس قدر ہتک کی بات تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر، وہ یہ سوچتی ہوں گی کہ یہ ان کا کیا حال ہو گیا کہ ایک شخص منہ اٹھائے آتا ہے اور ان کے منہ پر یہ سب سنا کر چلا جاتا ہے؟ حالت یہ ہے کہ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتیں؟ یہ کیا حال ہو گیا بلکہ یہ انہوں نے اپنا کیا حال بنا لیا؟ وہ مرتے دم تک اس حال اور اس شخص کی کہی باتوں کو بھول نہیں پائیں گی۔ وقت آخر بھی وہ اس شخص اور خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔

باب 10

یہ وہ دن تھا جس کا علی اور ان کے حمایتیوں کو کافی عرصے سے انتظار تھا۔ طلوع ہونے والا سورج صحیح معنوں میں ان کے نام تھا۔ جنگ جمل میں حیران کن فتح کے بعد پہلی بار ایسا لگ رہا تھا کہ علی کے پیر واقعی جم چکے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اسی تابناک دن میں ان کی فتح کا سورج ہزاروں نیکوکار مسلمانوں کے خون سے گہنایا ہوا بھی تھا۔ علی کو یہ احساس بھی ضرور ہی کچوکے لگاتا ہو گا کہ وہ چیز جس کی ایک طویل عرصے تک تمنا کیے رکھی، ہاتھ آتے ہی اب کھسکنا شروع ہو چکی تھی۔ انہیں خلافت سنبھالے بمشکل چار ماہ ہی گزرے تھے اور اس دوران کیا سے کیا ہو گیا؟ اب وہ صرف ساڑھے چار برس ہی مزید اس منصب پر ٹک پائیں گے۔

اوائل دور کے اسلامی مورخین نے جس طرح علی کے اس مختصر دور خلافت کا حال بیان کیا ہے، اس پر ہر لحاظ سے کلاسیکی المیہ کا گماں ہوتا ہے۔ کلاسیکی المیہ ایک ادبی اصطلاح ہے جس سے مراد کسی تاریخی شخصیت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا ایسا تسلسل ہے جو ارسطو کے بقول پڑھنے سے 'دلوں میں خوف اور رحم کے جذبات' پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ میں جس شخص کی یہ کہانی ہے، وہ انتہائی پارسا اور راست باز حکمران ہے جو اپنی شخصی خوبیوں کے ہاتھوں زیر ہو جاتا ہے۔ تفصیل سے پڑھیں تو یہ ایک ایسے آدمی کی داستان معلوم ہوتی ہے جو انتہائی اصول پسند واقع ہوا ہے۔ وہ مرتے دم تک اپنی اصلیت یعنی بنیاد سے جڑا رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے قتل بھی کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسے حکمران کا قصہ ہے جو دوستوں اور دشمنوں دونوں کی ہی عداوت اور بغض کا برابر شکار ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی قسمت نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ بد قسمتی کا دور پہلے دن ہی شروع ہو گیا اور تب تک چلتا رہا جب تک کہ وہ تھک ہار کر جان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھا۔ تقدیر کا لکھا ان کی زندگی اور اختیار، دونوں کو ہی لے ڈوبا۔

مثلاً، علی نے خلافت کن حالات میں سنبھالی تھی؟ یہ فاسد اور بگڑا ہوا زمانہ تھا۔ ایسی صورتحال تھی جس پر ان کا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ انہوں نے اپنے تئیں عثمان کے قتل کو روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ بلکہ حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی زندگی کے پچیس سال اسلام کی بقاء اور امت کے بیچ اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے قربان کر دیے اور جانی مانی فہم اور فراست کو پس پشت ڈال دیا

تھا۔ اپنے اس مطالبے سے پیچھے ہٹ کر بسر کی جوان کے تئیں جائز حق تھا لیکن پھر بھی معاملات یوں بگڑے کہ مثال ریت ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے۔ اس سب کے باوجود بھی وہ ابھی تک امت کو یکجا رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ مگر وہ جو تدبیر کر لیں، پھوٹ اور بدامنی کا یہ بھیانک خواب ختم ہونے میں نہیں آئے گا۔ جس قدر اس سے کنی کترائیں گے، اتنی ہی تندی سے سیدھا مرکز میں لا کر کھڑے کر دیے جائیں گے۔ اس داستان میں فتنے کا اژدھا انہیں نگل لے گا۔

قسمت نے علی کے ساتھ عجب کھیل کھیلا تھا۔ تاریخ انہیں عجب موڑ پر لا کر چھوڑ گئی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ دعا مانگنے میں بھی احتیاط کرنی چاہیے اور خواہش دیکھ بھال کر پالنی چاہیے۔ لڑائی کے بعد جب علی میدان جنگ میں بکھری لاشوں میں سے ہر شخص کے سر پر کھڑے ہو کر اس کے حق میں دعا مانگتے ہوں گے، ایک کے بعد دوسرے واقف کار کو یوں بد حال ہوا دیکھتے ہوں گے تو ان کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی بات گردش کرتی ہو گی جو سہ پہر کو عائشہ بھی کہہ گئی تھیں۔ ہر لاشے کو دیکھ کر وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ یہ دن دیکھنے سے پہلے وہ مر کیوں نہیں گئے؟ علی نے عائشہ کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کیا تھا۔ انہیں بخش دیا تھا۔ اگر وہ نہ بھی کہتیں تو علی اچھائی سے ہی پیش آتے لیکن ان کی طبیعت میں یہ نرمی بھی کسی کام آئی؟ فتنہ تو پھر بھی ناسور کی طرح پھیل گیا۔ ان کی فطرت میں پائی جانے والی خوبیاں خانہ جنگی کو تو روک نہیں لگا سکیں۔ جس چیز کا سب سے زیادہ خوف تھا، وہی ہو کر رہی۔ اس سے بھی بدتر یہ تھا کہ علی کی طبیعت میں یہ بھلائی اگر ابھی تک امت کے کسی کام نہیں آئی تو آخر کار ان کو بھی لے ڈوبے گی۔ وہ ابھی پوری طرح سے سمجھ نہیں پائے تھے لیکن جلد ہی وہ اچھی طرح جان جائیں گے کہ یہ تو صرف ایک لڑائی تھی۔ اصل جنگ تو ابھی شروع ہوئی ہے۔

علی کا ڈراؤنا خواب ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس جنگ میں کہیں زیادہ طاقتور اور مہیب حریف دور بیٹھا موقع تاڑ رہا ہے۔ دمشق میں شام کے گورنر معاویہ اس عرصے میں خاموشی سے علی کو خانہ جنگی میں گھرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ معاویہ کے حکم پر عثمان کی خون آلود قمیص اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں ابھی تک پر ہر روز نئے جوش و خروش سے مسجد کے منبر پر سجائی جاتی تھیں۔ یہ نشانیاں ہر چڑھتے دن

کے ساتھ علی کے ان حالات میں خلافت سنبھالنے کے جرم کا ثبوت بن کر شامی لوگوں کے دل و دماغ میں گھر کر رہی تھیں۔ اگرچہ شامی فوجیوں نے تو عثمان کے قتل پر فوراً انتقام کی ٹھان لی تھی لیکن معاویہ کو جلدی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ اگر عائشہ کامیاب ہو کر ان کے حصے کا کام بھی کر لیتی ہیں تو ظاہر ہے، انہیں خواہ مخواہ اس آگ میں کودنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اب چونکہ عائشہ کو شکست ہو چکی تھی، اس لیے معاویہ نے اپنی چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ معاویہ نے ناپ تول کر اندازہ لگایا کہ اگر علی فتح حاصل کرنے کے بعد عائشہ کے ساتھ اچھائی کا برتاؤ کر سکتے ہیں تو یہی فطرت، ان کی کمزوری بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ ایسا ہتھیار ہے جو علی کو خود بخود تباہی کے دہانے تک لے جائے گا۔

یہ معاویہ نام جو ہے، اس کی چار صوتی لہریں ہیں۔ مو، ہا، وی اور یا۔ آنے والی صدیوں میں اس نام میں ہر صوت، اس کا ہر لفظ اور ایک ایک حرف شیعہ کے یہاں دشنام کا عنوان بن جائے گا۔ شیعہ چاہے معاویہ کو برا بھلا کہیں یا ان کے نزدیک وہ 'شیطانیت کا نچوڑ' ہوا کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں معاویہ واحد شخص تھے جن کے پاس اتنی سیاسی بصیرت اور عقل تھی کہ اسلام علی کی موت کے بعد بھی باقی رہا، لوگ پھر سے اکٹھے ہوئے۔ جس طرح شیعہ ان کو یاد کرتے ہیں، وہ کسی بھی طرح، جیسے کسی فلم کا یک رخی ولن ہوتا ہے، ویسے نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ان کی ظاہری شکل و صورت سے ایسا ہی گمان ہوتا ہو۔ تاریخ میں ان کا خاکہ کچھ یوں لکھا گیا ہے کہ توند نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ابھری ہوئی جیسے ابل رہی ہوں۔ پیروں میں گٹھیا تھی اور جوڑوں کے درد میں مبتلا تھے۔ اسی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتے تھے اور سیدھا کھڑے رہنے سے قاصر تھے۔ یہ تو ان کی ظاہری شکل و صورت تھی، جس میں کئی عیب رہے ہوں گے مگر ان جسمانی کمیوں کا ازالہ تیز اور غیر معمولی دماغ کی صورت پورا تھا۔ اگرچہ وہ علی کی طرح روحانی طور پر جوہر صفت تو نہیں تھے مگر فن حرب سے مالا مال اور سیاسی طور پر چابک دست تھے۔

معاویہ کی گورنری میں شام کے معاملات انتہائی احسن طریقے سے چل رہے تھے۔ اکثر کہا کرتے، 'انہیں کسی خوش نما جگہ پر پھوٹتے ہوئے تازہ پانی کے چشموں سے زیادہ کوئی چیز نہیں بھاتی۔۔۔' ان کا اشارہ شام کی طرف تھا۔ شام کے شہر دمشق میں ان کی حکومت تھی اور یہ اس قدر پھیلا ہوا متنوع شہر تھا کہ یہاں

'خوش نمائی' اور 'تازہ پانی کے چشمے' جاری رکھنا، کسی بھی حاکم کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ مگر یہ معاویہ کی ہی ذہانت اور قابلیت تھی کہ ایک عرصے سے یہاں معاملات خاصے پر امن چلے آ رہے تھے اور یہاں کے انتظام کا خاصا مشکل کام نہایت آسان معلوم ہوتا تھا۔ ان کی اپنی زبانی یہ روایت ملتی ہے کہ معاویہ ایسا شخص ہے 'جسے صبر اور غور و فکر کرنے کی نعمت عطا ہوئی ہے۔' مراد یہ تھی کہ وہ انتہائی زمانہ ساز اور چالاک واقع ہوئے تھے۔ یہ ایسی صفات ہیں جو قدیم بازنطینی سلطنت کی سیاست میں اہم تصور کی جاتی تھیں۔ قدیم شہر دمشق، جو ایک لمبے عرصے تک بازنطینی سیاست کا محور چلا آ رہا تھا، معاویہ اس چالباز شہر اور اس کے باسیوں کے معاملات کو خوش اسلوبی سے چلاتے آ رہے تھے۔ معاویہ نے لمبے عرصے تک یہاں حکومت چلا کر یہ سارے گر سیکھ لیے تھے۔ اب وہ اسی تجربے کو استعمال میں لا کر خلافت کے معاملات کو اپنے حق میں ہانک لائیں گے۔

معاویہ نے ایک دن عمر بن العاص جو ان کی فوج کے سپہ سالار اور نائب بھی تھے، ان سے پوچھا، 'تمہاری مہارت اور چالاکی کی حد کیا ہے؟' جرنیل فخر سے بولا، 'میں کبھی ایسی صورتحال سے دوچار نہیں ہوا کہ مجھے اس مشکل سے نکلنے کی تدبیر معلوم نہ ہو!'۔ معاویہ نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور نہلے پر دہلا پھینک کر بولے، 'مجھے دیکھو! میں کبھی کسی بھی ایسی صورتحال میں پھنسا ہی نہیں کہ اس سے نکلنے کی تدبیر سوچنے کی ضرورت پیش آیا کرے!'۔

آٹھ صدیاں پہلے میکاویلی نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کا عنوان، 'شاہ' یا 'شہزادہ' تھا۔ معاویہ اس عنوان کی بہترین مثال ہیں۔ وہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے اور پھر اسے ہر صورت برقرار رکھنے میں ماہر تھے۔ نتائج پر نظر رکھنے والا ایسا صاف نظر شاہ تھے، جو عمل پر یقین رکھتا تھا۔ جوڑ توڑ میں کوئی جوڑ نہیں تھا اور معاملات پر اثر انداز ہو کر نتائج بدلنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ وہ میکاویلی کے بقول، 'نیکی اور بدی سے مبرا ہوتا ہے'۔ چاہے اس کے لیے رشوت کا سہارا لینا پڑے، خوشامد کرنی پڑے، ذہانت کا استعمال ہو یا پھر انتہائی عمدگی سے عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکار چالیں چلنی پڑیں۔ معاویہ کے والد، ابوسفیان مکہ کے نامی گرامی اور انتہائی دولت مند تاجر ہوا کرتے تھا، اثر و رسوخ بھی بے انتہا تھا۔ یہ خاندان محمد ﷺ کے

الہامی پیغام کے منظر عام پر آنے سے پہلے بھی جزیرہ عرب اور مشرق وسطیٰ، بالخصوص شام میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا تھا کیونکہ یہ ان کی تجارتی ضرورت تھی۔ ابو سفیان کی ملکیت میں دمشق کی کئی قیمتی املاک اور جائیدادیں تھیں۔ ابو سفیان نے مکہ کی اشرافیہ کے ساتھ مل کر محمد ﷺ کی پرزور مخالفت کی تھی لیکن بعد ازاں جب فتح مکہ کے موقع پر پرانی رنجشیں اور دشمنیاں بھلا دی گئیں تو دوستی اور خیر سگالی کا ثبوت دونوں خاندانوں میں رشتہ داری اور تعلق کو بڑھا ثابت کیا گیا۔ محمد ﷺ نے ابو سفیان کو عزت دی۔ خدیجہ کے بعد، آپؐ کی آٹھویں بیوی کا نام ام حبیبہ تھا۔ ام حبیبہ معاویہ کی بہن تھیں۔ یہی نہیں، آپؐ نے معاویہ کو بعد اس کے ہمراہ رکھا اور اپنے ذاتی انشاء نویس کے عہدے پر فائز کیا۔ معاویہ کے اس عہدے کی وجہ سے انہیں زیادہ تر وقت محمد ﷺ کے ساتھ گزارنا پڑتا بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آخری دنوں میں، جب آپؐ بستر مرگ پر تھے، معاویہ سارا وقت عائشہ کے کمرے میں موجود رہے۔ خود معاویہ کا بھی یہی کہنا تھا لیکن دوسرے لوگ جو ان دنوں آپؐ کے نزدیک رہے تھے، انہوں نے اس بات کا بطور خاص کہیں ذکر نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا عوام میں تذکرہ وہاں موجود باقی حاضرین کے اپنے مفاد میں نہیں تھا، جو سمجھ میں بھی آتا ہے۔

معاویہ کو شام کا گورنر مقرر کرنے والے اسلام کے دوسرے خلیفہ عمر تھے۔ بعد ازاں عثمان نے بھی ان کا یہ عہدہ برقرار رکھا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عثمان کا تعلق بھی بنو امیہ سے تھا بلکہ یہ دونوں ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔ ابتدا بارے یہ بات طے ہے کہ معاویہ امور حکومت چلانے میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے عمر نے انہیں اس انتہائی مشکل بازنطینی سیاست سے آلودہ صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ علی نے خلافت سنبھالی تو معاویہ کو شام پر حکمرانی کرتے، بیس سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ یہ صوبہ جس میں آج کی دنیا کے کئی ممالک جیسے ترکی، لبنان، شام، اردن، اسرائیل اور فلسطین شامل تھے، معاویہ کا گھر بن چکے تھے۔ اختیار اور اثر و رسوخ، مقبولیت کو دیکھا جائے تو یہ خطہ بجا طور پر معاویہ کی ذاتی جاگیر کہلایا جا سکتا تھا۔ ان کے طرز حکمرانی کے باعث یہ ان کی اصل طاقت تھا۔

یہ تو معاویہ کی گورنری کا حال تھا۔ خلافت کے معاملات میں اگر ان کا کوئی کردار رہا تھا تو وہ اب تک

انہوں نے وہ کام ہمیشہ پس منظر میں ہی رہ کر ادا کیا۔ یہ بات درست ہے کہ عثمان کے قتل میں ان کے ملوث ہونے کی افواہیں بھی گردش کرتی رہی تھیں۔ مثلاً پوچھا جاتا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ 'خفیہ خط' جس کی وجہ سے باغی ہتھے سے اکھڑ گئے، مروان نے معاویہ کے ہی کہنے پر جاری کیا ہو؟ اسی طرح، سوال اٹھایا جاتا کہ کیا معاویہ نے جان بوجھ کر خلیفہ کی جان بچانے کے لیے کمک روانہ کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا؟ بلکہ انہوں نے تو سرے سے اپنے چچازاد کی مدد ہی نہیں کی۔ اگر ان افواہوں میں کوئی سچائی تھی تو اس کا کبھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ ان کے بابت یہ سوالات ہمیشہ ہی بے جواب رہے اور معاویہ کی اس ضمن میں یہی مرضی تھی۔ وہ ان سوالوں کو ہمیشہ بے جواب ہی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس لیے کہ بالفرض اگر ان افواہوں میں کوئی سچائی تھی بھی تو بات خود بخود صاف ہو جاتی۔ لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ اصل طاقت کا منبع کہاں ہے؟ اور اگر یہ الزامات غلط بھی ثابت ہوتے تو بھی اس کا فائدہ معاویہ کو پہنچتا۔ یعنی ان کا اصل مقصد، یعنی حکومت برقرار رکھنے کی خواہش ثابت ہو جاتی اور لوگ انہیں اپنے خاندان کا خیر خواہ ہی سمجھتے۔ تو ظاہر ہے، ان افواہوں کی تصدیق یا تردید کیوں کی جائے؟ ہر دو صورت یہ افواہیں معاویہ کے حق میں استعمال ہو سکتی تھیں۔ لوگ انہیں اصل طاقت سمجھتے تھے۔ وہ کٹھ پتلیوں کا آقا کہلائے جاتے تھے۔ یعنی وہ جو پردے کے پیچھے رہ کر بونے نچاتا ہے۔ اگر ایسا تھا تو یوں ہی سہی، ویسے بھی ان کی شخصیت سے جڑی اس پراسراریت نے ان کا دبدبہ بڑھا دیا تھا۔ کوئی شخص معاویہ کو نظرانداز کرنے یا ان کے منہ لگنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ علی یہی فاش غلطی کر بیٹھے۔

معاویہ کی گورنری کے طویل عرصے میں ہمیشہ یہی لگتا رہا کہ وہ اپنے منصب پر خوش ہیں اور وہیں رہیں گے۔ حالانکہ، وہ اس تمام عرصے میں صحیح وقت کا انتظار کرتے رہے اور کمال صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے موقع تاڑ رہے تھے۔ انہوں نے اس دوران ذرہ برابر بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ٹک کر بیٹھے رہے اور انتہائی تعیش میں بسر رکھی۔ دمشق میں گورنر کے لیے نہایت شاندار محل جسے 'الحضراء' کہا جاتا تھا، تعمیر کروایا ہوا تھا۔ خضرہ کے مطلب سبز یا ہرے کے ہیں۔ چونکہ یہ محل بیش قیمت سبز سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا، دمشق میں یہ اپنی طرز کی پہلی عمارت تھی۔ اسی وجہ سے اس کا یہی نام مشہور ہوا۔ یہ اس قدر شاندار عمارت تھی کہ اس کے سامنے مدینہ میں عثمان کا محل کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک

طرح سے کہیے تو اس دور میں مدینہ اور دمشق، اختیار کی رو سے ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیے جا سکتے تھے لیکن اس کے باوجود عثمان اور معاویہ کے بیچ کبھی کسی چپقلش یا حسد کی کوئی خبر نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ معاویہ اور عثمان طبیعتاً دونوں ہی سخی واقع ہوئے تھے لیکن عثمان، معاویہ کی طرح سنگ دل نہیں تھے۔ معاویہ اور عثمان میں یہی فرق تھا۔ عثمان نے شام کے گورنر کی خلیفہ کے مقابلے میں یوں ریاست کے اندر ایک ریاست کو پنپتے دیکھ کر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ یہی کیا، عثمان بے رحمی سے قتل کر دیے گئے کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے باغیوں کے ساتھ سختی دکھانے سے انکار کر دیا تھا۔ معاویہ، عثمان کی طرح نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نرمی اور سختی کا معیار کیا ہونا چاہیے، کہاں رحم دلی سے پیش آنا ہے اور کون سا مقام ہے جہاں سنگ دلی کے بغیر گزارہ نہیں ہو گا۔

'اگر کسی شخص کی ڈور ایک بال جتنی باریک شے جتنی بھی میرے ہاتھ میں ہو تو میں اس بال کو ٹوٹنے نہیں دیا کرتا'، معاویہ کہا کرتے، 'اگر وہ اس بال کو کھینچتا ہے تو میں ڈھیل دیتا ہوں اور اگر وہ ڈھیلا پڑ جائے تو میں ضرور کھینچتا ہوں'۔ اسی طرح مخالفین سے نپٹنے بارے کہتے، 'جہاں کوڑے سے کام چل سکتا ہے تو میں کبھی تلوار استعمال نہیں کروں گا اور جہاں زبان سے بات بن جائے تو ایسی جگہ پر چابک سے مارنے کی کوئی ضرورت نہیں'۔

اسی طرح، اگر کوئی بات ناگوار گزرتی تو اس پر بھڑکتے نہیں تھے اور نہ ہی طاقت اور اختیار کے نشے میں دھت ہو کر فوراً حکم صادر کرتے۔ بلکہ ان کا ردعمل انتہائی پراسرار اور سک ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ہمیشہ ان کے سامنے کھڑا کوئی بھی آدمی نفسیاتی طور پر ہڑبڑا کر رہ جاتا۔ اس پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ شام کی افواج کے سپہ سالار نے روایت کی ہے کہ، ''جب کبھی میں دیکھتا کہ معاویہ اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے ہیں اور پھر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر، آنکھیں جھپکاتے ہوئے انتہائی حاکمانہ انداز میں کہتے کہ، 'بولو!' تو بخدا، سامنے کھڑے شخص پر ترس آنے لگتا۔' معاویہ نے اپنی اسی عادت کی وجہ سے کبھی اس بات پر بھی کبھی ردعمل ظاہر نہیں کیا جس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہ ان کا وہ لقب تھا جو ہند کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ ہند معاویہ کی ماں تھی۔ ہند کی نسبت سے معاویہ کو 'کلیجہ کھانے والی کا بیٹا' بھی کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے ان کے منہ پر

تو ایسا کہنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ لوگ پشت پر یہی پکارتے ہیں۔ وہ اس لقب میں چھپے طنز کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے کیونکہ اس زمانے میں اگر کسی کو باپ کی بجائے ماں کے نام سے یاد کیا جائے تو لوگ برا جانتے تھے۔ مطلب یہ کہ گویا ایسے شخص کے باپ کا پتہ نہیں ہے تبھی ماں کی نسبت سے مشہور ہے۔ معاویہ کی برداشت کی حد یہ تھی کہ انہوں نے اس پر بھی کچھ نہیں کہا، 'میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے بیچ کبھی نہیں آتا' اکثر کہا کرتے، 'اس وقت بیچ میں نہیں آتا جب تک کہ وہ اور ان کی زبانیں ہمارے اور ہماری حکومت کے بیچ نہ آجائیں۔' ویسے بھی، اس لقب پر پابندی لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہند کی شبیہ جس میں وہ حمزہ کا کلیجہ دونوں ہاتھوں میں تھامے چبا رہی ہے۔ اس کے منہ اور ہاتھوں سے خون نچڑ رہا ہے، اس قدر ہیبت ناک ہونے کے باوجود اب معاویہ کے ہی حق میں استعمال ہو رہی تھی۔ ایسی ماں کے بیٹے سے لوگ صرف خوف ہی نہیں کھاتے تھے بلکہ عزت کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔

علی چونکہ محمد ﷺ کے دیرینہ ساتھیوں میں سے تھے، ان کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ کسی بھی طرح سے معاویہ سے دبنے والے نہیں تھے۔ جوں ہی خلیفہ مقرر ہوئے، ان کا ارادہ عثمان کی طرز حکومت کی روش کو توڑنا تھا۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے پہلا کام ہی یہ کیا کہ عثمان کے نامزد کردہ تمام صوبائی گورنروں کو مدینہ بلا بھیجا۔ معاویہ کے سوا باقی تمام نئے خلیفہ کا حکم ملتے ہی فوراً مدینہ پہنچ گئے۔ دمشق سے معاویہ کی آمد تو دور کی بات، اس حکم کا کوئی جواب بھی نہیں آیا۔ معاویہ کسی بھی صورت علی کے ہاتھوں گورنری سے عہدہ برا ہونے پر راضی نہیں تھے بلکہ ان کا ارادہ تو الٹا خلیفہ کو ہی معزول کرنے کا تھا۔

علی کے مشیران نے ان خدشات کا کھلے عام اظہار کیا اور خبردار کیا کہ معاویہ کو اپنے ساتھ ملائے رکھنا انتہائی ضروری ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ان کا عہدہ یعنی شام کی گورنری برقرار رکھی جائے۔ کہا یہ گیا کہ بجائے معاویہ کو طیش دلائیں، علی کو سیاست سے کام لینا چاہیے۔ یعنی یہ کہ فی الوقت معاویہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ بہلاوے سے کام لیتے ہوئے للو پتو، وعدے پر ٹرخائیں۔ معاملات سنبھل جائیں تو صحیح وقت آنے پر مراد یہ کہ جب علی کے پیر جم جائیں، مشیران خود ہی گورنر سے نبٹ لیں گے۔ 'اگر آپ فی الوقت معاویہ کو بیعت پر راضی کر لیں تو انہیں جلد ہی ان کے عہدے سے

ہٹانے کی ذمہ داری میری ہے'، علی کے ایک سپہ سالار نے وعدہ کیا، 'میں یقین دلاتا ہوں کہ اس عارضی سیری کے بعد میں معاویہ کو صحرا کے بیچ لے جا کر ایسی جگہ چھوڑ آؤں گا جہاں اس کو آگے اور نہ ہی پیچھے کا کوئی راستہ سجھائی دے گا۔ اس طرح اے علی علیہ السلام! آپ کو کوئی نقصان پہنچے گا اور نہ ہی اس پر کوئی ندامت ہو گی'۔

علی نے یہ تجویز سختی سے مسترد کر دی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا، 'مجھے کوئی شک نہیں کہ تمہاری یہ تجویز اس دنیا کے لیے انتہائی کار آمد ہے لیکن مجھے تمہاری اور نہ ہی معاویہ کی پوشیدہ چالوں سے کوئی لینا دینا ہے۔ میں اپنے ایمان میں یوں کھوٹ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اپنے کسی آدمی سے اس طرح کی کسی بہیمانہ سازش کی توقع رکھتا ہوں۔ معاویہ کو کسی بھی صورت گورنر کے عہدے پر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ میں صحیح وقت تک تو کیا، دو دن کے لیے بھی اسے اس طرح کی حکمرانی کی اجازت نہیں دے سکتا'۔

لیکن ہوا کیا؟ جنگ جمل میں فتح کے وقت علی کو خلافت سنبھالے چار ماہ گزر چکے تھے مگر معاویہ ابھی تک شام کے گورنر تھے۔ معاویہ نے نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت بھی نہیں کی تھی۔ وقت آنے پر جواب بھی دیا تو اس میں کھلم کھلا انحراف تھا۔ علی کو خط لکھا، 'اے علی علیہ السلام! دھیان سے کام لو اور اگلا قدم سنبھل کر اٹھائیو ورنہ میرے ہاتھ بندھے نہیں ہیں۔ مجھ سے تمہیں اس قدر سخت جنگ ملے گی کہ یاد رکھو گے۔ یہ بھڑ ہر شے کو ہڑپ کر لے گی۔ اس میں ہر چیز جل کر خاک ہو جائے گی۔ عثمان کا قتل انتہائی گھناؤنا جرم تھا۔ اس قدر وحشت انگیز کہ جس نے سنا، اسی کے بال سفید ہو گئے۔ اس کریہہ جرم کا بدلہ سوائے میرے کوئی نہیں لے سکتا'۔

معاویہ کا مقصد علی کو طیش دلانا تھا اور یہی ہوا۔ علی کا جواب غضب ناک تھا، 'اللہ کی قسم! اگر معاویہ نے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت نہ لی تو میں اس کا معاملہ آہن سے طے کروں گا۔ اسے میری تلوار کا سامنا کرنا ہو گا'۔ اگرچہ مشیران نے احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا مگر علی نے اس خط میں ان کے خدشات پر کان نہیں دھرے، وہ اس خط میں بار بار معاویہ کے ساتھ سختی سے نبٹنے کی قسم کھاتے رہے۔

علی کے ایک مشیر نے ان سے کہا، 'اے علی علیہ السلام! تم یقیناً ایک جری اور بہادر آدمی ہو مگر یاد رکھو، تم لڑاکا نہیں ہو۔ تم جنگجو تو ہو مگر جنگجوئی تمہارا میدان نہیں ہے۔۔۔'

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ علی نے فوراً ٹوک دیا، 'کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایک لگڑ بگڑ کی طرح ٹانگوں میں سر دبائے، ایک کونے میں دبکا رہوں؟ وہ لگڑ بگڑ جو ہلکی سی آہٹ پر بھی خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے؟ پھر مجھے بتاؤ، میں حکومت کیسے کروں گا؟ میں خود اس صورتحال سے بچنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ کسی بھی طرح جنگ و جدل نہیں ہے۔ لیکن اللہ گواہ ہے، میں تمہیں بتا رہا ہوں، سوائے تلوار کے کوئی دوسرا حل نہیں ہے!'

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مشیر نے علی کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ علی اصل جنگجو تھے۔ ایسا جنگجو جو لڑنے کو تیار رہتا ہے مگر جنگ سے نفرت کرتا ہے۔ بالخصوص خانہ جنگی سے تو وہ کوسوں دور بھاگتا ہے۔ علی کو اگر جنگ کی چاہ نہیں تھی، پھر بھی جنگ جمل لڑی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بھلے قیمت کچھ بھی ہو، وہ اپنے مقاصد اور نظریات سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔ اگر اس کے لیے لڑنے کی نوبت آئی تو بھڑ جائیں گے۔ وہیں یہ بھی ہے کہ یہ جنگ علی کی مرضی نہیں تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ آخری وقت تک اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہے اور قریب تھا کہ امن پا لیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور اب ایک دفعہ پھر وہ بھرپور تیاری کے ساتھ میدان میں اتریں گے مگر مزید خوں ریزی سے حتی الامکان بچنے کی سر توڑ کوشش کریں گے۔ ان کا خیال یہ ہو گا کہ اب تک شاید معاویہ بھی خانہ جنگی بارے وہی خیالات پال چکے ہیں، جو ان کے اپنے بن گئے تھے۔ شاید یہ دونوں ہی خانہ جنگی کی ہولناکی کو سوچ کر ایک نئی جنگ سے باز رہیں۔

آنے والے وقت میں کئی لوگ کہیں گے کہ علی سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر کے نزدیک تو یہ سراسر حماقت تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جن کا خیال یہ ہے کہ علی کو اپنی عزت اور منزلت کا احساس اور یہ فخر لے ڈوبا۔ وہ معاویہ کے خلاف فوجی اقدامات سے ہچکچا رہے تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ ایک راست باز شخص کا مد مقابل ایسا آدمی تھا جو ہر طرح کی حدود سے خود کو مبرا سمجھتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ سمجھ بوجھ اور فہم و بصیرت ہمیشہ ہی اچھی چیز ہوتی ہے۔ یہ دونوں ہی سمجھتے تھے کہ علی اور معاویہ کے بیچ

جاری تندی اور پھر دور باشی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اگر حق حکمرانی ایک طرف تھا تو سیاسی مہارت دوسرے کے ہاتھ میں تھی۔ کسی ایک کو دوسرے پر سبقت حاصل نہیں تھی بلکہ یہ برابری کی ٹکر تھی۔ اب یہاں، صرف عقیدت مند ہی ہوں گے جو یہ سمجھیں گے کہ شاید راست بازی کا پلڑا بھاری ہو گا ورنہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ آخر کار بات دوسرے کی ہی چلے گی۔

معاویہ پر بیعت کے لیے دباؤ بڑھانے کے لیے علی نے حال ہی میں خوں ریز جنگ میں آزمودہ فوج کو بصرہ کے شمال میں واقع کوفہ کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ کوفہ، دمشق سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ علی نے یہاں لمبے عرصے تک قیام کا اشارہ دیا، اسی لیے کی تیاری اور انتظام شہر میں پہنچتے ہی شروع کر دی گئی۔ مدینہ لوٹ جانے کی بجائے یہاں ٹک کر پڑاؤ ڈالنے سے علی کا پیغام صاف تھا۔ وہ یہ کہ اگر معاویہ نے جنگ کی سوچی تو پورا عراق ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا۔

پہلے پہل کوفہ صرف ایک چھاؤنی ہوا کرتا تھا لیکن اب دیکھتے ہی دیکھتے، تھوڑے عرصے میں ہی فرات کے کنارے آباد یہ تیزی سے پھیلتا ہوا شہر بن گیا۔ دریا کے کنارے پر عثمان کے دور میں تعینات حکام کی شاندار رہائش گاہیں تھیں اور بازاروں میں ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔ علی نے سابقہ گورنر کے محل میں بسر کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے 'قصر الخبل' کہا کرتے جس سے مراد خبط یا بد عنوانی کا قلعہ تھا۔ بجائے اس کے، انہوں نے اپنا دفتر شہر کی مرکزی مسجد سے ملحق ایک کچے مکان میں لگا لیا اور وہیں رہائش اختیار کی۔ اعلان کیا گیا کہ اب مزید محلات کی تعمیر نہیں کی جائے گی۔ یہاں ہرے سنگ مرمر کی کوٹھیاں نہیں ہوں گی۔ اہل و عیال کے ساتھ کسی بھی طرح سے رعایت نہیں برتی جائے گی اور اقربا کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک ترجیحی روا نہیں ہو گا۔ اسی طرح عوامی فلاح کے معاملات میں قطعاً منافع خوری برداشت نہیں کی جائے گی۔ خلیفہ عدل و احسان، انصاف کی عمل داری کو یقینی بنائیں گے اور حکمرانی کا طرز دیانت اور صالحیت قرار پائے گا۔ کوفہ کے لوگ جلد ہی علی کے دلدادہ ہو گئے۔

اس کی صرف یہی وجہ نہیں تھی۔ عدل و انصاف کے پرچار اور اس ضمن میں عملی اقدامات سے فرق تو پڑا تھا، جس کی وجہ سے لوگ علی سے کافی خوش تھے۔ مگر عراقیوں کی خوشی کی اصل وجہ کوفہ کو نیا

دارالحکومت بنانے کا فیصلہ تھا۔ کوفہ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت کا مرکز بن چکا تھا۔ یہاں کے باسی اب 'صوبائی گنوار' اور 'جاہل، اجڈ بدو' نہیں تھے۔ وہ اسلام اور امت کا نئے مرکز کی اکائی تھے اور جس شخص نے انہیں یہ امتیاز دلایا تھا، یہ اس کے گن گاتے تھے۔ انتہائی تیزی سے پھیلنے والے اس شہر میں، خلیفہ بھی آ گئے تو یہاں جلد ہی طرح طرح کے لوگ آنے لگے۔ سامان تجارت لیے تجار، فصلیں اور اجناس اٹھائے دہقان، صنعت کار، مزدور پیشہ کاریگر، دانشور، عالم اور فنکار۔۔۔ الغرض یہ شہر جلد ہی خطے میں وہ حیثیت اختیار کر گیا جیسا آج کی دنیا میں تیزی سے آگے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کئی شہروں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جیسے آج، ویسے ہی تب بھی اس تنوع کی وجہ ان شہروں میں بہتر طرز زندگی کے واقعی مواقع تھے یا ان شہروں کی بابت ایسا مشہور ہوتا تھا۔ فارس کے لوگ، افغانی، عراقی اور کرد جو اگرچہ اسلام قبول کر چکے تھے مگر ابھی تک ان کی حیثیت دوسرے درجے کے مسلمانوں کی چلی آ رہی تھی۔ علی کی خلافت میں وہ امت کا برابر حصہ قرار دیے گئے اور سب کے ساتھ مساوات کا سلوک ہوا۔ عمر کے زمانے میں پنپنے والی عربوں کی امتیاز سے متعلق سوچ اور بعد ازاں عثمان کے دور میں امویوں کی برتر حیثیت پر اصرار ماضی کا قصہ بن چکے تھے۔ علی پیغمبر کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں سب سے قریبی ساتھی تھے، وہ اب ایک دفعہ پھر سے لوگوں کو نبی کے اصل، الہامی پیغام یعنی عدل، برابری اور امت کی یگانگت کی طرف لے جائیں گے۔ جلد ہی علی کے زیر انتظام علاقے کے مسلمانوں میں اتحاد اور یکجہتی کے آثار دوبارہ نظر آنے لگے۔

علی کوفہ میں مستقل بنیادوں پر منتقل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ معاویہ کے ساتھ شام کے معاملات نبٹتے ہی وہ فوراً مدینہ لوٹ جائیں گے لیکن آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ وہ دوبارہ کبھی مدینہ نہیں جاسکیں گے۔ ایک دفعہ جب یہاں جم گئے تو یہ بھی ہوا کہ اسلامی سلطنت کی طاقت خود بخود ہی عرب سے نکل کر اس خطے، بالخصوص کوفہ میں منتقل ہونے لگی۔ معاویہ ایک عرصے سے یہی چاہتے تھے۔ وہ پہلے ہی یہاں شام میں بسر رکھتے تھے، بلکہ اب تک تو یہی ان کی اصل طاقت کا گڑھ تھا۔ اب اس طرح، یعنی علی کے ہاتھ پر بیعت سے انکار کے قضیے میں انہوں نے اپنی اس سوچ کو بھی، غیر ارادی طور پر عملی جامہ پہنا دیا۔ یہ معاویہ کی سرکشی تھی جو علی کو یہاں تک لے آئی تھی اور علی کے پیچھے پیچھے اختیار خلافت اور ساری طاقت بھی یہیں آ گئی تھی اور آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ معاویہ کی یہی کھلم کھلا حکم عدولی عراق کو

'شیعت علی علیہ السلام' کا مرکز بھی بنادے گی۔ اسلام میں 'شیعہ اسلام'، یہیں پروان چڑھے گا۔

خیر یہ تو حالات کی نشاندہی ہے ورنہ اسلامی طاقت کے مرکز کا عرب سے نکل آنا اچنبھے کی بات نہیں۔ جلد یا بدیر ایسا ہو کر رہتا۔ وجہ یہ ہے کہ چونکہ عراق مشرق وسطیٰ کے وسط میں واقع ہے تو ظاہر ہے اس خطے کو چلانے کے لیے ساری طاقت قدرتی طور پر یہیں آن کر ٹکتی۔ اس خطے میں دجلہ اور فرات کے دریا بہتے تھے۔ ان دریاؤں کے کناروں پر واقع نشیبی میدان انتہائی زرخیز تھے۔ شمال میں جزیرہ کی ہری چراہ گاہیں تھیں اور قدیم تجارتی شاہراہیں اور تہذیبی مراکز اسی خطے میں واقع تھے۔ ایک طرح سے کہیے تو عراق کی مثال مشرق وسطیٰ کے قلب کی سی تھی۔ اگر اسلامی سلطنت کی طاقت کا مرکز اب عراق بن چکا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے کی سلطنتوں کا مرکز بھی یہی خطہ رہا تھا۔ جیسے یہیں پر قدیم شہر بھی آباد چلے آ رہے تھے۔ مثال کے طور پر سمیری تہذیب کا شہر 'ار' کوفہ سے سو میل دریا کے نشیبی علاقے میں واقع ہوا کرتا تھا۔ اشوریوں کی قدیم سلطنت کا دارالخلافہ 'نینوا'، آج کے عراقی شہر موصل کے قریب ہی آباد رہا۔ کوفہ سے چالیس میل دور شمال میں مشہور و معروف بابل کا عظیم الشان شہر ہوا کرتا تھا۔ پھر فارسی سلطنت کا جوہر کہلانے والا شہر 'مدائن' بھی تھا جو کسی زمانے میں جدید بغداد کی بغل میں آباد پر رونق آبادی ہوا کرتی تھی۔ اب قدیم زمانے سے چلی آ رہی روایت کے تحت، یہ خطہ جو جغرافیائی لحاظ سے اہم تھا اور یہاں زرخیز زرعی رقبے تھے، ایک دفعہ پھر مشرق وسطیٰ کے طول و عرض کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ کہیے، یہ صحیح معنوں میں مشرق وسطیٰ کی طاقت کا محور تھا، کسی بھی سلطنت کی طاقت اس خطے سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں سلطنتیں چاہے کہیں بھی پیدا ہوں، انہیں جوانی یہیں بیتانی پڑتی تھی۔ علی اور معاویہ دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ آج یا کل، وسیع سلطنت اسلامی کا انتظام درست طریقے سے چلانے کے لیے طاقت کا مرکز بھی یہیں بنانا تھا۔ یہ ناگزیر تھا۔

مکہ سے تعلق رکھنے والی اسلامی اشرافیہ یعنی بنو امیہ کے لیے طاقت اور اختیار کا یوں عراق اور شام میں جا کر ٹک جانا ایک بھیانک خواب کی مانند تھا۔ عثمان کی خلافت میں جو طاقت اور اختیار انہیں دوبارہ حاصل ہوا تھا، اب وہ کچھ بھی کر لیتے، دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ایک دفعہ

جزیرہ عرب بالخصوص مکہ اور مدینہ سے اختیار چھن جاتا اور عراق کے 'دوسرے درجے کے' وہ مسلمان، جنہیں اسلامی امت کا حصہ بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے، بااختیار ہو رہے تھے۔ بلکہ، یہ کیا بات ہوئی کہ وہ عربوں پر راج کیا کریں گے؟ ذرا عربوں کی حالت بارے غور کیجیے، اسلام کا مرکز وہاں سے نکلنے پر، بلکہ نکل کر غیر عربوں میں منتقل ہونے پر ان کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے، چونکہ یہ قبائلی تھے تو ان کے لیے عزت اور غیرت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھنے لگے۔ ان کے نزدیک اب غیروں، یعنی 'صوبائی لچوں اور لفنگوں' کا اختیار چلتا تھا اور ذرا دیکھو تو، انہوں نے علی کا مستعدی اور پرجوش انداز میں کیسے ساتھ دیا تھا؟ کیا مکہ اور مدینہ کو کونے سے لگا دیا جائے گا؟ یہ دونوں شہر اب کیا صرف حج اور زیارت کی جگہ رہ جائیں گے؟ یہی نہیں، مکہ اور مدینہ طاقت کے مرکز سے انتہائی دور واقع ہوں گے تو پھر ان کی سلطنت میں حیثیت کیا ہو گی؟ کیا اب ان دونوں شہروں کی مثال اس تماشائی جیسی ہو گی جس نے ایمان کے زور پر قائم اس ریاست کا بیج بویا تھا۔ اس کی آبیاری کی تھی اور اب جب یہ پھیل کر عظیم الشان سلطنت کا تناور درخت بن گئی تو کیا مکہ اور مدینہ ایک طرف کھڑے ثمرات کو بٹتے ہوئے دیکھتے ہی رہ جائیں گے؟

اس دور میں، عربوں بالخصوص اشرافیہ کے ذہنوں میں پنپنے والی یہی سوچ بعد ازاں ایک نئے انداز میں عملی شکل اختیار کر لے گی۔ اسی اشرافیہ کی اگلی نسلیں مستقبل کے کئی اسلامی سلطنتیں اور خلافتیں، حکومتیں قائم کریں گے اور ٹھسے سے حکمرانی کیا کریں گے مگر وہ پھر دوبارہ کبھی بھی عرب میں بسر نہیں کر سکیں گے۔ صدیاں گزر جائیں گی اور اسلامی سلاطین کی طاقت عراق، شام، ایران، مصر تک پھیل جائے گی۔ یہاں تک کہ سپین، ہندوستان اور ترکی میں بھی ان کی حکومتیں ہوں گی مگر جزیرہ عرب میں دوبارہ کبھی اسلامی سلطنت کا مرکز نہیں بن پائے گا۔ بلکہ یوں ہو گا کہ حجاز اسلام کے ریاستی اور انتظامی معاملات سے کٹ کر بہت دور ہو جائے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ ان معاملات میں جزیرہ نما عرب کی حیثیت قدیم دور، یعنی اسلام سے پہلے کے زمانے کی سی ہو جائے گی۔ ایک طرح سے کہیے، یہ خطہ باقی اسلامی سلطنت سے دور ہو جائے گا اور یہاں صرف لوگ حج اور زیارت کے لیے آیا کریں گے۔ یہ خطہ سیاسی طور پر کٹ جائے گا اور یہاں کے مقامی عربوں کی حالت یہ ہو گی کہ وہ کسی بھی طرح سے اسلامی دنیا پر اگلے کم از کم ایک ہزار برس تک سیاسی اثر و رسوخ کھو دیں گے، بلکہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔ زمانے کی

دھول میں اٹھارہویں صدی آن پہنچے گی، جب بنیاد پرست وہابی گروہ دوبارہ سے جڑیں پکڑے گا اور یہ عراق میں شیعہ کے نزدیک مقدس مقامات، مقبروں، درگاہوں اور تبرکات خانوں پر حملے کریں گے، بلکہ مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات میں بھی کئی کاروائیاں ہوں گی۔ بعد ازاں بیسویں صدی میں سعود خاندان کے ساتھ الحاق کر کے یہاں سعودی بادشاہت کا حصہ، بلکہ بنیاد بن جائیں گے اور یوں وہابیوں کا اثر ورسوخ دنیا بھر میں پھیل جائے گا اور آج اکیسویں صدی میں بدستور یہی حالت قائم نظر آتی ہے۔ جزیرہ نما عرب و حجاز کا یہ خطہ جو تیل کی دولت سے مالا مال ہے، آج سعودی عرب کہلاتا ہے، ایک دفعہ پھر دولت اور عالمی سیاسی منظر نامے پر اپنی حیثیت کی وجہ سے دوبارہ اسلام میں مقام حاصل کر لے گا۔ مطلب یہ کہ جزیرہ عرب و حجاز ایک دفعہ پھر بڑی حد تک وہ حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جو کبھی اس کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ مغربی طاقتیں جو تیل کی بھوکی ہیں، وہ بھی سعود کے شاہی خاندان کا ساتھ دیں گی۔ جدید دور میں یہیں پر شدت پسند سنی تحریک جنم لے گی جو آگے چل کر مغرب کے لیے بڑا خطرہ بن جائے گی مگر مغربی طاقتیں جو عام طور پر جمہوریت کے گن گاتے نہیں تھکتیں، تیل کی دھن میں سعودی عرب بلکہ خلیج کی تمام عرب ریاستوں میں شہنشاہیت کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گی۔

خیر علی کوفہ میں آن کر بس گئے تو اب صرف ایک چیز تھی جو معاویہ کے مقاصد میں اگلا قدم اٹھانے کے لیے دستیاب ہونا ضروری تھی۔ وہ چیز یہ تھی کہ انہیں علی کے خلاف جنگ میں شامی عوام کی بھرپور اور غیر مشروط حمایت درکار تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ صرف لوگوں کی رضامندی یا جنگی تجویز کی ہاں میں ہاں ملانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ ان کا اس بابت حتمی قدم تبھی کامیاب ہو گا جب عوامی سطح پر جنگ کا پرزور مطالبہ سامنے آئے گا۔ اس بات کی مثال یوں سمجھیے کہ وہ ابھی تک چولہے پر ایک برتن میں عوامی جذبات کو عثمان کی خون آلود قمیص اور نائلہ کی کٹی انگلیوں کو دمشق کی مسجد میں نمائش کی آگ سے ہلکی آنچ پر صرف گرماتے چلے آرہے تھے۔ لیکن اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ان جذبات کو ایک دم ابال کر یوں بھڑکا دیا جائے کہ بھک سے اس دیگچی کا ڈھکن اڑ جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ آج جدید دنیا میں بھی کاری سمجھی جانے والی چال چلیں گے۔ وہ علی کا غرور، یعنی ان کی غیرت و حمیت اور نیکوکاری کو خود اپنا لبادہ بنالیں گے۔

اس ضمن میں ایک منظم اور باقاعدہ مہم چلائی جائے گی تاکہ بالآخر معاویہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور نظر آئیں۔ زوردار جنگی وار کو ممکن بنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس میدان میں عوامی غم وغصہ کے ہاتھوں دھکیلے جائیں۔ اگر وہ علی کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل نہ ہو بلکہ ایسا نظر آئے کہ وہ لوگوں کی خواہشات کا احترام میں اس 'ناپسندیدہ' فعل پر مجبور ہیں۔ وہ لوگوں کی مرضی کے سامنے سر خم کرتے ہوئے، انہی کے انصاف کے مطالبے کا پاس رکھتے ہوئے، انہی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوں۔ ایسا ہونا چاہیے۔

اس منظم مہم میں سب سے پہلے استعمال کیا جانے والا ہتھیار شاعری تھا۔ جدید دنیا اور بالخصوص مغرب میں لوگوں کو شاید یہ بات نہایت عجیب لگتی ہو کہ آخر شاعری کو کیسے استعمال کریں گے؟ وجہ یہ ہے کہ آج کل شاعروں کو عام طور پر آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر ساتویں صدی عیسوی میں مشرق وسطیٰ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ تب شاعروں کی خوب چلتی تھی، کہیے وہ اس دور کے نامی گرامی، عوام میں مقبول 'ستاروں' کی طرح ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر طنزیہ شاعری اور ہجو لکھنے والوں کی تو بہت ہی زیادہ مانگ تھی۔ ان شاعروں کا کلام، قصے اور کہانیاں نہ صرف بار بار، کئی کئی محفلوں میں پڑھا جاتا تھا بلکہ لوگ اس کا تذکرہ کرتے تھے اور مقبول شاعری تو ہاتھوں ہاتھ بکتی تھی۔ اسی شاعری کی روشنی میں عوامی رائے عامہ ہموار ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بھی، جب لکھنا اتنا عام نہیں تھا مگر شاعری پھر بھی بالخصوص چرمی کاغذوں پر تحریر کر کے رکھی جاتی تھی۔ اسے لکھنے اور سنبھال کر رکھنے کا مقصد بعد میں پڑھنا یا کتب خانوں کا پیٹ بھرنا نہیں بلکہ زبانی یاد کرنا ہوتا تھا۔ زیادہ تر لوگ پڑھنے لکھنے سے قاصر تھے، اس لیے گنے چنے لوگ اس لکھے کو بار بار پڑھتے اور تقریباً سب ہی لوگ اس کو سنتے، دہراتے اور زبانی ازبر کر لیتے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف یہ شاعری پھیل جاتی۔ نہ صرف یہ کہ محفلوں میں سنائی جاتی بلکہ گلی کوچوں، بازاروں، سرائے محلوں اور یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی باقاعدہ نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جس کلام میں زیادہ کاٹ ہوتی اور جو شعر یا جملہ اندر تک کاٹ سکتا، اس کی مانگ بھی اتنی ہی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ ایسے اشعار اور طنزیہ جملے دیرپا گردش میں رہتے اور اکثر ضرب المثل کا روپ دھار لیتے۔ لازمی بات تھی، ایسے کلام کو تخلیق کرنے والے شعراء کی بھی خوب پذیرائی ہوتی۔ انہیں شہرت اور داد کے ساتھ انعام واکرام بھی ملتا تھا۔

اس زمانے میں اس قسم کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات اس کی وجہ سے معاملات ہاتھ سے نکل جایا کرتے تھے۔ شعلہ بیان کلام کی وجہ سے لوگ بدک جاتے تھے اور عوام مشتعل ہو جاتی تھی۔ رہنماؤں کا صبر جواب دے جاتا اور اس کے اکثر انتہائی خطرناک نتائج برآمد ہوتے۔ اکثر شاعروں کو بھی اپنی جان کے لالے پڑ جاتے۔ مثال کے طور پر اس شاعرہ کا تذکرہ آج بھی بہت عام ہے جو محمد ﷺ کی مدینہ میں بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ پر اتنی سیخ پا ہوئی کہ اس نے آپؐ کی مخالفت میں شعر کہے۔ اس نے کہا، 'اے خزرج کے ناکارہ، نامردو! / کیا تم بھڑوے ہو؟ / تم ایک اجنبی کو اپنے گھونسلے پر قبضہ کرنے دوگے؟ / تم اس سے یوں امید لگا بیٹھے ہو / جیسے مرد جو کی شراب کو لالچ سے دیکھتا ہے / کیا کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے / جو اس کوئل سے اس گھونسلے کو بچائے؟' اگرچہ ترجمہ کی وجہ سے اصل شعروں کا ردھم اور کاٹ دار تاثیر تقریباً ختم ہو کر رہ جاتی ہے مگر پھر بھی حقارت صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے یہ اشعار محمد ﷺ کے مخالفین نے خوب اچھالے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اگلی ہی رات یہ عورت اپنے گھر میں، بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ اسے محمد ﷺ کے حکم پر اس بے عزتی پر قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کی خبر اتنی ہی تیزی سے پھیلی جتنی تیزی سے اس کی شاعری مشہور ہو جایا کرتی تھی۔ مدینہ کے شعراء کو پیغام مل گیا اور جلد ہی ان میں سے زیادہ تر وہ جو کبھی بڑھ چڑھ کر آپؐ کی مخالفت میں کلام اچھالا کرتے تھے، اب ان کی مدح سرائی کرنے لگے۔

اکیسویں صدی میں دنیا بھر کے لوگ، بالخصوص مغرب کے باسی ڈینش اخباروں میں چھپنے والے محمد ﷺ کے کارٹونوں پر ردعمل پر حیرت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس میں ایک رسالے کے دفتر کو بھی ایسی ہی 'بے حرمتی' پر مسلح حملے میں شدید جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے اس ردعمل سے تو ایسا لگتا ہے جیسے اسلام میں طنز اور مزاح کی کوئی روایت سرے سے کبھی رہی ہی نہیں۔ حالانکہ اوائل دور اسلام میں اس کی انتہائی مضبوط روایات ملتی ہیں۔ یہ اس قدر پر اثر ذریعہ رہا ہے کہ اکثر جھڑپوں، لڑائیوں اور جنگ وجدل کا موجب بن جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں شاعری، بالخصوص طنزیہ شاعری اور ہجو کی حیثیت ایک کاری ہتھیار کی سی ہوا کرتی تھی۔ آج بھی، مسلمان اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ سلمان رشدی کا ناول، 'شیطانی آیات' نے اسلامی دنیا میں اتنی زیادہ

ہلچل اسی لیے پیدا کی کیونکہ یہ سوچا سمجھا اور انتہائی مہارت سے تراشا ہوا طنز تھا۔ رشدی نے اسلام کی ریڑھ کی ہڈی، یعنی قرانی آیات اور احادیث کو نشانہ بنایا تھا۔ مغرب میں بھلے طنز، جیسے کارٹون وغیرہ اور کاٹ دار نثر کو بے ضرر سمجھا جاتا ہو، شاید مغربی حلقوں کا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ مزاح ہے یا پھر ہنسی مذاق کی بات ہو گی۔ اگر یہ نہ بھی ہو تو ان کے نزدیک یہ صرف تمثیل ہے۔ علامت یا کہیے خوش طبع ظرافت ہوتی ہو گی مگر اسلامی دنیا میں اس کو لغوی معنوں میں، دین کی اساس پر حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے، جب لفظوں کے معنی حرف بہ حرف لغوی سمجھے جاتے ہوں تو ایسے لفظ ہتھیار بن جایا کرتے ہیں۔ ایسے ہتھیار جو آگے چل کر جنگ میں بدل جاتے ہیں اور جنگوں میں خون ریزی اور قتل و غارت، عام بات ہے۔

اس زمانے میں طنزیہ شاعری اور ہجو صرف دشمن کے لیے گھڑی جاتی تھی، اسی لیے آج جب مسلمانوں کا بظاہر بے ضرر طنز اور مزاح پر خون کھولتا ہے تو وہ مغرب کو اور ان مغربی اخباروں، رسائل اور سلمان رشدی جیسوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ خیر، بات یہ چل رہی تھی کہ اس زمانے میں ایسی شاعری اور داستانیں عام طور پر دشمنوں کے خلاف تخلیق کی جاتی تھیں۔ معاویہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسی شاعری، اس موقع پر شام جیسے صوبے میں، جہاں پہلے ہی عوامی جذبات علی کے خلاف پک رہے تھے، اگر وہ دشمن کی بجائے خود ان کے خلاف مشہور ہو جائے تو کیا ہو گا؟ یہ ہو گا کہ لوگ ان کو جنگ پر مجبور کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ چنانچہ دمشق میں، جہاں معاویہ کی مرضی کے خلاف چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی، انہی کے خلاف طنزیہ شاعری عام ہونے لگی۔ اس شاعری میں معاویہ کی کھل کر بے عزتی کی جاتی۔ شاعر ان کی مردانگی پر سوال اٹھاتے اور کمزوری کے طعنے دیتے کہ وہ عثمان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے آخر آگے بڑھ کر علی پر وار کیوں نہیں کرتے؟ کیا وہ ڈرتے ہیں؟ کیا وہ نامرد ہیں؟

تاریخ میں روایت ہے کہ اس شاعری کے اکثر نسخے تادم تحریر، کئی جگہ پر دستیاب تھے اور ان میں سے اکثر اگر معاویہ کے چچازاد ولید نے خود نہیں لکھے مگر ان کے دستخط ضرور ثبت ہیں۔ ولید عثمان کا سوتیلا بھائی تھا۔ یہ وہی ہے جو عثمان کے دور میں کوفہ کا گورنر ہوا کرتا تھا اور بعد ازاں اس کی شکایت مدینہ پہنچنے پر تیسرے خلیفہ کے خلاف بغاوت کا قضیہ شروع ہوا تھا۔ ولید کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی شاعری کا ایک نسخہ

کچھ یوں ہے، 'اے معاویہ ! تم ایک خصی اونٹ کی طرح ہو/ایسا اونٹ جو شہوت تو رکھتا ہے/دمشق کے محل میں دبکا بیٹھا ہے/وہ اونٹ جو لت میں بے چین ہے مگر ملنے سے قاصر ہو'، آگے چل کر اس نظم کو کچھ یوں لپیٹا کہ، 'اللہ کی قسم! اگر عثمان کا بدلہ لینے میں تم نے/ایک دن کی بھی مزید دیر کر دی تو/میں کہوں گا، تمہاری ماں ہی بانجھ تھی/ان سانپوں کو اپنے قریب مت آنے دینا/ان کے تلواروں سے لیس ہاتھوں سے ڈرتے کیوں ہو؟/باہر نکلو! علی کو جنگ کا مزہ چکھادو/اس کے بال خوف سے سفید کر دو!'

دوسرے شاعروں نے معاویہ پر زور دیا کہ 'بادبان کی رسی کھولو اور کشتی کو نکلنے دو!' اور 'دیر مت کرو، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ'۔ لیکن اس زمانے میں سامنے آنے والی شاعری، جس کا بڑا حصہ تاریخ میں موجود ہے، اس میں سب سے مشہور اور دمشق بھر میں مقبول سلسلہ وہ تھا جس میں کھلے عام مخالفین کو نشانہ بنایا گیا۔ اس شاعر نے کہا، 'میں شام کو عراق کے راج پر کراہت میں مبتلا دیکھتا ہوں اور عراق کے لوگوں کو شام سے گھن آتی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے نفرت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علی ہمارا مولا ہے؟ لیکن میں، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ہند کا بیٹا ہی کافی ہے!'۔

ظاہر ہے، دمشق کے بازاروں میں یہ شاعری معاویہ کے علم سے باہر اور ان کی منظوری کے بغیر شائع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جس طور ان کی شام کے معاملات پر گرفت تھی، ایک لفظ بھی اتنی آزادی سے نہیں اگلا جاسکتا تھا۔ بالخصوص شاعروں کے ساتھ ایسے کلام پر روایتی طور پر پیش آنے والے سلوک کی تاریخ دیکھیں تو یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ معاویہ کو ان کی کارستانیوں کا علم ہی نہیں تھا یا انہیں معاویہ کی منظوری حاصل نہیں تھی۔ دمشق میں کسی شخص میں معاویہ کے غیض و غضب کو دعوت دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر انہیں اس کی خبر نہیں بھی تھی تو بھی، معاویہ نے اس شاعری پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا، کسی کو ٹوکا تک نہیں۔ بلکہ اس سلسلے کو جاری رہنے دیا گیا۔ روایات کے مطابق یہ شاعری اس باقاعدہ مہم کا حصہ تھا جس کے تحت معاویہ جنگ کے لیے عوامی رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت، اس طرح وہ عوامی خواہشات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال رہے تھے۔ حالیہ دور میں ایسی ہی چال کی عمدہ مثالیں ہمیں جدید دور کی جمہوری حکومتوں میں بھی عام ملتی ہے۔ 2003ء میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کرنے کی ٹھانی تو

اس کے لیے اسی طرح کی چال استعمال کی گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ بش انتظامیہ نے دنیا بھر کی جمہوری ریاستوں پر اثر انداز ہو کر، غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور پھر جب چاروں طرف امریکہ پر دباؤ بڑھنے لگا تو عالمی برادری کی بڑی طاقتوں نے یکجا ہو کر عراق پر دھاوا بول دیا تھا۔ بعد ازاں اس جنگ کے محرکات غلط ثابت ہوئے اور ہم نے دیکھا کہ دنیا بھر میں جمہوریت اور جمہوری ریاستوں کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔

جب مہم میں پہلا مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی عوامی رائے عامہ ہموار ہو چکا تو معاویہ نے علی کے ساتھ جنگ کا اعلان، ایک خط کے ذریعے کیا۔ 'اے علی علیہ السلام! تمہیں ہر خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے یوں ہانک کر لے جانا پڑا ہے جیسے کسی اونٹ کے نتھنوں میں چھڑی ڈال کر کھینچنا پڑتا ہے' خط کی شروعات میں ہی ایسے مخاطب کیا گیا جیسے تاثر دیتے ہوں کہ علی خلیفہ نہیں بلکہ خلافت کے جھوٹے دعویدار ہیں۔ اس خط میں معاویہ نے علی پر لوگوں کو عثمان کے خلاف 'چوری چھپے اور کھلے عام 'بغاوت پر اکسانے کا الزام لگایا۔ کہا کہ عثمان کے قاتل 'تمہاری ریڑھ کی ہڈی، تمہارے مددگار، تمہارے ہاتھ اور تمہارے مصاحبین تھے۔ اور یہ کہ شام کے لوگ تمہارے ساتھ اس وقت جنگ کرتے رہیں گے جب تک کہ تم ان قاتلوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کر دیتے۔ اگر تم ایسا کرتے ہو تو خلیفہ کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے، تمام مسلمانوں کی نمائندگی کے تحت ہو گا۔ کبھی یہ اختیار حجاز کے لوگوں کے ہاتھ میں تھا مگر انہوں نے اس کے استعمال کو ترک کر دیا۔ اب یہ حق شام کے لوگوں کے پاس ہے'۔

دوسرے الفاظ میں، یہ اختیار معاویہ کے ہاتھ میں تھا۔ شام کے گورنر خود خلیفہ بننے کے لیے تیار تھے اور اپنے ارادے صاف ظاہر کر دیے۔

657ء میں، گرما کے موسم کے اوائل میں شامی اور عراقی فوجیں 'صفین' کے میدان میں آمنے سامنے کھڑی ہوں گی۔ صفین کا میدان دریائے فرات کے مغرب میں واقع ہے۔ آج کل یہ علاقہ شام کے شمالی صوبے کا حصہ ہے۔ علی کی افواج دریا کے ساتھ ساتھ کوفہ سے پانچ سو میل دور، شمال کی جانب نکل آئیں۔ وہ جتنی دور جاتے، ہوا اتنی ہی بہتر ہوتی جاتی۔ فرات کے نشیب میں جو حبس اور نمی کی کیفیت رہا کرتی تھی،

صفین کے میدانوں میں نہیں تھی۔ شمال کی جانب جس قدر آگے بڑھتے مٹی چکنی اور دریا کا دہانہ تنگ ہوتا جاتا۔ یہاں پہنچ کر میدان سکڑنے لگتے ہیں اور چاروں طرف ہری بھری وادیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ صحرا کے ریتلے سراب کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں اور جزیرہ کی وسیع و عریض چراہ گاہیں ہیں جن کی پشت پر شمال کی ہی طرف دور برف سے ڈھکی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر جس دریا کا پانی گدلا جاتا ہے اور پاٹ کئی میلوں پر پھیلا رہتا ہے، یہاں وہ شور مچاتی ہوئی ندی جیسا لگتا ہے، جس میں پگھلی ہوئی برف کا صاف شفاف پانی موجیں مارتا ہے۔

اگر وہ مزید آگے بڑھیں تو قدموں میں شام پھیلا ہو گا۔ شام میں دولت اور خوشحال سے مالا مال شہر دمشق ہے جس کی حیثیت اس پورے خطے میں ایک تاج کی سی ہے۔ یقیناً اس لشکر میں شامل ہر شخص نے دمشق بارے سن رکھا تھا۔ کئی تو یہاں آتے جاتے بھی رہے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ دمشق میں خوشحالی ہے۔ یہاں نہریں بہتی ہیں۔ ہرے بھرے درخت ہیں اور بازاروں میں طرح طرح کے بدیسی پھل مل جاتے ہیں۔ یہاں سبز محل ہے جس کے معمولی سے کونے کھدرے کی تعمیر میں بھی قیمتی سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کے اندر ہیرے اور جواہرات بھرے ہیں۔ کئی تخت ہیں جن پر قیمتی پتھر جڑے ہیں اور شہر بھر میں جہاں دیکھیے، تازہ پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ صحرا کے باسیوں کے لیے تازہ پانی کا خیال ہی تابناک ہوتا ہے۔ اگر کسی جگہ پر راہ چلتے، ہر چار قدم پر پھوٹتے ہوئے چشمے اور فوارے ہوں تو کیا حالت ہو گی؟ یہ کیسی جگہ ہے جہاں تازہ، شیشے کی طرح صاف شفاف پانی اس قدر بہتات میں ہے کہ لوگ اسے کھیل کود، آنکھوں کی فرحت کے لیے فوارے پھوڑ کر، صرف عیاشی کے لیے بہاتے رہتے ہیں؟ یقیناً، ایسی جگہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ایک کیا، کئی جنگیں لڑی جا سکتی تھیں۔

ہزاروں مسلح جنگجو سینکڑوں میل کا طویل اور جان جوکھم میں ڈالنے والا سفر طے کر یہاں صرف امن قائم کرنے تو نہیں آئے تھے۔ جب دونوں لشکر صفین کے مقام پر آمنے سامنے آن پہنچے تو اب یہ معاملہ بڑھ کر عزت اور غیرت کا بھی بن گیا۔ دونوں فریقین کی کوشش یہ تھی کہ جو بھی ہو، پہل دوسرا کرے اور وہ مظلوم نظر آئیں۔ کوئی بھی جارح نہیں کہلوانا چاہتا تھا بلکہ کوشش تھی کہ مجروح قرار پائیں۔ کئی ہفتوں تک

یہ لشکر یہیں جمع رہے اور حملے میں پہل کرنے سے گریزاں تھے۔ اکا دکا جھڑپیں اور منہ در منہ جھگڑے ہوئے مگر ان سے وہ اثر نہیں ہوا جو جنگ جمل میں محدود پیمانے پر شروع ہونے والی لڑائی سے ہوا تھا، یعنی ایک دم ہی خوفناک جنگ شروع ہو گئی تھی۔ بلکہ ان جھڑپوں پر تو یہ گماں ہو رہا تھا جیسے مقصد نقصان پہنچانا نہیں بلکہ صرف مشق کرنا ہو۔ گنے چنے ہتھیاروں کا استعمال ہوتا اور کوشش ہوتی کہ جانی نقصان نہ ہونے پائے۔ روایات میں ملتا ہے کہ لڑتے لڑتے اگر نماز کا وقت آ جاتا، یاد رہے اس وقت تک دن میں صرف تین نمازیں ادا کی جاتی تھیں، جنگجو لڑائی سے الگ ہو جاتے۔ ہتھیار کندھے پر لٹکائے آدھا میل دور اپنے لشکروں میں واپس چلے جاتے۔ ان دنوں کی ایک یادداشت ایک شخص نے کچھ یوں بیان کی ہے کہ 'رات گئے تو یہ بھی ہوتا کہ دونوں لشکروں میں سے لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر دوسرے کے خیموں میں پہنچ جاتے اور رات بھر بیٹھے باتیں کرتے اور مشروبات سے تواضع کی جاتی'۔

آخر یہ جنگجو آپس میں کیا باتیں کرتے تھے؟ ظاہر ہے، زیر بحث معاملہ یہی قضیہ رہتا ہو گا جس کے فوجی حل کے لیے وہ وہاں جمع تھے۔ جنگجو ہی نہیں، لشکروں کے سپہ سالار اور رہنما بھی آپس میں بدستور بات چیت جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لیے دونوں لشکروں کے پڑاؤ کے بیچ میں، وسطی میدان میں ایک مضبوط چبوترے پر مچان کس کر اوپر پنڈال بنا دیا گیا۔ پنڈال کی اطراف میں دونوں لشکروں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہاں علی اور معاویہ کے لشکر کے وفود جمع ہوتے اور مذاکرات کے دور چلتے۔ مقصد ایک دوسرے کے ارادوں کی خبر رکھنا اور بات چیت سے تصفیہ کی کوششوں کو آگے بڑھانا تھا۔ معاویہ کو مذاکرات کے ان ادوار میں واضح برتری رہا کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے وفود کا سیاسی اور سفارتی معاملات کا وسیع تجربہ تھا۔ دمشق بازنطینی سلطنت میں سیاست اور سفارت کا گڑھ ہوا کرتا تھا، شامی تیز لوگ تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ معاویہ علی کے خانہ جنگی بارے خدشات اور ہولناکی پر متفکر رہنے کی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ علی پہلے ہی اس جنگ میں خوں ریز لڑائی لڑ چکے تھے، جس کے نتیجے میں انہیں فتح مل گئی تھی مگر بھاری نقصان پر سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اب معاویہ علی کے انہی خدشات اور ہراس کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کے راستے ڈھونڈیں گے۔ معاویہ کو بے شک ہر لحاظ سے برتری حاصل ہوتی مگر بہر حال ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ اگر مقاصد حل ہو سکتے ہیں تو پھر اس کے

لیے خواہ مخواہ قتل وغارت اور بدامنی کی کیا ضرورت ہے؟

اگرچہ معاویہ نے ایک خط کے ذریعے عوامی سطح پر علی سے خلافت سے الگ ہو کر مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تھا لیکن اب وہیں انہوں نے اپنے وفود کو اس کا ایک متبادل حل بھی تجویز کرنے کو کہا، جس کے لیے بطور خاص رازداری برتنے کی تاکید کی تھی۔ یہ حل کچھ یوں روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ علی اور معاویہ آپس میں جنگ سے بچ سکتے ہیں اگر وہ اسلامی سلطنت کو بانٹ دیں۔ تجویز کے مطابق شام، فلسطین اور مصر کا سارا اختیار اور محصولات معاویہ کو ملتیں اور علی کے پاس عراق، فارس اور جزیرہ نما عرب کا اقتدار ہوتا۔ اس حل کے تحت سلطنت صحیح معنوں میں یعنی امر واقع تقسیم ہو جاتی۔ عرب فتوحات سے پہلے تقریباً یہی تقسیم بازنطین اور فارس کی سلطنتوں میں پائی جاتی تھی۔ یہی سرحدیں تھیں اور اسی طرح کی صورتحال رہا کرتی تھی۔ صرف فرق یہ تھا کہ تب شہنشاہ ہوا کرتے تھے اور اب ایک کی بجائے دو خلفاء ہوا کریں گے۔

ظاہر ہے علی نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا اور یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ علی نے ہمیشہ امت کی یکجہتی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اگرچہ یہ تجویز آخر کار ناکام ہی ٹھہرتی مگر ایک لحاظ سے یہ علی کے لیے بے عزتی کی بات تھی۔ یعنی ایک طرف تو ان کی سوچ پر ضرب تھی اور دوسری طرف چونکہ وہ اب خلیفہ تھے، ان کی سرپرستی میں خلافت کا بٹ جانا، ناکامی ٹھہرتی۔ غیرت کا مسئلہ بن کر ہو سکتا تھا کہ اس طرح علی طیش کھا جاتے اور فوراً ہی حملہ کر دیتے اور یوں پھر بھی، یعنی تجویز رد ہونے کی صورت میں بھی معاویہ مجروح اور علی جارح مشہور ہو جاتے۔ بجائے جنگ شروع کرتے، علی نے جنگ و جدل کو ٹالنے کی ایک آخری کوشش کی۔ وہ گھوڑے پر زرہ پہن کر، پوری طرح مسلح ہو کر چبوترے تک گئے اور معاویہ کو خود باہر نکل کر سامنے آنے کو کہا۔ ان کی آواز پہلی صفوں کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے شام کے گورنر کو دست بدست لڑائی کے لیے للکارا۔ کہا کہ بجائے لشکر آپس میں بھڑ کر خون کی ندیاں بہائیں، وہ دونوں لڑ مر کر اس سارے قضیہ کا موقع پر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ جو بچ جائے، وہی خلیفہ کہلائے گا۔

معاویہ کا نائب، جو ایک جری اور جانا مانا جنگجو تھا۔ نام عمرو تھا اور انہوں نے مصر میں اسلام کے لیے فتح حاصل کی تھی۔ یہ محمد ﷺ کے دیرینہ ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ عمرو نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ وہ علی

کی اس منہ در منہ لڑائی پر راضی ہو جائیں۔ چونکہ وہ خود جنگجو تھے، جنگجوؤں کی سی ہی غیرت میں کہا، 'ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص سامنے کھڑا للکار رہا ہو اور کوئی پیچھے ہٹ جائے، ایسے موقع پر انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوتی'۔ پھر زور دے کر کہا، 'علی نے تمہیں انتہائی مناسب تجویز پیش کی ہے'۔

لیکن معاویہ کو خواہ مخواہ غیرت دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس طرح کی صفات اور عادات کو علی کے لیے ہی رکھ چھوڑیں گے۔ وہ حقیقت پسند تھے اور انتہائی عملی شخص واقع ہوئے تھے۔ فوراً ہی جواب لوٹایا، 'یہ کسی بھی طرح سے مناسب تجویز نہیں ہے۔ علی نے ہمیشہ اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے جس سے منہ در منہ لڑائی کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ہاتھ اوپر ہو گا'۔ معاویہ کے اس انکار کے بعد سوائے جنگ کے کوئی راستہ نہیں تھا۔

علی وہیں سے واپس مڑے اور اپنے لشکر کی صفوں میں جا پہنچے۔ لشکر کے تیار کھڑے جنگجوؤں کو مخاطب کر کے تقریر کی، 'شامی صرف اس دنیا کی خاطر لڑ رہے ہیں تاکہ وہ اس فانی جگہ پر بادشاہ کہلائیں اور غاصب طریقے سے حکمرانی کرتے پھریں۔ اگر انہیں آج جیت ہوئی تو یاد رکھو تمہاری جان اور مال محفوظ نہیں رہیں گے۔ بلکہ تمہارا ایمان اور خدا پر یقین بھی بیچ کھائیں گے۔ آگے بڑھو اور ان سے آج لڑو ورنہ اللہ تم سے ہمیشہ کے لیے اسلام کی حکمرانی چھین لے گا اور یاد رکھو، اگر خدا نے تم سے یہ نعمت چھین لی پھر دوبارہ تم کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہو گے'۔ پر زور تقریر سے لشکر میں جوش اور خروش دیدنی تھا۔ جنگجو نعرے بازی کرنے لگے اور کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ علی نے اپنی تقریر جاری رکھی اور ان کی آواز بلند ہوتی گئی جیسے وہ ہزاروں کے لشکر سے بھی اونچا بولتے ہوں، گویا دہاڑ رہے ہوں۔ لہجے میں سفاکی پیدا کرتے ہوئے اپنے جنگجوؤں کا دیر تک پر جوش تقریر سے خون گرماتے رہے، انہیں جری اور بہادر گردانا اور انہیں حق سے محروم، محکوم قرار دیا۔ 'دشمن کے چھکے چھڑا دو!' انہوں نے کہا، 'اس وقت تک وار کرو جب تک کہ تلوار کی ضربوں سے کھوپڑیاں ٹوٹ نہ جائیں اور آنکھیں باہر نہ نکل آئیں۔ ایسے وار کرو کہ آنکھیں پھٹ کر چہرے پر بہنے لگیں اور ان کے سینے خونم خون ہو جائیں'۔

اب کی بار جنگ شروع ہو گی تو نماز کے لیے بھی لڑائی نہیں رکے گی۔ اب چھوٹی موٹی جھڑپیں اور

مشقیں نہیں ہوں گی۔ ایک دوسرے کے خیموں میں آنے جانے کی فرصت نہیں ہو گی اور بات چیت کا ہر راستہ بند ملے گا۔ جنگ صفین تین دن تک جاری رہی۔ لڑائی اتنی شدید تھی کہ دوسری رات اندھیرے میں بھی جاری رہی۔ اس رات کو لوگ بعد ازاں 'چیخ و پکار کی رات' کے نام سے یاد کیا کریں گے۔ کہتے ہیں اس رات چاروں طرف جنگجو مرد دہاڑتے رہے، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور تلواریں ٹکراتیں تو رات کی خاموشی میں عجیب شور سنائی دیتا۔ وقفے وقفے سے جب کوئی شخص زخمی ہو کر گرتا یا مرنے لگتا اس کی چیخیں اور درد سے کراہیں آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ یہ اس قدر دل خراش چیخیں ہوتی تھیں کہ سننے والوں کا رات بھر کلیجہ منہ کو آتا رہا۔ آج کل ایسی چیخیں ہم لوگوں کو، جو اپنے گھروں کی راحتوں اور سہولیات میں بسر رکھتے ہیں، کہاں سنائی دیتی ہیں؟ بلکہ ہم میں سے تقریباً لوگ تو شاید ایسی چیخیں سننے کی سرے سے تاب ہی نہیں رکھتے۔ ہم تو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جہاں گاڑی کی ٹکر سے اگر کوئی جانور زخمی ہو کر سڑک کنارے مرتے ہوئے درد سے چیختا ہے تو ہمارے دل دہل جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے، وہ کس قدر بھیانک رات ہو گی؟

اس قدر گھمسان کا رن پڑا کہ خود علی جان سے جاتے جاتے بچے۔ قریب تھا کہ وہ قتل کر دیے جاتے۔ ایک عینی شاہد نے روایت کیا ہے کہ میدان میں جہاں علی موجود تھے، ان کے ارد گرد اتنے زیادہ تیر گر رہے تھے کہ جیسے بارش برستی ہے۔ اس کے الفاظ میں، 'علی کے دو لڑکوں، حسن اور حسین علیہ السلام کے لیے ڈھالوں سے تیروں کے پھالے روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ برچھیوں اور تیروں کی بہتات تھی'۔ ان دونوں نے علی پر زور دیا کہ جتنی جلد ہو سکے، تیز چلتے ہوئے یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ وہ انتہائی آسان ہدف بن چکے تھے۔ علی نے اس موقع پر وہ مقبول جواب دیا جو آج بھی زبان زد عام ہے۔ لڑائی کے میدان کے عین وسط میں، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، تیر تلواروں اور برچھیوں کے سائے تلے علی نے وہ کہا جو اس روز تو نہیں مگر بعد ازاں سچ ثابت ہوا۔ علی کے اس بیان پر لوگوں کو غیب دانی کا گماں ہوتا ہے۔ اسی سبب، ہر شخص ان کی روحانی طاقت اور امتیاز کا قائل ہے۔

'میرے بیٹو!' انہوں نے اطمینان سے آگے بڑھتے ہوئے کہا، 'تمہارے باپ کا جو دن لکھا ہے، وہ آخر کار آ کر رہے گا۔ جو وقت معین ہے، وہ تیز چلنے سے ٹل تو نہیں جائے گا اور نہ ہی آہستہ چلنے کی وجہ سے وہ

وقت جلد آسکتا ہے۔ تمہارے باپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ موت اس کو آن پکڑے یا وہ آگے بڑھ کر موت کو گلے سے دبوچ لے'۔

آج وہ دن نہیں تھا۔ صفین کے میدان میں موت علی کا گلا دبوچنے میں ناکام رہے گی۔ تیسرے روز جو کہ جمعہ کا دن تھا، سورج طلوع ہوا تو علی کا لشکر میدان مار چکا تھا۔ شامی افواج کی صفیں ٹوٹ رہی تھیں اور ان میں بدحواسی پھیل چکی تھی۔ عراقی سست رفتاری سے ہی سہی مگر ان پر قابو پا کر، بھاری نقصان کے باوجود آگے بڑھ رہے تھے۔اب یہ صرف چند گھنٹوں کا کھیل تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ جلد ہی علی کی افواج، معاویہ کے لشکر پر حتمی فتح حاصل کر لیں گی۔

یہ صورتحال دیکھ کر معاویہ کے معاون عمرو نے انہیں قائل کر لیا کہ جو بازی کسی بھی طرح سے جیتی نہ جا سکتی ہو، اس کو پلٹنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ عیاری اور چال بازی سے کام لینا چاہیے۔ کہا کہ انہیں، یعنی معاویہ کو چونکہ روحانیت اور پارسائی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا تو پھر فکر کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ چاہیں تو ایمان اور الہام ربانی کو دفاع کے لیے بھرپور استعمال کیا جا سکتا ہے۔ معاویہ جلد ہی مان گئے۔ چنانچہ، میدان جنگ کی بدلتی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہوئے شامی افواج کو حکم جاری ہوا کہ وہ کسی بھی صورت پیچھے نہ ہٹیں۔ ہتھیار ڈالنے کی تو سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ قران کے تحریری نسخے جو چرمی کاغذ پر لکھے گئے تھے، میدان جنگ میں لائے گئے۔ان نسخوں کو معاویہ کے لشکر میں شامل نامی گرامی اور جری گھڑ سواروں میں بانٹ دیا گیا۔ احکامات یہ تھے کہ ہر گھڑ سوار نسخے کا ایک چرمی کاغذ باقی نسخے سے علیحدہ کرے اور اپنی برچھی کی نوک میں پرو کر سیدھا علی کے لشکر میں جا گھسے۔ بجائے یہ کہ معاویہ کی افواج ہتھیار ڈالنے کے روایتی طریقے یا جسے عام طور پر امن کی استدعا کہا جاتا ہے، سفید جھنڈے لہرانے کی بجائے معاویہ اور عمرو کے حکم پر قران لہرائیں گی۔

دنیا بھر میں کوئی ایسا سفید جھنڈا نہیں ہو گا جو برچھیوں کی نوک پر پروئے ہوئے قرانی نسخوں کا مقابلہ کر سکے۔ گھڑ سوار یہ چرمی کاغذ جن پر قرانی آیات تحریر تھیں لہراتے جاتے اور ساتھ ہی اونچی آواز میں پکارتے جاتے کہ، 'اللہ کے لیے لڑائی بند کر دو! تمہیں رب کا واسطہ یہ خوں ریزی بس کر دو! تمہیں قران کی قسم،

اس الہامی کلام پر خون کے چھینٹے مت پڑنے دینا! تم مسلمان مرد ہو، اپنے ہتھیار نیچے کر لو!'۔ جہاں دیکھتے کہ عراقی بدستور لڑنے پر آمادہ ہیں، شامی فوجی معاویہ کے بتائے الفاظ دہرانے لگتے، جن کو سنتے ہی خود بخود لڑائی رک جاتی۔ وہ چلاتے، 'اللہ کے لیے! اللہ کے لیے بس کر دو! اللہ کی کتاب، اللہ کا نام کو ہمارے بیچ فیصلہ کرنے دو!'۔

علی یہ دیکھ کر حیرت اور غم و غصے سے دنگ رہ گئے۔ قرانی آیات کو یوں برچھیوں کی تیز دھار نوک پر لہرانا تو دور کی بات، ایسا سوچنا بھی بے حرمتی کے زمرے میں آتا تھا مگر یہاں تو جان بچانے اور دنیا پانے کے لیے لوگ یہ بھی کر گزرے تھے۔ یقیناً علی کی افواج یہی سمجھ رہی تھیں کہ شامی امن کی استدعا کر رہے ہیں۔ وہ منت کر رہے ہیں۔ علی کا خیال تھا کہ جیسا وہ اس فعل سے بد ظن محسوس کر رہے ہیں، ان کی افواج بھی شاید اسے اتنا ہی بدتر عمل سمجھ رہے ہوں گے۔ وہ بھی معاویہ کی چال کو بھانپ چکے ہوں گے، اس کرتب کو اچھی طرح جان چکے ہوں گے۔ 'انہوں نے مقدس کتاب کو یوں اس لیے لہرا رکھا ہے تا کہ تمہیں دھوکہ دے سکیں!' علی اپنے فوجیوں پر چلائے، 'ان کا مقصد تمہیں گھات لگا کر مارنا ہے۔ وہ تمہیں اپنی چال میں پھنسا رہے ہیں!'۔

لیکن اگر علی کے ساتھیوں میں سے آدھوں کو ان کا مدعا سمجھ میں آ رہا تھا تو باقی کے نصف اس چال کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ چلا کر علی کو جواب دینے لگے، 'جب ہمیں اللہ کی کتاب کا نام لے کر واسطہ دیا جائے تو پھر ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔ ہم قران کے خلاف تو جنگ نہیں کر سکتے!'۔ فوجی ٹکڑیوں کے سپہ سالاروں کے بار بار حکم کے باوجود بھی ہوا یہ کہ اکثریت نے ہتھیار پھینک دیے اور پیچھے ہٹ گئے۔ فتح سے صرف ایک قدم کی دوری پر علی دیکھتے رہ گئے کہ کس طرح ان کے ہاتھ سے جیت چھین لی گئی۔

'اللہ کی قسم!' علی اپنے فوجیوں پر برس رہے تھے، 'میری بات یاد رکھنا کہ تمہیں بے وقوف بنا دیا گیا'۔ لیکن ظاہر ہے، ایسے موقع پر استدلال کہاں کام کرتا ہے۔ ایمان کے سامنے دلیل کہاں کھڑی رہ سکتی ہے؟ عثمان کے قتل کے موقع پر قرانی نسخوں پر خون کے چھینٹے گرے تھے۔ وہ شبیہ ابھی تک لوگوں کے دل و دماغ میں تازہ تھی۔ وہ کسی بھی صورت دوبارہ، اسی طرح مقدس کتاب کی یوں بے حرمتی، یعنی انسانی خون

سے آلود کرنے پر راضی نہیں ہوں گے۔

جوں ہی لڑائی تھمی، معاویہ نے فوراً ہی اپنا قاصد دونوں افواج کے بیچ میں لا کھڑا کیا۔ اس پیغام رساں نے لکھا ہوا پیغام اونچی آواز میں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سن سکیں، پڑھ کر سنایا جس میں یہاں سے آگے بڑھنے کا نیا طریقہ پیش کیا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ خلافت سنبھالنے کا جو قضیہ ہے، بجائے یہ کہ انسان، اللہ کو خلیفہ چننے کا اختیار دیا جائے۔ اس کے لیے لڑائی نہیں بلکہ قران سے رجوع کیا جائے۔ دونوں فریقین کو چاہیے کہ اپنے بھروسہ مند نمائندوں کا انتخاب کریں، جو ثالث کا کردار ادا کریں گے۔ وہ مل جل کر، باہمی اتفاق رائے سے اس مسئلے کا حل تجویز کریں گے۔ وہی فیصلہ کریں کہ خلیفہ بننے کا حقدار کون ہے۔ یوں معاویہ نے خود کو باقاعدہ طور نہ صرف خود کو خلافت کے امیدوار کے طور پر نامزد کر دیا بلکہ قران کو بیچ میں لا کر، اسے مذاکرات کا ذریعہ بھی بنا دیا۔ تاریخ میں پہلی بار، قران ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے جا رہا تھا۔

علی اس دوران قدم قدم پر مات کھاتے جا رہے تھے۔ وہ حیران و پریشان، آنکھیں پھاڑے، معاویہ کی چالوں کو صرف دیکھ ہی سکتے تھے۔ کم از کم علی کے پاس ان کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ وہ صاف صاف دیکھ سکتے تھے کہ معاویہ نے کس طرح صورتحال کو عیاری سے بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہ نہایت عجیب بات ہے کہ ایک انتہائی دنیادار شخص کس طرح عقیدے اور ایمان کو ایک انتہائی روحانیت پسند شخص کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ علی کی افواج مضبوطی سے اپنی جگہ پر جم کر کھڑی تھیں اور فوجی کسی بھی طرح سے مزید لڑائی پر آمادہ نہیں تھے۔ کچھ نہ بن پڑا تو علی کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ثالثی کی اس تجویز کو مان لیں۔ 'اے لوگو! بھولنا مت کہ میں نے تمھیں اس سے منع کیا تھا' انہوں نے تجویز قبول کرنے سے پہلے اپنے جنگجوؤں سے کہا، 'تم دیکھ لینا کہ اس سے تمہاری قوت جاتی رہے گی، تمھیں ہر طرف سے تباہی ملے گی اور تمھیں وراثت میں پستی اور کم مائیگی ملے گی۔ مجھے تم پر شرم آتی ہے۔ تمہاری مثال اس ڈرپوک اور کم اصل اونٹنی کی طرح ہو گی جو نجاست کے ڈھیر میں گھس کر بیٹھی گلی سڑی کھرچن ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ یاد رکھو! تم آج کے بعد پھر کبھی عروج نہیں دیکھ سکو گے!'۔

علی کو مدینہ میں خلیفہ مقرر ہوئے ابھی ایک سال سے بھی کم عرصہ گزرا ہوگا۔ جنگ جمل کے بعد معاملات کا ہاتھ سے کھسکنے کا احساس رہا ہوگا مگر جنگ صفین میں پیش آنے والے واقعات کے بعد یقین ہو گیا کہ ان کی حکومت زیادہ دیر چل نہیں سکے گی۔ ایک معرکہ تو سر کر لیا تھا، وہ یہ لڑائی بھی تقریباً جیت چکے تھے مگر اب یہاں پیدا ہونے والی صورتحال کے بعد جنگ بتدریج ہارتے چلے جائیں گے۔

باب 11

صفین سے شکستہ دل فوج علی کے پیچھے پیچھے طویل سفر طے کر کے واپس کوفہ پہنچ گئی۔ کئی لوگ صفین کے میدان میں جنگ کو یوں قرآن کے صدقے اور خدا کے نام پر ثالثی کی صلاح پر منتج ہونے پر اب پہلی بار پشیمان نظر آرہے تھے۔ اس میں چھپی مکاری اور چال پر قیاس سے کام لے رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ادراک ہو گیا کہ واقعی دغا دیا گیا ہے اور ممکنہ طور پر ان کا ایمان، انہی پر بیچ کر، انہی کے خلاف استعمال کیا گیا۔ وہ لوگ جو میدان جنگ میں قرانی نسخے کے چرمی پارچے نیزوں کی نوک میں پرویا دیکھ کر ایک دم فرط ایمان سے جوش میں آکر ہتھیار پھینک کر لڑائی سے منکر ہو گئے تھے، تب تو مصالحت پر زور دینے لگے تھے، اب وہی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر اس ضمن میں تلخی دکھا رہے تھے۔ یہ لوگ کوفہ اور معاویہ اپنے لشکر سمیت واپس دمشق پہنچ چکے تھے۔ چونکہ وہ تو یہاں موجود نہیں تھے جن پر اپنا غصہ اتارتے۔ ان لوگوں نے اپنی تلخی کا سارا ملبہ اس شخص پر گرا دیا جو انہیں صفین کے میدان میں جنگ کرنے لے گیا تھا۔

یہ لوگ علی کو کوسنے لگے کہ انہوں نے عراقیوں کو آخر یہ کس مشکل میں ڈال دیا ہے؟ کہنے لگے کہ زبردستی اس کھن چکر میں پھنسا دیا۔ جلد ہی اس گروہ کی شکل میں علی کے دشمنوں کی فہرست لمبی ہو جائے گی۔ اہم بات یہ تھی کہ اب کی بار دشمن مکہ اور نہ ہی شام بلکہ ان کی اپنی صفوں میں سر اٹھائے گا۔ یہ ایسا دشمن ہو گا جو کسی بھی دوسرے حریف سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اس لیے کہ یہ لوگ باقی مخالفین کی طرح طاقت کے حصول کے لیے نہیں بلکہ نیکوکاری اور پارسائی کی اندھی، غیر لچک دار اور تلخی کی دلیل پر گامزن، تقویٰ کے زعم میں علی کی شدید مخالفت کیا کریں گے۔ انہیں کوئی لالچ نہیں تھی۔ صرف پارسائی کا گھمنڈ تھا۔

اس گروہ کے سربراہ کا نام عبداللہ بن وہب تھا۔ اس نام، یعنی 'وہب' یا 'وہاب' سے آج اسلامی دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے کیونکہ اس سے 'عبدالوہاب' کا خیال آتا ہے جو حالیہ دور میں بنیاد پرست وہابی فرقے کے بانی ہیں۔ آج جدید دنیا میں اس فرقے کی طاقت کا مرکز سعودی عرب ہے اور اسی گروہ کے نظریات دنیا بھر میں سنی شدت پسندی کا موجب ہیں۔ ساتویں صدی کے عبداللہ بن وہب اپنے پیروکاروں کے لیے 'ذوثفنات'

یا قابل تعظیم یا انتہائی پارسا اور متبرک شمار کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا یہ رتبہ 'پیشانی پر محراب' کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ مراد یہ کہ عبادت کے دوران سخت فرش پر کثرت سے ماتھا ٹیکنے کے باعث پیشانی کی جلد سخت اور رنگت گہری ہو گئی تھی۔ یہ نشانی تب اور آج بھی کئی مسلمان علاقوں میں نیک اور متقی لوگوں کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ کئی روایتیں یہ بھی ہیں کہ ان کا یہ نام اس وجہ سے عام ہوا کہ دین کی سربلندی کے لیے لڑی والی جنگوں میں لڑائی کے دوران ایک بازو سے محروم ہو گئے تھے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو، اس نام کے سبب چاروں طرف ان کا دبدبہ اور کثرت عبادت کی وجہ سے دھاک بیٹھ گئی تھی۔

کوفہ پہنچ گئے تو علی نے مسجد میں منبر کی سیڑھیاں چڑھ کر پہلا خطبہ دینا چاہا۔ ابھی انہوں نے بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ وہب نے تنقید شروع کر دی، 'تم نے اور شامیوں نے بے اعتقادی اور تشکک میں ایک دوسرے سے یوں مقابلہ کیا جیسے شرط میں گھوڑے دوڑتے ہیں' پھر اعلان کیا، 'اللہ کا معاویہ اور اس کے حامیوں بارے فیصلہ یہ ہے کہ یا تو وہ توبہ کر لیں ورنہ ان کی سزا قتل ہے۔ اور اے علی علیہ السلام! تم نے تو ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ معاہدہ کیا ہے کہ اس قضیے کا فیصلہ آدمی کریں گے؟ تم نے انسانوں کو اللہ کے کلام پر فوقیت دی۔ تمہاری ساری عمر کی نیکوکاری، دو کوڑی کی نہیں رہی۔ تم گمراہ ہو چکے ہو!'۔

وہب کے حامی ان کی پشت پر جمع ہونا شروع ہو گئے اور شور و غل مچانے لگے۔ اونچی آواز میں وہب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہنے لگے کہ خلیفہ کا منصب کسی ثالثی اور انسانوں کی مجلسوں میں طے نہیں ہوا کرتا۔ اللہ کے پیغمبر کی جانشینی تو رب کی طرف سے عطا ہونے والا حق ہے۔ یہ حق بلاشک وشبہ علی کا تھا مگر علی نے اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔ اب علی بھی معاویہ کی ہی طرح احکامات ربانی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، چنانچہ برابر کے قصوروار ہیں۔ ان دونوں یعنی علی اور معاویہ میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ دونوں ہی خدا کی نظروں میں حقارت اور تنفر کے حق دار ہیں۔ وہ بار بار یہی ایک بات دہراتے رہے، شور بڑھتا گیا اور اس موقع پر ایک نیا نعرہ نکلا۔ یہی نعرہ بعدازاں اس گروہ کا منشور بن جائے گا اور اسی نعرے سے وہ عام لوگوں کو اپنے نظریات کی طرف مائل کیا کریں گے۔ اس دن کوفہ کی مسجد میں پہلی بار بلند ہونے والا نعرہ یہ تھا۔ 'فیصلے کا حق اللہ کا ہے!'، پھر چلاتے، 'صرف اللہ کا!'۔ آج بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ دنیا بھر میں یہ نعرہ

کہیں نہ کہیں گونجتا ہی رہتا ہے۔

علی نے جب یہ روش دیکھی تو فوراً ہی جواباً ڈانٹ کر کہا، 'اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فیصلہ اللہ کا ہی ہے۔۔۔ صرف اللہ کا ہے۔ تمہارا ہر لفظ سچا ہے مگر تم الفاظ کو یوں کیوں گھماتے، پھراتے کیوں ہو کہ اس کا مطلب غلط نکل رہا ہے؟'۔ علی نے مزید کہا کہ تم لوگوں ہی ہتھیار پھینک کر صفین کے میدان میں مجھے ثالثی پر آمادہ ہونے پر مجبور کیا۔ تب تو تم نے میری ایک نہ سنی، میں کہتا رہا پر تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس دن جس بات پر تم مصر تھے، آج اسی بات پر مجھے ذمہ دار ٹھہرا رہے ہو؟ بدنام کر رہے ہو؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟

لیکن بات یہ ہے کہ جب گناہ گار اپنی غلطی کی اصلاح پر ٹھن جائے تو ایسے شخص کا دلیل اور سمجھ بوجھ سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ بس ہر قیمت، مناسب و غیر مناسب، کسی بھی طرح خود کو گھیر کر پارسائی کے دائرے میں لانا چاہتا ہے۔ اس سر توڑ کوشش میں ہوتا یہ ہے کہ ایسا آدمی جلد ہی اپنی محنت کا اس قدر گرویدہ ہو جاتا ہے کہ خود کو باقی ہر شخص سے کہیں زیادہ نیکوکار اور متقی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی اسی دھن میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ 'جب ہم نے ثالثی پر زور دیا تھا' وہب نے جواب دیا، 'ہم گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے اور نادانستگی میں کفر کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن اب ہمیں احساس ہو گیا اور ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں۔ ہم نے توبہ کر لی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو تو ہم تمہارا بھرپور ساتھ دیں گے۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے تو جیسا قران میں کہا گیا ہے ویسے ہی ہم بھی تمہاری گمراہی کے سبب ہر طرح کے شخصی امتیاز اور برگزیدہ حیثیت کو رد کرتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کسی بھی طرح غداری، دغا بازی اور مکر کو پسند نہیں کرتا'۔

وہب نے جوں ہی یہ کہا، مسجد میں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عوام علی کو دین سے غدار قرار دیے جانے پر ہتھے سے اکھڑ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہب نے کوفہ بھر کو بھی جہالت میں مبتلا قرار دے دیا۔ جہالت یا جہل سے وہب کی مراد اسلام سے پہلے کا دور تھا۔ 'ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میرے بھائیو! اس جگہ کو چھوڑ جاؤ جہاں مکار لوگوں کی بسر ہے' یہ کہہ کر وہب مسجد سے نکل گئے اور پیچھے پیچھے تین ہزار پیروکار بھی شہر سے روانہ ہو گئے۔ یہ لوگ کوفہ سے پچاس میل شمال کی جانب دجلہ کے کنارے، نہروان کے مقام پر

اپنے اہل و عیال سمیت ایک نئی بستی بسالیں گے۔ یہ جگہ وہب کے مطابق پاکیزگی اور بے آلائشی کا گھر ہو گی اور یہاں صرف پارسا اور نیکو کاروں کی، بد عنوان اور گمراہ دنیا سے دور بسر رہا کرے گی۔

اگر اسلام میں بنیاد پرستی کی تاریخ لکھی جائے تو بلا شبہ وہب اور ان کے پیروکار سب سے پہلے بنیاد پرست کہلائے جائیں گے۔ یہ گروہ خود کو 'رد کرنے والے' یا 'خوارج' کہلوائیں گے، جس سے مراد 'خارج ہو جانے والے' یا 'چھوڑ کر چلے جانے والے' ہے۔ وہ اپنے نعرے کے مصداق، اس اصطلاح کا حوالہ بھی خدا، یعنی خدا کے کلام، قران کی نویں سورت کی اس آیت سے اخذ کریں گے جس میں کہا گیا ہے کہ، 'جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور خدا کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے رہے۔ خدا کے یہاں ان کے درجے بہت بڑے ہیں'۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قران کی اس سورت کا عنوان بھی 'التوبہ' یا 'توبہ' ہے۔ گویا اس گروہ نے روشن راہ دیکھ لی اور توبہ کر کے سیدھی راہ پر روانہ ہو گئے۔ لیکن ان کا مسئلہ یہ ہو گا کہ اپنی پرانی روش پر بے انتہا شرمسار اور نادم ہوں گے، جس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کا عہد کر لیں گے۔ حتی کہ عمل میں شدید کٹر پن کی حد بھی پار کر لیں گے۔ خود کو راہ راست پر رکھنے کی دھن میں یہ لوگ اب زندگی اور معاملات زندگی کی ہر شے کو قران کے ساتھ جوڑ لیں گے اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات بھی اسی سے منہا کیا کریں گے۔ چونکہ یہ توبہ کے بعد پارسائی اور نیکوکاری کی حدوں کو چھونا چاہتے تھے اس لیے ایک وقت ایسا آئے گا کہ کٹھور پن کی حد تک معاملات دین اور دنیا کو سخت بنالیں گے کہ اس کی روشنی میں یہ صرف اور صرف خود کو ہی متقی اور راست باز سمجھیں گے۔ کسی دوسرے شخص، گروہ یا قوم کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔ اور جیسا کہ عام طور پر پارسائی اور نیکوکاری کے زعم اور گھمنڈ میں ہوا کرتا ہے، جلد ہی ان کی یہ لگن اور ولولہ بڑھ کر جنون کی شکل اختیار کر لے گا۔ جلد ہی یہ باقی تمام گروہوں کی نظر میں کٹھ ملا یا انتہا پسند وغیرہ مشہور ہو جائیں گے۔

پھر یوں ہوا کہ ہر وہ شے جو خوارج کے طے کردہ معیار سے کمتر یا ناکافی ہوئی، وہ چیز یا فعل بدعت اور ایسا شخص مرتد قرار پائے گا۔ ان کا نظریہ یہ ہو گا کہ ایسی ہر چیز یا شخص کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیے کہ مبادا یہ ان کی یا کہیے دنیا میں کسی بھی پارسا یا متقی شخص کی زندگی کو آلودہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے اگر ان کے یہی

خیالات تھے، اب اس ضمن میں عملی اقدامات بھی اٹھانے لگے۔ یہ نہروان اور اس کے مضافات میں واقع دیہاتی علاقوں میں جا بجا عام لوگوں کو جہاں چاہتے، دھر لیتے اور باز پرس شروع ہو جاتی۔ اگر کوئی شخص جوابات یا اپنے افعال میں ان کے طے کردہ دین کے سخت اور بے لچک معیار پر پورا نہ اترتا تو ان کے مطابق 'مجرم' کو مرتد اور اس کے افعال کو بدعت قرار دیا جاتا اور سزا سنائی جاتی۔ سزا عام طور پر وہی ہوتی جو مرتد کے لیے عام تھی، یعنی اس کا 'خون حلال' سمجھتے ہوئے موقع پر ہی موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

معاملات یوں ہی چلتے رہے تاآنکہ ان کا سامنا محمد ﷺ کے ایک دیرینہ ساتھی کے بیٹے سے نہ ہو گیا جو پیشے کے لحاظ سے کسان تھا۔ یہ شخص خوارج کی بنیاد پرستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہب کے گروہ سے تعلق رکھنے والے کئی مرد ایک دن اس کسان کے گاؤں میں روزمرہ ضرورت کا مال واسباب خریدنے پہنچے۔ یہاں ان کا سامنا اس کسان سے ہو گیا اور انہوں نے حسب عادت اس سے باز پرس شروع کی۔ اس کا حال اور رویہ دیکھ کر اسے سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ اس شخص کے والد ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جنگ جمل کے موقع پر کسی بھی فریق کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ خوارج کی ٹولی نے اسی تناظر میں ایک انتہائی بوجھل اور جذباتی سوال پوچھا، "کیا تمہارے باپ نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ پیغمبر نے خود ان سے کہا تھا، 'ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں فتنہ پھیل جائے گا۔ اس فتنہ پرور دور میں آدمی کا دل اسی طرح مردہ ہو جائے گا جیسے کہ موت کی وجہ سے جسم مر جاتا ہے۔ اگر تم خود کو اس دور میں پاؤ تو بجائے سنگ دل قاتل بننے کے، قتل ہو جانا' کیا انہوں نے ایسا ہی نہیں کہا تھا؟"

اگرچہ کسان خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا مگر پھر بھی نڈر ہو کر جواب دیا کہ بے شک پیغمبر نے اس کے والد سے ہوبہو یہی بات کہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا ساتھ دینے سے انکار کیا تو ان کی نظر میں وہ بھی غدار اور دغاباز سمجھا جائے گا اور یہ کہ پیغمبر کی کہی اس بات کا بے بنیاد جواز بنا کر یہ اسے قتل بھی کر سکتے ہیں۔ وہ ان کے ارادے بھانپ گیا جو ہرگز نیک نہیں تھے۔ خوارج جوں ہی اسے قابو کرنے کے لیے آگے بڑھے اور تلواریں سونت لیں۔ اس نے اب واقعی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا اور کہا، 'علی تم سے کہیں زیادہ اللہ کے احکامات اور اس کے رسول کی تعلیمات سے واقف ہے'۔

یہ کہہ کر گویا اس نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط ثبت کر دیے۔ خوارج کے نزدیک علی مرتد تھے اور ہر وہ شخص جو کسی مرتد کی حکمرانی یا علمی حیثیت کو قبول کر لے، وہ خود بھی مرتد ہے۔ ایسے شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سب اس کسان پر بل پڑے اور پکڑ کر ہاتھ پیر باندھ دیے۔ پھر اسے اور اس کی حاملہ بیوی کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے دریا کے کنارے کھجور کے ایک باغ میں لے گئے۔

روایت میں اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات انتہائی واضح انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ کھجور کے باغ میں ان کے بیچ یہی کشمکش جاری تھی۔ ابھی سزا دینے کی تیاری ہو رہی تھی کہ اسی اثناء میں، جس درخت کے نیچے یہ سب جمع تھے، ایک پکی ہوئی کھجور زمین پر گر پڑی۔ خوارج میں سے ایک شخص نے یہ کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال دی۔ 'تم نے اس کھجور کے مالک کی مرضی کے بغیر، اس کی قیمت ادا کیے بنا ہی یہ کھجور کھالی؟' خوارج کی ٹولی کے سربراہ نے اس شخص کو اس حرکت پر ٹوکا۔ 'تھوکو! فوراً تھوکو۔۔۔' تب ہی ایک تیسرا شخص ہاتھ میں ننگی تلوار گھماتے ہوئے آگے بڑھا اور پہلے شخص کو اسی بات پر دھمکانے لگا۔ اس شخص کی پیٹھ پر ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ اچانک ہی یہ گھومتی ہوئی تلوار کی زد میں آ گئی اور اس کی گردن کٹ گئی۔ گائے مر گئی۔ اس پر ٹولی میں شامل سب ہی لوگ، اس تیسرے شخص کو لعن طعن کرنے لگے۔ اسے کہا کہ وہ فوراً گائے کے مالک کو ڈھونڈ کر لائے اور ان کے سامنے پوری قیمت ادا کرے۔ سب یہیں انتظار کرتے رہے تا آنکہ ان دونوں اشخاص، یعنی کھجور کھانے والے اور گائے کو ہلاک کرنے والے نے مالکان کو ہرجانہ ادا نہیں کر دیا۔ جب کھجور اور گائے کا حساب چکتا ہو گیا، یعنی یہ کہ پارسائی کا انتہائی ثبوت دے دیا گیا تو پھر یہ دوبارہ کسان اور اس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ اپنی نیکوکاری کا مزید ثبوت دیتے ہوئے ان کے ساتھ بھی انصاف کر سکیں۔ انہوں نے کسان کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی کو قتل کر کے پیٹ چاک کر لیا۔ پیٹ میں سے مرا ہوا بچہ نکالا اور اس کے بھی تلوار آر پار کر دی۔ پھر کسان کا بھی سر قلم کر دیا گیا۔ 'اس کا خون یوں بہہ رہا تھا جیسے چمڑے کا لیس ہوتا ہے'۔ ایک عینی شاہد نے بعد میں قسم اٹھا کر کہا۔ انصاف کے تقاضے پورے کر دیے گئے۔ یعنی کھجور تھوک دی گئی، گائے کی قیمت بھی ادا ہو گئی اور کسان اپنی بیوی بچے سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس کام سے نبٹ کر انہوں نے اپنی ضرورت کا سامان خریدا اور واپس نہروان کی راہ لی۔

اس ٹولی نے یہ فعل انتہائی سوچ سمجھ کر اور پوری طرح ہوش و حواس میں، اپنے ضمیر اور نیک نیت کو سامنے رکھ کر سر انجام دیا تھا۔ یہاں تک کہ حاملہ بیوی اور اس کے پیٹ میں بچے کو بھی انہوں نے بعد ازاں روایت کیا کہ اللہ کے حکم کے عین مطابق قتل کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ دشمن یا مرتدوں کی عورتیں اور بچے بھی اپنے گمراہ شوہروں اور بھائی، باپ اور بندوں کے گناہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ ہر گز بے گناہ نہیں ہیں۔ یوں ساتویں صدی عیسوی میں پیش آنے والے اس واقعہ میں اس عمل سے خوارج نے اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک انتہائی دل خراش مثال قائم کر دی۔

اپنے ساتویں صدی کے نقیب، یعنی عبداللہ بن وہب کے نقش راہ پر چلتے ہوئے، عبدالوہاب بھی گیارہ صدی بعد 'ایمان لا کر اور وطن چھوڑ کر' آگے بڑھیں گے اور پیروکاروں کو لیے صحرا عرب کے وسط میں واقع کوہستانی علاقے میں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لیں گے۔ یہاں، اس علاقے میں جہاں آج کل جدید شہر ریاض آباد ہے، یہ اپنی فوجی بستی بنا لیں گے۔ اس بستی کے باسیوں کے مطابق وہ تاریکی اور جہالت کے اس دور میں خالص تعلیمات اسلامی پر گامزن ہو کر اس بدعنوانی اور بے دینی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے جو اس دور میں مکہ اور مدینہ میں بھی جاری تھی۔ خوارج کی ہی طرح وہابی بھی، انہی کے نظریات سے متاثر ہو کر، اپنے تئیں پارسائی اور نیکوکاری میں کٹر خیالات کی بنیاد پر صحرا کے طول و عرض میں چھاپہ مار کاروائیوں کا آغاز کر دیں گے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں یہ مدینہ میں فاطمہ اور کئی دوسرے لوگوں کے مزارات کو منہدم کر دیں گے۔ یہاں تک کہ محمد ﷺ کے مزار پر تعمیر کیے گئے مقبرے کو بھی نقصان پہنچے گا۔ ان کے مطابق اس طرح آراستہ اور مزین مقبرے اور مزار بت پرستی کی ایک شکل ہیں۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ عراق کے شہر نجف میں علی اور کربلا کے مقام پر ان کے بیٹے حسین علیہ السلام کے مزارات پر قائم مقبروں کو بھی تباہ کر دیں گے۔

وہابیوں کی اسلام کے اصل پیغام کی طرف لوٹ جانے کی چاہ اور اس بابت جوش اور جذبہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھی کم نہیں ہوا بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ روز بروز بنیاد پرستی کی نئی حدوں کو چھونے لگے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اثر و رسوخ صرف سعودی عرب تک محدود نہیں ہے بلکہ

افغانستان میں طالبان تحریک، مصر میں سلفی تحریک اور القاعدہ وغیرہ میں پایا جانے والا جوش و خروش اور جذباتیت میں انہی نظریات کا عمل دخل ہے۔ ان نظریات کے تحت اسلام کے اندر اور باہر، دین کے دشمنان ایک ہی طرح سے خطرناک تصور ہوں گے۔ بلکہ وہ جو اسلام کے اندر ہیں، غیروں کی نسبت زیادہ سخت سزا کے حقدار ہوں گے۔ مثال کے طور پر مصر کے صدر انور سادات کا 1981ء میں قتل، اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ یوں کہ اسلامی دنیا میں ہر وہ رہنما جو دشمن کے ساتھ امن قائم کرنا تو دور کی بات، اگر مذاکرات کی بھی جرات کرے گا، بالآخر سب سے بڑا دشمن اور شیطان کا پیروکار کہلائے گا۔ بلکہ صرف ایسا رہنما ہی نہیں بلکہ اس کے پیروکار، ساتھ کام کرنے والے اور یہاں تک کہ ایسے شخص تھوڑا یا بہت، صرف اتفاق کرنے والے لوگ بھی سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔

آج عراقی شیعہ کے یہاں یہ لفظ 'وہابی'، سنی شدت پسندی کی ہر قسم اور شکل کے لیے بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ اس بابت انتہا پسندوں کی شہریت، تعلق یا پس منظر کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے۔ تب سے آج تک اگر عراق میں جاری خانہ جنگی اور اقتدار کی جنگ کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے شیعہ کی یاداشت میں برتی جانے والی عدم رواداری اور سفاکی ہی چھلکتی ہے جس کے ڈانڈے دجلہ کے کنارے واقع باغ میں پیش آنے والے اس واقعہ سے جا ملتے ہیں جس میں ایک کسان اور اس کی حاملہ بیوی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کے مطابق ستم ظریفی تو یہ ہے کہ قاتل اپنے فعل پر مطمئن تھے اور اپنے تئیں نیکوکار اور پارسا بنے پھرتے تھے۔ اس کے ساتھ، شیعہ کو یہ روگ بھی ہے کہ کوفہ میں اس وقت کے منتخب اور حقدار خلیفہ، یعنی علی پر قرآن اور نبوی تعلیمات سے انحراف کا الزام بھی کس طرح، اتنی آسانی سے دھر دیا گیا؟ مزید یہ کہ یہ سب کرنے والے کون تھے؟ الزام تراش وہ ہیں جنہوں نے قران کے ہی نام پر خلیفہ کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کیا تھا؟

علی کے نزدیک کھجور کے باغ میں پیش آنے والا واقعہ صرف احکامات خداوندی کی توہین نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں بڑا جرم تھا۔ اطلاع ملتے ہی انہوں نے وہب کو پیغام بھیجا۔ پیغام میں قاتلوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لکھا، "جیسا کہ قرآن میں درج ہے، 'بے شک یہ صریح فسق و فجور ہے' اللہ کی قسم اگر تم نے ایک

چوزے کو بھی اس طرح قتل کیا ہے تو اس کی جان کی قیمت اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے۔ پھر ایک انسان کی جان کی قیمت، جس کے قتل سے اللہ نے منع کر رکھا ہے، تم اس کی قدر اور قیمت کا خود ہی اندازہ لگالو'۔

وہب نے جواب دیا، 'ہم سب ہی ان کے قاتل ہیں۔ اور ہم سب ہی کہتے ہیں کہ اے علی علیہ السلام، تمہارا خون حلال ہے'۔

یہ کھلم کھلا جنگ کا اعلان تھا۔ ان الفاظ میں سموئی ہوئی ہیبت اور سفاکی آج بھی دنیا بھر میں، جو مسلمان سنتا ہے، اس کا خون خشک کر دیتی ہے۔ یہ الفاظ کہیں اور نہیں بلکہ تقوی اور راست بازی کی کٹر دھن میں سے نکلے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے الفاظ ہیں جو نیکوکاری اور تقویٰ کی انتہا چاہتے تھے مگر کس قدر آسانی سے، بغیر کسی مجبوری اور زبردستی کے خدا کے نام پر قتل بھی کر لیتے ہیں۔ پھر، اپنے اس عمل پر مطمئن بھی ہیں؟ خلافت سنبھالنے کے بعد، یہ تیسرا موقع تھا کہ علی مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق، ایک بار پھر اسی راستے پر چل پڑیں گے جس کو وہ ہمیشہ سے حقارت کے لائق سمجھتے آئے تھے۔ وہ ایک مسلمان فوج لیے دوسرے مسلمانوں پر چڑھائی کے لیے نکل پڑیں گے۔

جب علی کی افواج نہروان پہنچیں تو مزید وقت ضائع کیے بغیر، سیدھا ہلا بول دیا۔ یہ مہم انتہائی سبک انداز میں، خون ریزی کی پرواہ کیے بغیر انتہائی سرعت سے نبٹالی گئی۔ علی کی افواج کے مقابلے میں خوارج کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے باوجود، انہوں نے اپنی جان اور مال کی پرواہ کیے بغیر جنگ لڑی اور ظاہر ہے، بری طرح پسپا ہوئے۔ روایت میں لکھا ہے کہ جنگ کا آغاز ہوا تو خوارج ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے دہاڑ کر نعرے بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے، 'سچائی نے ہمارے لیے اپنا آپ دکھا دیا ہے۔ خدا سے ملنے کی تیاری کرو۔ ٹوٹ پڑو!'۔

اس روز بلند ہونے والا یہ نعرہ، آگے چل کر کئی ہیبت ناک جنگجوؤں اور آج اکیسویں صدی میں خود کش حملہ آوروں کے لیے فال کی طرح شگون بن جائے گا۔ یہ نعرے کہ، 'جنت پانے کی جلدی اور خدا سے شوق ملاقات!' وغیرہ آج سننے میں عام مل جاتے ہیں۔

خیر، خوارج میں سے صرف چار سو افراد ہی زندہ بچ پائے۔ حالانکہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ علی کے حق میں بہتر یہی ہوتا اگروہ اس روز کسی کو زندہ نہ چھوڑتے۔ اس دن وہب کے نظریات کو دو ہزار شہداء مل گئے اور جیسا کہ عام طور پر شہداء کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی شہادت کی یاد تحریک کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہے اور نئے لوگ اس قافلے میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔

وہ شخص جس نے فتنے سے بچنے کے لیے کیا کچھ قربان نہیں کیا تھا، اب یہ حال ہو گیا کہ وہ خانہ جنگی میں گھر کر تین خونخوار جنگیں لڑ چکا تھا۔ تینوں جنگوں میں اسے فتح حاصل ہوئی تھی یا کہیے کہ اگر صفین کے میدان میں ان کے آدمی پیچھے نہ ہٹتے تو فتح یاب ہوتے۔ لیکن ذاتی طور پر وہ اس کے باوجود روز بروز اندر ہی اندر بڑھتی ہوئی خود سے نفرت اور کراہت سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ کیا انھوں نے پچیس سال اس سب کے لیے انتظار کیا تھا؟ بجائے یہ کہ وہ اسلام کو نئی بلندیوں سے سرفراز کرتے، اتحاد اور یگانگت کی نئی تاریخ رقم ہوتی۔ بجائے اس کے، یہاں تو مسلمانوں کا قتل عام ہی رکنے میں نہیں آرہا؟ آخر یہ کیسا امتحان ہے؟

'جب سے میں خلیفہ بنا ہوں' وہ اپنے ایک ہمزاد سے کہنے لگے، 'معاملات مسلسل میرے خلاف ہی جا رہے ہیں اور میں کمتر ہو کر رہ گیا ہوں' اگر بد عنوانی، ظلم و ستم اور جبر کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ضروری نہ ہوتا تو 'اللہ کی قسم، میں قیادت کی باگ ڈور چھوڑ دیتا۔ اس دنیا سے اب مجھے کراہت آتی ہے۔ ایسی ہی گھن آتی ہے جیسی بکری کی ناک میں چربی کے ذائقے میں باس سے آیا کرتی ہے'۔

معاویہ بدستور علی کے خلاف متحرک تھے۔ چنانچہ علی کا یہ خیال کہ روز بروز ان کا حال بدتر ہوتا جا رہا ہے، آگے چل کر بدترین ہو جائے گا۔ جو معاویہ کا طریقہ تھا، وہ اسی پر گامزن رہتے ہوئے ہر موڑ پر علی کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھے۔ 'صفین کے بعد۔۔۔' معاویہ نے کافی عرصہ بعد انتہائی اطمینان سے کہا، 'میں نے علی پر یہ جنگ بغیر کسی لشکر اور مشقت کے بھی مسلط کیے رکھی'۔

ثالثی اور تحکیم کا جو معاہدہ صفین میں طے پایا تھا، اس پر عمل درآمد کرنے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگ گیا۔ کئی سفارتی اور سیاسی تیاریاں تھیں، جو مکمل کی گئیں۔ کئی عوامل اور رکاوٹیں دور کی گئیں۔ جیسے

مذاکرات کا ایجنڈا کیا ہوگا؟ دونوں طرف سے وفود میں کون شامل ہوگا؟ یا وفود میں کون شامل نہیں ہو سکتا؟ وفود میں اراکین کی تعداد کیا ہوگی؟ مذاکرات کا دورانیہ کیا ہوگا؟ اس ضمن میں کون سا طریقہ بہتر رہے گا؟ مذاکرات بند دروازے کے پیچھے ہوں گے یا اس کے لیے عوامی کچہری لگائی جائے گی؟ جہاں بھی ہوں، ادوار کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ مذاکرات منعقد کہاں کیے جائیں؟ بالآخر فیصلہ ہوا کہ کوفہ اور دمشق کے وسط میں ایک چھوٹے سے قصبے میں یہ سب ہوگا۔ اتنی تیاری کے باوجود بھی جب دونوں وفود جمع ہوئے اور بات چیت میں بھی ہر طرح کے تقاضے پورے کیے گئے لیکن اس مشق کا نتیجہ انتہائی تلخ برآمد ہوا۔

ہوا یہ کہ معاویہ کی نمائندگی ان کے مشیر خاص اور نائب عمرو کر رہے تھے۔ عمرو نے پہلے پہل اسلام کے لیے مصر فتح کیا تھا اور جلد ہی اپنی خدمات کے صلے میں یہاں کے گورنر مقرر کر دیے جائیں گے۔ علی نے اس موقع پر نمائندگی کے لیے اپنے نائب کو بھجوانا چاہتے تھے۔ یہ وہی جرنیل ہیں جنہوں نے شروع دنوں میں بخوشی معاویہ سے نبٹنے کی حامی بھری تھی کہ، 'میں اسے وہاں چھوڑ کر آؤں گا جہاں اسے آگے اور نہ پیچھے کا رستہ سجھائی دے گا'۔ لیکن علی کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ اس جرنیل کی بجائے ابو موسیٰ کو موقع دیں۔ ابو موسیٰ وہ ہیں جنہوں نے جنگ جمل سے پہلے لوگوں کو فتنے سے خبردار کرتے ہوئے تلواروں کو واپس میان میں رکھ کر نیزوں کو پیچھے سرکانے اور کمانوں کو ڈھیلی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ،'فتنہ معاشرے کو السر کی طرح گلا کر رکھ دیتا ہے' اور اب جب یہ السر واقعی گلانے اور سڑانے میں لگا ہوا تھا، لوگوں کو ان کی کہی باتیں رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ یہ ضرور تھا کہ وہ لوگ جو ابو موسیٰ کو نمائندگی کا موقع دینے کے حق میں تھے، اچھی طرح واقف تھے کہ وہ 'تلوار اور زبان کے وار سہنے میں ہلکے تھے'، یعنی وہ اپنی عمر کی زیادتی اور طبیعت کی وجہ سے باآسانی تیز طرار لوگوں کی باتوں میں آجاتے تھے مگر یہ بھی تو تھا کہ یہ ابو موسیٰ ہی تھے جنہوں نے، 'ہمیں اس اندھے کنوئیں میں گرنے سے پہلے خبردار کیا تھا'۔ تب وہ جانتے تھے کہ ہم کنوئیں میں گر رہے ہیں، اب شاید کیا خبر، وہ ہمیں اس اندھیرے سے نکال بھی لیں؟ چنانچہ یہ لوگ کسی بھی طرح کسی دوسرے شخص کو بھجوانے پر راضی نہ ہوئے۔

یہ مجلس خاص دو ہفتوں تک جاری رہی۔ مذاکرات کے کئی طویل ادوار خدا خدا کر کے تمام ہوئے تو آخر

میں ابو موسیٰ اور عمرو مشترکہ بیان جاری کرنے کے لیے باہر نکلے۔ جیسا کہ ابو موسیٰ نے سمجھا تھا، انہوں نے کہا کہ یہ بہترین حل ہے۔ حل یہ ہے کہ ایک شوریٰ منعقد کی جائے گی جو علی کی خلافت اور معاویہ کی بطور گورنر شام توثیق کر دے گی۔ ابو موسیٰ نے یہی اعلان سینکڑوں لوگوں کے سامنے دہرا دیا جو اس وقت، کئی دنوں سے مذاکرات کے نتائج کا اعلان سننے کے لیے پڑاؤ ڈال کر بیٹھے تھے۔ یہیں پر آکر معاملات بگڑ گئے۔

وہ یوں کہ جب عمرو اپنی باری آنے پر معاویہ کی طرف سے سمجھوتے کا اعلان کرنے کے لیے پنڈال میں آئے تو بجائے یہ کہ وہ ابو موسیٰ کی بات کی تصدیق کرتے، انہوں نے ابو موسیٰ کے بارے کہا کہ شاید وہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے سمجھ نہیں پائے۔ پھر درشتگی کے انداز میں کہا کہ دراصل وہ اور ابو موسیٰ اس بات پر تو بالکل متفق ہوئے ہیں کہ شوریٰ منعقد کی جائے گی۔ لیکن اس شوریٰ کا مقصد علی نہیں بلکہ ان کے حریف کو خلیفہ مقرر کرنا ہے۔ عمرو نے اپنے خطاب کو سمیٹتے ہوئے کہا، 'اب میں معاویہ کی بطور خلیفہ تقرری کی توثیق کرتا ہوں۔ وہ عثمان کے جانشین اور ان کے خون کے بدلہ جو ہیں'۔

یہ سنتے ہی چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ لوگ گالم گلوچ کرنے لگے اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ ہجوم اتنا مشتعل ہو گیا کہ انہوں نے پنڈال کو اکھاڑ پھینکا اور اس قدر ہنگامہ ہوا کہ حالات جہاں تھے، وہیں واپس پہنچ گئے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہو گئے۔ ابو موسیٰ موقع سے نکل کر فوراً ہی مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دن کے بعد انہوں نے مایوس ہو کر ہر طرح کے ریاستی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی عمر کا آخری وقت عبادت اور گوشہ نشینی میں بسر کیا۔ انہوں نے مکہ میں ہی وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ دوسری طرف عمرو واپس دمشق چلے گئے، جہاں معاویہ کو خلیفہ مقرر کرنے اور رسمی طور پر بیعت کے امور میں مشغول ہو گئے۔

658ء میں پہلی بار اسلامی دنیا کے دو خلفاء تھے۔ بلکہ کہیے، ایک خلیفہ تھا اور دوسرا اس کا مدمقابل خلیفہ تھا۔ مگر پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان میں سے کون خلیفہ اور کونسا خلیفہ کا مدمقابل ہے؟

آنے والے دنوں میں علی کے لیے خلافت پر گرفت قائم رکھنا تو دور، اس کے امکانات کا دفاع کرنا بھی

مشکل ہو جائے گا۔ چونکہ وہ اصولوں پر سمجھوتے پر راضی نہیں ہوں گے اور محصولات کے معاملے میں تو ہر گز لچک نہیں دکھائیں گے، اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے پشت سے لگ جائیں گے۔

اشرافیہ میں اثر ورسوخ رکھنے والے امراء اور قبائلی سردار حسب رواج، اپنے رتبے اور حیثیت کی وجہ سے برتر سلوک اور امتیاز کے عادی تھے۔ ظاہر ہے، اگر ان میں اور عام لوگوں میں تفریق باقی نہ رہے، یا اس تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ قطعاً ایسے نظام یا معاشرے کا حصہ بننا پسند نہیں کریں گے۔ ایسے لوگ دوسری راہیں دیکھنے لگتے ہیں اور حربے تلاشتے ہیں جس میں ان کا رتبہ اور اکڑ خانی قائم رہے۔ معاویہ ان کی اسی عادات کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے 'شہد میں تولنے' کی اصطلاح استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ اگر علی کے یہاں ان امراء کی دوسرے لوگوں کی نسبت امتیازی حیثیت برقرار نہیں رہتی تو معاویہ ان کی یہ ضرورت پوری کر سکتے تھے۔ اگر علی بدستور اپنے فلسفہ مساوات پر اڑے ہیں تو کیا ہوا؟ معاویہ کو تو ایسا کوئی بھی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایسا بھی ہوا کہ جب برابری کے نئے قوانین کے تحت علی کے ایک ہمزاد کے نام جاری خصوصی وظیفہ بند کر دیا گیا تو اسے جلد ہی معاویہ نے پہلے سے بھی کہیں زیادہ مال اور دولت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ صرف ایک پہلو تھا۔ 'شہد میں تولنے' کی حکمت عملی کے کئی دوسرے فوائد بھی تھے۔ مثال کے طور پر معاویہ کافی عرصے سے مصر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان دنوں یہاں کے گورنر محمد ابو بکر ہوا کرتے تھے۔ یہ عائشہ کے سوتیلے بھائی اور علی کے لے پالک بیٹے تھے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے پہلے مدینہ اور پھر عثمان کے محل کا گھیراؤ کیا تھا اور بعد ازاں عثمان کو قتل کرنے والی ٹولی کے سرغنہ بھی تھے۔ علی کے خلیفہ مقرر ہوتے ہی محمد ابو بکر کو مصر کا گورنر مقرر کیا گیا تھا مگر ابھی تک وہ اس صوبے کے انتہائی کمزور حاکم ثابت ہوئے تھے۔ خود علی کہا کرتے تھے کہ محمد ابو بکر 'نادان اور ناتجربہ کار جوان لونڈا' ہے۔ جب علی کو اطلاع ملی کہ معاویہ نے عمرو کو مصر پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے تو انہوں نے اپنے سب سے تجربہ کار جرنیل کو راستہ روکنے کے لیے مصر کی شمالی سرحدوں کے دفاع کے لیے روانہ کیا۔ یہ جرنیل اپنے آدمیوں کو لیے کشتی پر سوار ہو کر سمندر کے راستے روانہ ہوا کیونکہ راستے میں فلسطین پڑتا تھا، جہاں معاویہ کا راج تھا۔ مقصد

یہ تھا کہ یہ زمینی راستہ ترک کر کے معاویہ کے حمایتیوں اور جاسوسوں کی بچھائی رکاوٹوں سے بچا جا سکے۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ ہوا یہ کہ جب مصر میں بندرگاہ پر کشتی لنگر انداز ہوئی تو جرنیل کے استقبال کے لیے صوبے کے حکام میں سے ایک چیدہ افسر حاضر تھا۔ اس نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور پرپتاک استقبال کیا گیا۔ مگر پس پردہ یہ تھا کہ اس شخص کو معاویہ نے پہلے ہی 'شہد میں تول کر' اپنے ساتھ ملا رکھا تھا، یعنی یہ بک چکا تھا۔ اس نے جرنیل کو رواج کے مطابق مہمان نوازی کے طور پر شہد سے تیار کردہ مشروب پیش کیا۔

شہد سے تیار کردہ اس مشروب میں زہر ملا ہوا تھا۔ شربت نوش کرنے کے بعد چند گھنٹوں میں ہی جرنیل کی موت واقع ہو گئی۔ بعد ازاں عمرو اس واقعہ کو یاد کر کے کہا کریں گے کہ، 'معاویہ کی تو شہد میں بھی فوجیں ہوا کرتی ہیں'۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ میں زہر کا استعمال سورمانہ ہتھیار نہیں ہوتا۔ یہ خاموش قاتل ہے جو چن کر مارتا ہے۔ یعنی یہ کہ جنگیں تو کھلم کھلا، منہ در منہ لڑی جاتی ہیں، زہر سے یوں چوری چھپے وار کرنا، کسی بھی طرح سے بہادری نہیں ہے۔ لیکن، معاویہ کو جنگجوئی اور بہادری کی ان الف لیلوی داستانوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی انہیں کہاوتوں سے کوئی فرق پڑتا تھا۔ وہ زہر کو بہترین ہتھیار قرار دیتے تھے۔

معاویہ کے ذاتی معالج کا نام ابن اثال تھا۔ یہ ایک مشہور و معروف عیسائی کیمیاداں اور دواساز بھی تھا۔ اسے زہر بنانے کے فن میں استاد مانا جاتا ہے۔ صرف ابن اثال ہی نہیں بلکہ اس کا عیسائی شاگرد، ابن الحکم بھی ایسا ہی فن مولا گزرا ہے۔ ان دونوں کا تاریخی ریکارڈ اب عام نہیں ملتا لیکن نویں صدی میں بغداد سے تعلق رکھنے والے کیمیادان، ابن وحشیہ نے اپنی زہر کے علوم سے متعلق شہرہ آفاق کتاب، جو اس نے اپنے بیٹے کے لیے حوالے کے طور پر لکھ رکھی تھی، اس میں ابن اثال اور اس کے شاگرد ابن الحکم کا حال، علم اور کارنامے تفصیل سے درج کر رکھے ہیں۔

ابن وحشیہ کی اس شعبے میں خدمات اور تحقیق حیاتیات اور کیمیا کے علم پر مبنی ہے لیکن اس علمی مواد میں جابجا توہمات کا تڑکا بھی نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود یہ علوم آنے والی صدیوں میں مزید تحقیق اور تکنیک کے

لیے حوالے کے طور پر استعمال ہوتے رہیں گے، بلکہ کئی نسخے تو ایسے ہیں جن پر آج بھی کام جاری ہے۔ ان میں کچھ تو نہایت عجیب و غریب ٹوٹکے ہیں۔ مثلاً ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ آواز کو بطور زہر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض آوازوں میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ مخصوص مواقع اور کیفیات میں ان کے درست استعمال سے کسی بھی شخص کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صلب کی جا سکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں آواز کے بارے یہی مانا جاتا تھا اور حوئب کے چشمے پر، ان مخصوص حالات میں عائشہ کا یک دم ہی کتوں کے مسلسل بھونکنے کی آواز پر پہلے پریشانی، پھر ہیجان اور آخر میں دہشت اس کی بہترین مثال قرار دی جاتی ہے۔ یہ تو آواز کا قصہ تھا۔ ابن وحشیہ کے مطابق ابن اثل اور ابن الحکم کی تحقیق کے مطابق زہر کی کئی اقسام ایسی ہیں جنہیں بنانے کے لیے سانپوں، بچھوں اور رتبل مکڑیوں کے سر، دھڑ یا ان سے بنے سیال اور رطوبتیں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سانپ وغیرہ تو زہریلے ہوتے ہی ہیں مگر کئی ایسے زہر بھی ہیں جن میں بے ضرر جانوروں کے جسمانی اعضاء اور جسم سے خارج شدہ مادے مصرف میں لائے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ زہر جو عام ملتے تھے، زیادہ تر کا تعلق خوراک سے ہوتا تھا۔ گلی سڑی خوراک میں پائے جانے والے جرثوموں، جس کا اس زمانے میں لوگوں کو ادراک نہیں تھا مگر پھر بھی، بقول ابن وحشیہ اس 'سڑانڈ' کی مدد سے ہدف کو زہر نابی یا کلمگی جیسی بیماریوں میں مبتلا کیا سکتا تھا۔ زہر کی ایک قسم ایسی تھی جسے ضعیف اونٹنی کے خون سے تیار کیا جاتا تھا۔ نحیف اور انتہائی لاغر اونٹنی کے خون کو اسی کے عمر رسیدہ پتے کی رطوبت میں کوٹ لیا جاتا تھا۔ پھر اس پر جنگلی پیاز کے رس اور سال آمونیک (امونیم کلورائڈ) کا چھڑکاؤ کر کے تقریباً ایک مہینے کے لیے گدھے یا گھوڑے کی لید میں دبا دیا جاتا۔ یہاں تک کہ یہ 'باسی ہو جاتی اور اس پر پھپھوندی لگ جاتی اور اس کے اوپر مکڑی کے جالے جیسے مواد کی تہہ چڑھ جاتی'۔ کھانے یا پینے کی اشیاء میں اس زہر کی تھوڑی سی مقدار، تقریباً دو گرام بھی کسی شخص کو تین دن کے اندر شرطیہ ہلاک کر سکتی تھی۔

اگر کوئی چاہتا کہ مرگ میں دیر نہ ہو تو پھر اس کے لیے سب سے بہترین زہر گلی ہوئی خوبانی سے کشید کردہ سایانائڈ کا زہر ہوا کرتا تھا۔ گلی سڑی خوبانیوں سے کشید کردہ اس زہر کو بادام کی گریوں میں پیس کر کھجور کی شربت یا بکری کے دودھ میں ملا دیا جاتا اور پھر شہد سے گاڑھے کیے ہوئے اس مشروب کو پیتے ہی گھنٹوں

کے اندر موت واقع ہو جاتی۔ پھر کئی دوسرے ایسے زہر تھے جو نباتات اور جنگلی بوٹیوں سے تیار کیے جاتے۔ ان میں سب سے مشہور پہاڑی بھنگ اور جنگلی مکو/بیر سے کشید کیے جاتے تھے۔ اچھا، ایک زہریلا پودا ہوتا ہے۔ اس کو ناگ پھنی کہا جاتا ہے۔ اس پودے کی ڈال سے نکلا ہوا زہر تو بڑی مقدار میں تیار کیا جاتا تھا اور اس کی مانگ بھی بہت تھی۔ یہ زہر عام طور پر خنجر یا تلوار کی دھار پر مل دیا جاتا اور دوران لڑائی اگر اس زہر سے تر کیا ہوا ہتھیار استعمال کیا جاتا، یعنی کاٹ لگتے ہی زہر فوراً ہی خون میں سرایت کر کے جسم میں دوڑنے لگتا اور ہدف آنکھوں کے سامنے، منٹوں کے اندر غش کھا کر گرتا اور منہ سے جھاگ بہاتے وہیں مر جاتا۔ ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں دمشق کے کیمیادانوں نے ایک ایسا زہر بنا لیا تھا جسے بوجوہ 'ترکے کا سفوف' کہا جاتا تھا۔ اس زہر کو بنانے میں شفاف سنکھیا کا عنصر استعمال ہوتا تھا جو بے ذائقہ اور بے بو ہوا کرتا تھا اور اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کا نام ترکے یا وراثت سے اس لیے جوڑا جاتا تھا کہ یہ زہر عام طور پر وہ لوگ استعمال میں لاتے تھے جو وراثت یا جائیداد کے معاملات میں گھرے، مال ہتھیانے کے چکر میں اپنے قریبی عزیزوں کو وقت سے پہلے دنیا سے رخصت کرنے کے خواہاں ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کو کسی ایسے طریقے کی تلاش رہتی تھی جس میں کسی بھی طرح سے قتل یا غیر قدرتی طریقے سے موت جیسے زہر کا سراغ نہ ملتا ہو۔

اگر ہاتھ میں اس طرح کے کاری ہتھیار، سمجھدار کیمیادان اور زہر کے سلاح خانے ہوں تو پھر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ معاویہ کے لیے علی کے خلاف افواج کے بغیر بھی جنگ مسلط رکھنا کس قدر آسان رہا ہو گا۔ 'شہد' اور 'شہد میں تول' ان کے لیے خوب کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ یعنی یہ کہ چاہے زہر ملے شہد کا استعمال ہو یا اہم لوگوں کو خرید کر مقصد پورا ہوتا ہو، وہ اپنا کام بدستور جاری رکھے ہوئے تھے۔

شامی فوج نے مصر پر باآسانی قبضہ کر لیا۔ محمد ابو بکر نے جرنیل کی یک دم ہلاکت کے بعد سرحدوں کے دفاع کے لیے ایک فوجی ٹکڑی روانہ کی مگر یہ معاویہ کی فوج کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ انہیں چند گھنٹوں کے اندر ہی زیر کر لیا گیا۔ باقی افواج، محمد ابو بکر کی غیر موثر اور بے کار حکمرانی سے پہلے ہی تنگ آ چکی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے، ان کے اکثر جنگجو ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے اور زیادہ تر معاویہ کے ساتھ جا ملے۔

خود محمد بن ابو بکر کا انجام یہ ہوا کہ فرار ہوئے تو پیچھا کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت وہ صحرا کے بیچوں بیچ ایک انتہائی سخت گرم اور ریتلے علاقے میں زخموں اور پیاس سے نڈھال، شدید گرمی میں نیم مردہ حالت میں پائے گئے۔ شامی فوجیوں کے ہاتھ عثمان کے قاتلوں کے گروہ کا سرغنہ آگیا تھا۔ باوجود یہ کہ زندہ گرفتاری کے احکامات تھے لیکن ان فوجیوں نے کسی بھی حکم کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے محمد ابو بکر کو پکڑ کر ایک گدھے کی لاش، یعنی کارکس میں باندھ کر رسیوں سے سی دیا اور پھر اس کو آگ لگا دی۔ بعض روایات میں درج ہے کہ محمد بن ابو بکر کی سوزش سے پہلے ہی موت واقع ہو چکی تھی۔ کئی روایات میں زندہ جلانے کی اطلاع بھی ملتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علی اس خبر پر سخت گھبرا گئے اور روایت میں ان کا حال 'مخبوط الحواس' جیسا بیان کیا گیا ہے۔ عائشہ کی حالت بھی علی سے مختلف نہ تھی۔ اگرچہ وہ کبھی بھی اپنے سوتیلے بھائی کے زیادہ قریب نہیں رہیں مگر پھر بھی انہوں نے ماتم کافی عرصے تک جاری رکھا۔ وہ ماتم کرتیں تو اکثر پیغمبر کی دوسری بیوہ، یعنی معاویہ کی بہن ام حبیبہ کو منہ پر کوسنے دیتیں۔ جس پر ام حبیبہ خاصی چیں بہ جبیں رہا کرتیں۔ چنانچہ انہوں نے غصے میں جواب یوں دیا کہ عائشہ کے یہاں بھیڑ کی ادھ جلی سالم ٹانگ بھجوائی جس سے تازہ خون رس رہا تھا۔ ساتھ پیغام بھی بھجوایا کہ 'تمہارے بھائی کو اسی طرح بھون دیا تھا'۔ عائشہ نے جب خون سے نچڑتی ہوئی میمنے کی سڑی ہوئی ٹانگ دیکھی تو ان کا دل خراب ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک قے کرتی رہیں اور بعد ازاں وہ خود کہا کرتی تھیں کہ اس دن کے بعد انہوں نے دوبارہ کبھی گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

علی کے ہاتھ سے مصر نکل چکا تھا مگر اس کے باوجود چاروں طرف سے حملے متواتر جاری تھے۔ خوارج ایک دفعہ پھر سر اٹھا رہے تھے اور اب کی بار ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ صرف عراق ہی نہیں بلکہ فارس میں بھی خوارج کے حامیوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو چکی تھی جنہوں نے علی کے مقرر کردہ گورنروں کو ٹیکس یعنی زکوۃ ادا کرنے سے انکار دیا تھا۔ گورنر یہ سارا مال جمع کر کے کوفہ بھجوایا کرتے تھے۔ شامی فوج کی ٹکڑیاں اب نڈر ہو کر عراقی حدود میں داخل ہو کر حملے کر رہی تھیں۔ یہاں کی آبادیوں میں ہراس پھیل رہا تھا اور انہیں جان اور مال کی حفاظت کے مسائل کا سامنا تھا۔ عام لوگوں میں

یہ خیال عام ہو گیا کہ علی کے لیے تحفظ فراہم کرنا تو دور کی بات، وہ تو بنیادی نظم وضبط برقرار رکھنے میں بھی بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ عراق اور فارس ہی نہیں بلکہ حجاز اور عرب کے صحرا میں بھی جا بجا یورش شروع ہو چکی تھی اور کئی حملوں کی خبریں ملی تھیں۔ معاویہ نے دمشق میں رہتے ہوئے یمن کے دور دراز علاقوں میں بھی اپنی تعزیزی فوج بھجوائی تھی جنہوں نے بشمول مکہ اور مدینہ، چن چن کر علی کے ہزارہا حامیوں کو راستے سے ہٹانا شروع کر دیا۔ علی اب اپنی آزمودہ افواج کو حرکت میں لانے سے قاصر تھے، بلکہ بری طرح ناکام ہو چکے تھے۔ خانہ جنگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی لہر کے احساس سے یہ لشکری بھی کیا کرتے، سخت مایوس ہو چکے تھے۔ اب یہ مزید کسی بھی طرح سے حرکت کرنے سے معذور تھے۔ روایت میں علی کی افواج میں شامل رہنے والے جنگجوؤں کے بیانات کچھ اس طرح رقم ہیں کہ مثلاً، 'ہمارے تیر اب تھک چکے تھے' اور 'ہماری تلواریں کند ہو چکی تھی اور ہمارے نیزوں میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ ہم مایوسی کی آخری حدوں پر تھے'۔

وہ شخص جو کبھی اپنی خوش بیانی، فہم، فراست اور خطابت کے لیے مشہور ہوا کرتا تھا، اب اپنے ہی جانباز سپاہیوں کو جوش دلانے، دشمنان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس سب سے بری طرح جھنجھلا کر انہی کو کوستا تھا اور بزدلی کے طعنے دینے لگتا۔ انہیں نامرد اور تھوڑدلا قرار دے کر غیرت دلاتا رہتا۔ 'تم کو فی صرف امن کے زمانے میں شیر ہوتے ہو مگر جب بہادری دکھانے کا موقع آتا ہے تو ایک دم مکار لومڑیاں بن جاتے ہو' علی ایک دن منبر پر کھڑے اپنی افواج کو لعن طعن کر رہے تھے۔ اچانک بددعائیں دینے لگے، 'اللہ کرے تمہاری مائیں تم سے محروم ہو جائیں۔ میں نے مکہ اور مدینہ میں تمہارے بھائیوں پر ہونے والے ظلم پر تمہیں مدد کے لیے پکارا اور تم حیرت سے منہ کھولے، ناکارہ اونٹوں کی طرح پانی میں نتھنے ڈبو کر غرغراتے رہے؟ تف ہے تم پر! کسی شامی گھڑ سوار کے قریب سے گزرنے کی افواہ بھی سنتے ہو تو اپنے گھروں میں مقفل ہو کر یوں چھپ کر بیٹھ رہتے ہو جیسے کرلی بھاگ پر اپنی بل میں گھس جاتی ہے۔ تم پر جس نے بھی اعتبار کیا، اس نے دھوکہ ہی کھایا۔ جو تم پر تکیہ کرتا ہے وہ بے کار ہی مارا جاتا ہے۔ تم نے تو وہ حال کیا ہے کہ میرے دل میں اس سلوک کی وجہ سے پیپ اور سینے میں غصہ بھر گیا ہے۔ اللہ کی قسم! تمہارے ساتھ نباہ کر کے مجھے دکھ اور درد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اگر میرا مقصد اللہ کا نام بلند کرنا نہ

ہوتا تو میں ایک دن بھی تمہارے ساتھ نہ گزارتا، تم پر آسرا نہ کرتا'۔

علی کو اپنے انجام کا ادراک ہو گیا تھا۔ اس دن کے بعد علی کے کوفیوں کے ساتھ نباہ کے بھی اب بس گنے چنے دن ہی باقی تھے۔

26 جنوری، 661ء کو جمعہ کے دن صبح سویرے کا واقعہ ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ علی فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکل کر بغل میں ہی واقع کوفہ کی مرکزی مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اندھیرے میں انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ ایک مسلح شخص گھات لگائے مسجد کے دروازے میں چھپا بیٹھا ہے۔ انہیں تو تب پتہ چلا جب اس نے اچانک خنجر بلند کیا اور پیچھے سے خوارج کا مشہور نعرہ بلند کرتا ہوا کہ، 'فیصلے کا حق اللہ کا ہے!'، پھر دہاڑا کہ، 'صرف اللہ کا!' اور حملہ کر دیا۔

تلوار کی ضرب نے علی کو چکرا کر رکھ دیا۔ ان کا سر چِر گیا تھا۔ 'اس شخص کو بھاگنے مت دینا'، وہ گرتے ہوئے چلائے اور وہاں موجود باقی نمازی دوڑتے ہوئے حملہ آور کا پیچھا کرتے مسجد سے باہر نکل گئے اور تھوڑی ہی دور پہنچ کر قاتل کو جا لیا۔

اگرچہ خون مسلسل بہہ رہا تھا مگر علی ابھی تک پوری طرح ہوش و حواس میں تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں میں افراتفری پھیل گئی۔ اس فعل کا کوئی انتقام نہ لیا جائے، انہوں نے کہا۔ 'اگر میں زندہ بچ گیا تو میں خود فیصلہ کروں گا کہ اس شخص، جس نے مجھ پر حملہ کیا، اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اور اگر میں مر گیا تو ضرب کے بدلے ضرب لگا کر معاملہ صاف کر دیا جائے۔ سوائے اس کے کسی دوسرے شخص کو قتل نہ کیا جائے۔ خبردار، تم مسلمانوں کا خون نہیں کرو گے۔ تم یہ جواز نہیں پیدا کرو گے کہ، 'امیر المومنین قتل ہو گیا تو ہم اس کا بدلہ لیں گے'۔ اور کسی بھی طرح اس شخص کو قتل کر لو تو اس کی بے حرمتی مت کرنا، اس کے اعضاء مت کاٹنا۔ میں نے رسول خدا کو ایک دفعہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ، 'لاش کی بے حرمتی مت کرو، چاہے یہ ایک پاگل کتے کی ہی نعش کیوں نہ ہو'۔

قاتل کو اگلے ہی دن اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ اگرچہ

علی کو سر پر آنے والا زخم جان لیوا تو نہیں تھا مگر تلوار کے پھائے پر لگا یا ہوا زہر اپنا اثر دکھا چکا تھا۔

حسن اور حسین علیہ السلام نے اپنے والد کی میت کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ میت پر جڑی بوٹیوں اور گندھ رس کا لیپ کیا اور پھر کفن کی تین چادروں میں لپیٹ دیا۔ پھر جیسا کہ علی نے وصیت کی تھی، ان کی میت کو انہی کے پسندیدہ اونٹ پر لاد کر کھلا چھوڑ دیا گیا۔ چالیس سال قبل، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر اپنی اونٹنی کو بھی اسی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا تا کہ نخلستان میں ان کی رہائش اور مسجد کی جگہ کا تعین ہو سکے۔ جہاں اونٹنی رکی تھی، وہیں مسجد تعمیر کی گئی۔ اب اسی طرح ایک اور اونٹ، مثال زمرہ اولیاء میں شامل جانوروں میں سے ایک جانور علی کے مزار کی جگہ کا تعین کرے گا۔ جہاں یہ اونٹ گھٹنے ٹیکے گا، گویا خدا کی مرضی کے عین مطابق علی کو وہیں دفن کیا جائے گا۔

اونٹ تقریباً آدھا دن تک مسلسل چلتا رہا۔ یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا جیسے اپنی پشت پر لدے بوجھ سے خوب واقف تھا اور غم سے اس کا حال، بدحال ہو۔ یہ کوفہ سے مشرق کی جانب، خاصا باہر نکل کر ایک جگہ پر ٹھہر گیا۔ ایک اجاڑ، ریتلے ٹیلے پر پہنچ کر اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس جگہ کو نجف کہا جاتا ہے۔ نجف عربی کا لفظ ہے جس سے مراد ریت کا اونچا ٹیلا ہے۔ حسن اور حسین علیہ السلام اس شخص کو یہیں دفن کر دیں گے جس کی قدر و منزلت، عزت اور چاہ سبھی مسلمانوں کے دل میں بیش بہا ہے مگر وہ انہیں دو مختلف حوالوں، خطابات سے جانتے ہیں۔ شیعہ کے یہاں علی پہلے امام اور سنی انہیں خلفاء راشدین میں آخری خلیفہ کہا کریں گے۔

حسن نے بعد از تدفین علی کی قبر پر کھڑے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا، 'آج انہوں (خوارج) نے، حرمت کے مہینے میں، اس متبرک دن میں انہیں (علی کو) قتل کیا ہے۔ یہ وہ دن ہے جس دن قران کی پہلی آیت نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا کہ جسے اگر پیغمبر کسی مہم پر روانہ کرتے تھے تو جبرائیل اس کی ایک طرف اور میکائیل دوسری جانب ہوا کرتا تھا اور یہ تینوں شانہ بشانہ، ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اللہ کی قسم! علی سے پہلے جو گزرے ہیں، وہ ان سے برتر نہیں ہیں اور علی کے بعد جو آئیں گے، وہ کبھی ان کی جگہ نہیں لے سکتے'۔

وقت گزرتا جائے گا اور پھر علی کی قبر باقاعدہ مزار بن جائے گا۔اس پر مقبرہ تعمیر کیا جائے گا اور اس ریتلے ٹیلے کے گرد ایک شہر آباد ہو گا جسے ہم آج نجف کے نام سے جانتے ہیں۔تاریخ میں ان کا مزار کئی بار تباہ کیا جائے گا اور ہر دفعہ جب اس کی دوبارہ تعمیر مکمل ہو گی تو یہ پہلے سے کہیں زیادہ شاندار اور پر شکوہ عمارت ہوا کرے گی۔ یہاں تک کہ اکیسویں صدی میں سونے کا پانی چڑھا ہوا گنبد، بیس میل دور سے ہی نظر آتا ہے۔ روضہ کے گرد نجف شہر بیسویں صدی کے اواخر میں اتنا پھیل جائے گا کہ اس کے مقابلے میں کبھی خلافت کا مرکز رہنے والے پر رونق شہر کوفہ پر مضافات کا گماں ہو گا۔ نجف کے سامنے کوفہ کی حیثیت دریا کنارے آباد ایک چھوٹے سے قصبے سے زیادہ نہیں رہے گی۔ یاد رہے، اس شہر، یعنی کوفہ کی اہمیت بھی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ مثال کے طور پر جدید دور کے عراق میں مشہور 'لشکر مہدی' کے سربراہ مقتدہ الصدر اور ان سے پہلے جتنے بھی ان کی ہی طرح کے کردار گزرے ہیں، وہ بجائے نجف، کوفہ کی مرکزی مسجد کے منبر پر اپنا مقام بنائیں گے۔ مقصد یہ ہو گا کہ وہ مقتول علی نہیں بلکہ زندہ امام کے قدموں کے نشان پر کھڑے نظر آیا کریں۔ اسی جگہ پر کھڑے ہو کر خطبات دیں جہاں کبھی علی کھڑے ہو کر خطبے اور تقاریر کیا کرتے تھے، درس دیتے تھے۔ علی کی قائم کردہ مثال کی روشنی میں مقتدہ بھی جلد ہی دبے اور ستائے ہوئے لوگوں کے چیمپئن کی طرح مشہور ہو جائیں گے۔

نجف عراق میں واقع جڑواں مقدس شہروں میں پہلا شہر ہے۔ علی کے بعد معاویہ پوری اسلامی سلطنت کی باگ ڈور بغیر کسی مزاحمت، بلا شرکت غیرے سنبھال لیں گے۔ دوسرا مقدس شہر ابھی آباد نہیں ہوا۔ یہ شہر نہیں بلکہ نجف سے پچاس میل دور شمال میں واقع، گمنام پتھریلا اور ریتلا علاقہ ہے۔ علی کے قتل کے بیس سال بعد ان کے چھوٹے فرزند حسین علیہ السلام اس ریت ملے پتھریلے علاقے میں اپنی جان سے جائیں گے۔ پھیلے ہوئے ریتلے صحرا کو کربلا کا نام دیا جائے گا، تاریخ میں اسے 'آزمائش اور مصیبت' یعنی 'کرب اور بلا' کی جگہ کہا جائے گا۔

حصہ سوم: حسین علیہ السلام

باب 12

9 ستمبر 680ء کو صبح کے وقت منہ اندھیرے میں مکہ سے ایک مختصر قافلہ برآمد ہوا۔ علی کے فرزند حسین علیہ السلام کی سربراہی میں نکلنے والے اس قافلے کا رخ عراق کی جانب تھا۔ بیس سال قبل ان دونوں بھائیوں، حسن اور حسین علیہ السلام نے علی کو عراق میں ہی کوفہ کے مضافات میں واقع ایک ریتلے ٹیلے پر دفنا کر شمالی عرب کے لق ودق صحرا میں سے ہوتے ہوئے واپس حجاز کی راہ لی تھی۔ تب ان دونوں کے حوصلے پست تھے اور یہ تقریباً ناامید ہو چکے تھے۔ حسین علیہ السلام نے یہ طویل عرصہ ناقابل برداشت حد تک اپنی آنکھوں کے سامنے معاویہ کو سلطنت اسلامی پر گرفت مضبوط کرتے اور نہایت اطمینان سے حکمرانی کرتے ہوئے دیکھ کر گزارا تھا۔ ان کے لیے ان دو دہائیوں میں صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اب مزید تحمل کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ مگر اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔ معاویہ انتقال کر گئے تھے اور حسین علیہ السلام کا ارادہ خلافت کو ان کے تئیں اصل مقام، یعنی اہل بیت کو واپس لوٹانا تھا۔

وہ انقسام جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا اور بعد ازاں اس کا شگاف اس قدر پھیل گیا کہ علی کو بھی لے ڈوبا۔ اب یہ پھوٹ تیسری نسل کو منتقل ہو چکی تھی۔ یہاں پہنچ کر پہلی بار واقعی احساس ہوتا تھا کہ دیکھو، کیا سے کیا ہو گیا؟ لوگ کتنے بے حس ہو چکے ہیں اور ان کے دل پتھر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب وقت آئے گا کہ انہیں کوئی ایک دم جھنجھوڑ کر رکھ دے گا اور احساس دلائے گا کہ معاملات کس قدر خراب

ہو چکے ہیں۔ یوں ہو گا کہ اس قدر گہرا گھاؤ لگے گا کہ آنے والی صدیوں میں اسلام کے جسم کی ہر ایک پور سے خون رسے گا اور یہ زخم کسی طور بھی بھر نہیں سکے گا۔ بلکہ روز بروز گہرا ہی ہوتا چلا جائے گا۔ لمحوں کی اس قدر افسوسناک خطا ہو گی کہ اس کا خمیازہ صدیوں تک مسلمانوں کے بچے بچے کو اپنی پوری زندگی بٹ کر جینے کی قیمت سے ادا کرنی پڑے گی۔ یہ پھوٹ، پھٹ کرامت کے ہر تصور کو ریزہ ریزہ کر دے گی اور زمانوں تک یہ عمل جاری رہے گا۔ یہ آج بھی بدستور جاری ہے، تقریباً ساڑھے چودہ سو برس بعد بھی یہ ناسور اسی طرح تازہ ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔

حسین علیہ السلام اپنی عمر میں اب پچاس کے پیٹے میں تھے اور ان کی شکل وصورت سے ان پچاس برسوں کا بوجھ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ اس عمر تک پہنچ کر یقیناً ان کی داڑھی میں چاندی اتر آئی ہو گی، آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے پر جھریاں ہوں گی۔ لیکن آج ایران اور عراق کے بازاروں میں باآسانی دستیاب پوسٹروں میں دکھائی گئی شبیہ میں وہ ایک بیس بائیس برس کا خوبرو نوجوان نظر آتے ہیں۔ ان تصویروں میں ان کی لانبی زلفیں ہیں جو شانوں پر ڈھلکی رہتی ہیں۔ داڑھی گھنی اور سیاہ کالی ہوتی ہے۔ روشن پیشانی، چہرے پر جوانی کے رنگ بکھرے اور کالی آنکھوں میں جھانکیں تو نرمی کے ساتھ ساتھ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا احساس ہوتا ہے۔ آنکھوں میں اداسی چھائی ہے لیکن پھر بھی وہ پر اعتماد نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے دنیا بھر کی خوشیاں اور غم ایک ساتھ ان کے چہرے میں بھر گئے ہیں اور حسین علیہ السلام دکھ اور سکھ کو ایک ہی جیسے قبول کیے، ان دونوں حالتوں کو ایک ہی جیسے خود سے لپٹائے ہوئے ہیں۔

مغربی ممالک میں اگر کوئی انجانا شخص ان پوسٹروں کو دیکھے تو اسے ان تصاویر پر عیسیٰ کی شبیہ کا گماں ہو گا، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ملنے والے پوسٹروں میں حسین علیہ السلام کو قدرے صحت مند دکھایا گیا ہے۔ ویسے بھی، ان دونوں یعنی عیسیٰ اور حسین علیہ السلام میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ جیسے اگر علی شیعہ اسلام کی بنیاد ہیں تو حسین علیہ السلام اس میں قربانی کی علامت بن جائیں گے۔ عراق پہنچنے پر ان کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا، وہ شیعت علی کا ولولہ انگیز نوشہ، کسی الہامی کتاب کا اقتباس بن جائے گا۔ ان کی کہانی شیعہ اسلام کے جذباتی اور روحانی قالب میں ڈھل جائے گی۔

فی الوقت تو یہ ہے کہ جب حسین علیہ السلام کا قافلہ حجاز کی پہاڑیوں سے نکل کر صحرا میں داخل ہوا تو دور سے دیکھنے پر کوئی بھی غیر جانبدار شخص دیکھ کر یہی کہہ سکتا تھا کہ وہ بالضرور ہی اپنے مقصد میں ناکام ہوں گے۔ اگر ان کا مقصد خلافت کا دوبارہ حصول تھا تو یہ چھوٹا سا قافلہ اس کے لیے قابل رحم حد تک ناکافی تھا۔ اونٹوں کی قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ان اونٹوں پر حسین علیہ السلام کے گھرانے کی عورتیں اور بچے سوار تھے جبکہ حفاظت کے لیے صرف بہتر مسلح جنگجو ہمراہ تھے۔ اونٹوں کے علاوہ چند گھوڑے بھی تھے جو اونٹوں کی ہی مہاروں سے بندھے، اونٹوں کی ہی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس قلیل شمار کے باوجود، یہ قافلہ انتہائی اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دفعہ وہ عراق پہنچ جائیں تو کوفہ کے لوگ حسین علیہ السلام کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے۔

حسین علیہ السلام کا یہ اعتماد اور یقین بلاوجہ نہیں تھا۔ یہ سفر شروع ہونے سے پہلے تک کچھ ایسے ہی اشارے ملے تھے کہ عراقی عوام واقعی بیتابی سے ان کی راہ دیکھ رہی ہے۔ معاویہ کی وفات کے بعد جب سے یزید نے دمشق میں خلافت کا تخت سنبھالا تھا، چند ہفتوں کے اس عرصے میں مکہ اور کوفہ کے بیچ کئی خطوط کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ کوفہ اور مکہ کے بیچ آٹھ سو میل کا فاصلہ ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اس قلیل عرصے میں بھی اتنے خط آئے تھے کہ گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکائے جانے والے دو سفری تھیلے باآسانی بھر جاتے۔ یہ سارے خطوط کوفہ میں شیعت علی کی جانب سے لکھے گئے تھے، حسین علیہ السلام کے خیر خواہوں نے بھجوائے تھے۔

'جلدی پہنچو، اے حسین علیہ السلام!' خط لکھنے والوں نے اصرار کیا تھا، 'لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ تمہارے سوا کسی کے بارے نہیں سوچتے۔ آؤ اور اپنا جائز حق حاصل کرو، پیغمبر کے اصل جانشین کی نشست سنبھالو۔ تم پیغمبر کے نواسے ہو، ان کا خون ہو۔ تم اپنی ماں فاطمہ کے بیٹے ہو جو پیغمبر کی بیٹی تھیں۔ فوراً پہنچو اور قیادت کو واپس وہیں پہنچا دو جہاں اس کا حق ہے۔ عراقیوں کو وہ عزت اور منزلت واپس لے کر دو جو علی نے دلائی تھی۔ تم علی کے بیٹے ہو۔ ہم تمہارے جھنڈے تلے جمع ہو کر شامیوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ ہم اسلام کی اصل روح واپس لے کر آئیں گے!'

ان سب خطوط میں اہمیت کا حامل وہ رقعہ تھا جو حسین علیہ السلام کے چچازاد مسلم نے لکھا تھا۔ مسلم کو حسین

علیہ السلام نے ہی عراق بھیجا تھا تاکہ وہ جائیں اور عراقیوں کی جانب سے کی جانے والی گزارشات بارے تحقیق کریں۔ یہ معلوم کریں کہ کیا وہ واقعی حسین علیہ السلام کی رہنمائی کے خواہشمند ہیں؟ 'میرے ساتھ بارہ ہزار مسلح افراد ہیں جو آپ کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہیں' مسلم نے لکھا تھا، 'فوراً پہنچیں۔ فوراً پہنچیں اور اس لشکر کی سپہ سالاری سنبھالیں جو آپ کے لیے جمع ہوا ہے'۔

یہ وہ بلاوا تھا جس کے لیے حسین علیہ السلام نے انیس برس کا کڑا انتظار کیا تھا۔ جب سے عراق میں علی کا قتل ہوا تھا، تب سے ان کے کان یہ پکار سننے کے لیے ترس گئے تھے۔

جس دن علی کا قتل ہوا، اس دن کا احوال بھی تفصیل سے سن لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صبح صرف علی کو ہی حملے کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ کئی روایات ایسی ہیں جن کے مطابق خوارج نے مصر میں عمرو اور شام میں معاویہ کو بھی قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ لیکن عمرو بیماری کے سبب مسجد نہیں جا سکے تھے۔ انہیں معدے میں خرابی کی شکایت تھی۔ چنانچہ، اس روز صبح حملہ آور نے گورنر کے چوغے میں ملبوس جس آدمی پر دھاوا بولا تھا، وہ گورنر نہیں بلکہ گورنر کا ماتحت تھا۔ دوسری طرف شام میں، اگرچہ قاتل کے ہاتھ معاویہ تک پہنچ گئے تھے مگر اس حملے میں انہیں صرف معمولی زخم آئے تھے۔ اسلامی سلطنت کے جلد ہی بلا شرکت غیرے حکمران بننے والے معاویہ، بس عارضی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔

کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس ضمن میں فوراً ہی نکتہ چینی شروع کر دی اور سوال اٹھایا کہ کس طرح اتنی آسانی سے ان تینوں میں سے چن کر صرف علی ہی قتل ہوئے؟ یہی نہیں، ان کی موت تلوار کے وار سے نہیں بلکہ معاویہ کے پسندیدہ ہتھیار، زہر سے ہوئی تھی؟ ایسے لوگوں کو جلد ہی انتہائی سرعت اور ماہرانہ طریقوں سے خاموش کرا دیا گیا یا کر دیا گیا۔

علی کے قتل بارے ایک کہانی اور بھی مشہور ہوئی۔ کہا جاتا تھا کہ قاتل نے یہ فعل اپنی محبت کے لیے کیا۔ یعنی یہ کہ وہ ایک ایسی عورت کا ساتھ چاہتا تھا جس کا باپ اور بھائی خوارج میں سے تھے اور نہروان کے مقام پر جنگ میں ہلاک کر دیے گئے تھے۔ 'میں تم سے اس وقت تک بیاہ نہیں کروں گی جب تک کہ تم مجھے

وہ نہ دلادو، جس کی مجھے چاہ ہے '، قصے میں اس عورت کی زبانی کہا جاتا، 'مجھے تین ہزار درہم، ایک غلام، ناچنے اور گانے والی ایک لڑکی اور ابو طالب کے بیٹے علی کی موت چاہیے'۔ اس فہرست میں ناچنے اور گانے والی لڑکی 'کا مطالبہ دیکھیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ من گھڑت کہانی ہے۔ وہیں، حملہ صرف علی پر ہی تو نہیں ہوا تھا؟ جن اشخاص نے مبینہ طور پر معاویہ اور عمرو پر حملہ کیا تھا، ان کے بارے تو ایسے قصے مشہور ہوئے اور نہ ہی ان کا تذکرہ کسی روایت میں ملتا ہے۔ بلکہ صاف کہنا چاہیے کہ یہ من گھڑت قصہ ہے۔ چلو، علی کے قاتل کا مسئلہ تو محبت تھا، باقی دو حملہ آوروں کا محرک کیا تھا؟ لیکن اس طرح کے قصے اور کہانیوں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا اور نہ ہی ان کی کوئی ضرورت تھی۔ معاویہ خلیفہ بن گئے تو اس کے بعد ان کی حکومت میں عام مسلمانوں کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ان کٹر اور کٹھ ملا خوارج کو اور صرف انہی کو علی کے قاتل گردانا کریں اور ان سے متعلق گھڑے ہوئے قصے اور کہانیوں پر یقین کر لیں۔

بہیمانہ قتل کا یہ ہے کہ اس میں مقتول کو فوراً ہی ہیرو بنا دیا جاتا ہے۔ ماضی کے سارے گناہ نہ صرف یہ کہ معاف کر دیے جاتے ہیں بلکہ جلد ہی لوگ ان کی فاش غلطیوں کو بھی بھلا دیتے ہیں۔ اس شخص کی کہی ہر بات کی ناگہانی نقصان کی روشنی میں از سر نو تشریح کی جاتی ہے اور وہ حکمت عملی، جس پر مقتول کو زندگی بھر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا، اب آگے کا واحد راستہ بن کر رہ جاتی ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کی سیاسی زندگی حسرت اور یاس کی عملی تصویر بن جاتی ہے اور وہ اسی گھن چکر میں پھنس کر رہ جاتے ہیں کہ کاش، اے کاش! اگر یہ شخص قتل نہ کر دیا جاتا تو نہ جانے انہیں کیسی بھلی زندگی گزارنے کو ملتی؟ کتنے ہی معاملات ایسے ہیں، جو اس شخص کی وجہ سے درست رہتے اور اگر قتل نہ ہوتا تو نہ جانے وہ ان کی مشکلات کی کیسی بھلی ترکیبیں نکال لاتا؟ عوام کی یہ روش ساتویں صدی کوفہ میں بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ آج دنیا بھر میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں۔ جس تلوار سے علی کی زندگی کا چراغ گل ہوا، اسی تلوار نے ان کے بارے سارے شبہات کو ہوا کر دیا۔ وہی عراقی جو علی کی زندگی میں بقول انہی کے، ان کے لیے 'کمتری کا باعث' بن چکے تھے، اب یہی عراقی علی کو موت کے بعد علی کو قطعی اور مطلق مقتدر، اعلیٰ اور بالا دست بنا لیں گے۔ وہ ان کی حاکمیت کا یوں پرچار کریں گے کہ بسا اوقات محمد ﷺ اور علی رتبے اور حیثیت میں مساوی نظر آیا کریں گے۔

تلوار چلانے والا خوارج میں سے ہی ایک ہو گا مگر کوفہ والے پھر بھی غم و غصے میں لپٹے کھا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر اس بات پر پیچ و تاب کھانے لگے کہ ممکنہ طور پر اس قتل کے پیچھے معاویہ کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ عمومی رائے یہ بن گئی کہ علی سچ ہی کہتے تھے۔ عراقی اس سے پہلے جس کام سے وہ بے حسی کی حد تک انکار کرتے آئے تھے، علی کے حکم سے پیچھے ہٹ گئے تھے، وہ انتہائی ضروری تھی۔ یعنی، معاویہ کے خلاف کھلم کھلا جنگ لازم تھی۔

چنانچہ وہ علی کی تدفین کے فوراً بعد مسجد میں جمع ہو گئے اور ان کے فرزند حسن جو طبیعت میں عالم واقع ہوئے تھے، ان کے ہاتھ پر بیعت کے لیے تیاریاں کرنے لگے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ وہ عراقیوں کی رہنمائی سنبھال لیں اور شام کے خلاف باقاعدہ فوجی مہم کا آغاز کریں۔ باوجود اس کے کہ حسن کے گرد ہر شخص ہی جوش اور جذبے سے پاگل ہو رہا تھا، خود حسن پر اس سب کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ وہ حقیقت پسند ہی رہے۔ گو انہوں نے کوفہ کے لوگوں کی وفاداری قبول تو کر لی مگر وہ اسے عزت اور منزلت کی بجائے بوجھ سمجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا، بلکہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ شامی افواج اچھی خاصی منظم اور تربیت یافتہ تھیں اور عراقیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مسلح تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ خیال کہ خانہ جنگی جاری رہے گی اور وہ اس ہولناک جنگ جو ختم ہونے میں نہیں آتی، اور وہ اس میں آخر میں صرف ایک پرزہ بن کر رہ جائیں گے، اس خیال سے ہی گھن آتی تھی۔

اس کے علاوہ انہیں رہ رہ کر علی کی آخری بات یاد آ رہی تھی۔ زہر کے ہاتھوں مرتے ہوئے انہوں نے دونوں بیٹوں کو تفصیل سے وصیت کی تھی۔ اس وصیت کا لب لباب یہ تھا کہ، 'اس دنیا کے پیچھے ہر گز مت لگنا خواہ دنیا تم سے بغاوت ہی کیوں نہ کر دے۔ اگر تم سے کوئی چیز چھن جائے تو اس پر رنجور مت ہو۔ اتحاد اور یگانگت کو فروغ دو اور نیکی سے کام لو۔ فتنہ سے دور رہنا اور کبھی جھگڑے اور نفاق میں مت پڑیو'۔ آخر میں قران کی آیات سنائی تھیں، 'اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور تفرقے میں مت پڑو' اور کسی شخص کی تہمت اور الزام تراشی کی بجائے 'خدا سے ڈرتے رہنا'۔

دونوں بیٹے باپ کے تابعدار تھے، ان کی خوب مانتے تھے۔ لیکن حسن علی کو اپنی ہی تعلیمات سے ہٹ

جانے پر قصور وار سمجھتے تھے۔ مثلاً، علی تفرقے سے سخت نفرت کرتے تھے مگر اس کے باوجود خود کو اس خانہ جنگی میں گھسیٹتے چلے گئے؟ یہی نہیں، انہوں نے اس سے بچنے کی سرے سے کوشش بھی نہیں کی؟ حسن انہیں اس بات پر کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عثمان کو خاصا پسند کرتے تھے جو بھلے حکمرانی میں اپنی ہی کرتے تھے مگر ایمان کی بات آئی تو انہوں نے آخر تک اس پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ خانہ جنگی سے انکار کرتے رہے اور بالآخر قتل بھی ہو گئے۔ حسن کو تیسرے خلیفہ کے یوں بزرگی کی عمر میں اس طرح بے دردی سے قتل کیے جانے کا سخت رنج تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی گاہے بگاہے اپنے والد کو یوں عثمان کے قاتلوں کو معافی اور امان دینے پر دبے لفظوں میں تنقید کا نشانہ بناتے رہے تھے اور اس کے بعد شروع ہونے والی خون ریزی اور دہشت پر تو سخت ناراض تھے۔ اب جب کہ علی بھی اس نفاق کی بھینٹ چڑھ گئے تو حسن کے لیے جنگ آخری حربہ ہوتا۔ وہ کسی بھی طرح سے یہ جنگ جاری نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ معاویہ کو حسن کی طبیعت کا خوب علم تھا اور ان کے جاسوس، ان کے ان خیالات کی پوری خبر رکھتے تھے۔

معاویہ چونکہ سیاست میں خوب ماہر تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قلم، تلوار کی ہی طرح کارگر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حسن کے نام چند خط لکھے۔ ان مراسلوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بندہ عش عش کر اٹھتا ہے۔ ایک ایک لفظ میں چاشنی بھری گئی ہے اور جیسا کہ ان معاملات میں انتہائی ضروری ہوتا ہے، خیالات کا کھل کر اظہار عام ملتا ہے اور دلائل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ دلائل انتہائی معقول ہیں۔ مثال کے طور پر، معاویہ نے کھلے دل کے ساتھ حسن کی روحانی قابلیت اور علامہ طبیعت اور مرتبے کا اعتراف کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر صرف روحانیت ہی واحد پیمانہ ہو تو بلاشبہ حسن کے علاوہ دوسرا کوئی بھی شخص خلافت کا حقدار نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ ان حالات میں خود ان کے علاوہ کوئی دوسرا اہل بھی نہیں ہے۔ اپنے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ اب وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں انہیں اس دھوکے باز دنیا کے طریق کی اچھی سمجھ ہے اور خلافت سے متعلق دنیاوی معاملات چلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح ان خطوط میں خلافت کو درپیش مسائل بارے انتہائی مدلل انداز میں حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جیسے سرحدوں کی حفاظت، خوارج کی بڑھتی ہوئی یورش اور خلافت کی سالمیت اور دین اسلام کی حفاظت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ حسن کی دین سے متعلق علوم پر گرفت اور روحانیت پسندی سے خاصے

متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن پیغمبر خدا کے نواسے ہیں، انہیں اس بات کا پورا احساس ہے اور وہ اس وجہ سے بھی ان کی دل سے عزت کرتے ہیں لیکن خلافت کو جو مسائل درپیش ہیں، اس کے لیے اس وقت ایک انتہائی مضبوط اور اعصابی طور پر ناقابل شکست حکمران کی ضرورت ہے۔ معاویہ اپنے ان خطوط کو آخر میں یوں سمیٹتے ہیں کہ اس وقت امت کو ایک عالم اور فہیم کردار کی نہیں بلکہ ایک انتہائی تجربہ کار اور منجھے ہوئے حکمران کی ضرورت ہے۔

ایک بات اور، ان خطوط میں دلیل کے ساتھ معاویہ اپنا جانا پہچانا حربہ، یعنی 'شہد میں تولنا' نہیں بھولے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگر حسن خلافت کے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور معاویہ کو بطور خلیفہ تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ ان کو قربانی کے بدلے میں محدود اور طویل مدت، دونوں ہی صورتوں میں ہر قدم پر بھرپور ساتھ اور معقول اخراجات زندگی اور ہرجانہ ادا کرنے کا یقین دلاتے ہیں۔ انہیں عراق کے خزانے سے بھاری مال غنیمت عطا کیا جائے گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ وہ یعنی معاویہ اپنے وقت آخر پر، حسن کو جانشین یعنی اگلا خلیفہ مقرر کر جائیں گے۔

حسن معاویہ کی جانب سے اس خیر سگالی کی طرف فوراً ہی راغب ہو گئے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ ان کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف وہی نہیں بلکہ سب مسلمان ایک عرصے سے امن کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی امن کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ تسلی کے ساتھ مطالعے اور عبادت میں مشغول رہ کر بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ ان کے حمایتی کس طرح کے لوگ ہیں۔ وقت آنے پر وہ اسی طرح پلٹا کھا سکتے تھے جیسا کہ اس سے پہلے علی کے ساتھ کر چکے ہیں۔ وہ اپنے والد کو عراقیوں کے ہاتھ پہلے اٹھان اور پھر انتہائی قلیل عرصے میں برباد ہوتے اور ہر موڑ پر دشوار گزار حالات سے دوچار ہوتا دیکھ چکے تھے۔ اگرچہ عراقی فی الوقت تو جذبات میں بہہ کر علی کو اپنا قبلہ بنا چکے ہیں مگر ان کا کیا بھروسا ہے؟ وہ کسی بھی وقت پینترا بدل سکتے ہیں۔ جتنی جلدی وہ علی کے نام پر جمع ہو گئے تھے، اتنی ہی تیزی سے اپنی روش بدل بھی سکتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے خوارج نے علی کے ساتھ یہی سلوک نہیں کیا؟ خوارج کون تھے؟ یہی لوگ نہیں تھے؟ قصہ مختصر، حسن نے اچھی طرح سوچ

سمجھ کر معاویہ کے دلائل مان کر ان کی تجویز کو قبول کر لیا مگر حسن کے اس فیصلے پر مہر عراقی ثبت کریں گے۔

کوفہ کے لوگ مسجد میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید حسن نے انہیں شام پر ایک خونخوار جنگ مسلط کرنے کے اعلان کے لیے بلایا تھا۔ مگر حسن اپنے والد کی طرح القائی خطیب نہیں تھے۔ انہوں نے بجھے ہوئے انداز میں، ایک انتہائی معتدل بیانیے پر مشتمل، سپاٹ تقریر کر ڈالی۔ وہ دھیمی آواز میں، ایک ہی لہجہ اختیار کیے، ہر لفظ کو ایک ہی جیسے تول میں بولتے گئے۔ اگرچہ وہ متانت برتتے ہوئے انتہائی سنجیدہ طریقے سے مخاطب تھے مگر تقریر میں جوش اور نہ ہی جان تھی۔ ایسا ہونا قدرتی بھی تھا کیونکہ وہ منبر پر چڑھ کر کھڑے لوگوں کی خواہشات نہیں بلکہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ چیز سمجھانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے جس پر خود ان کو یقین تھا۔ انہوں نے لوگوں کو جہاد اکبر کی طرف بلایا، یعنی زندگی بھر اپنے اندر بہتر مسلمان بننے کی جدوجہد جاری رکھنے پر زور دیا۔ پھر انہوں نے جہاد اصغر یعنی مسلح جدوجہد کو بھی ضروری قرار دیا مگر تقویٰ اختیار کرتے ہوئے، اپنے آپ کو بہتر بنانے کو افضل گردانا۔ پھر کہا کہ اگر کوفہ کے لوگ جنگ وجدل سے منہ موڑنے کو شرمناک تصور کرتے ہیں تو وہ یہ مت بھولیں کہ، 'دنیا میں شرمندگی، خجالت اور ندامت، آخرت میں جہنم کی آگ سے کہیں بہتر ہے'۔ آخر میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ معاویہ کے ساتھ جنگ نہیں بلکہ امن قائم کرنے کو ترجیح دیں گے اور ماضی میں جتنی بھی خون ریزی ہوئی، وہ امن کے لیے بخوشی عفو عام اور درگزر پر راضی ہو جائیں گے۔

یہ بلاشبہ دلیری کا مظاہرہ تھا۔ درپیش حالات میں یہ الفاظ بہادری اور جرات کا مظہر تھے لیکن لوگوں نے فوراً ہی اسے بزدلی، نامردی اور بودے پن سے تعبیر کر دیا۔ 'یہ تو پریشان ہے'، 'گھبرا کیوں رہا ہے؟'، 'ارے، تم تذبذب کا شکار کیوں ہو؟' لوگ چلانے لگے۔ جنگجو دھاڑنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے، 'حسن کو دیکھو! اس کا ارادہ تو ہتھیار ڈالنے کا ہے۔ ہمیں ہر صورت اسے روکنا ہو گا'۔ یوں وہ شخص جو امن کا خواہاں تھا، مزید تشدد اور قتل وغارت سے بچنا چاہتا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں اسی قباحت کا نشانہ بن گیا۔ حسن کے اپنے ہی آدمی ان پر بل پڑے اور خودسری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے کھینچ تان کرنے

لگے۔ گھسیٹ کر منبر سے اتار لائے اور چوغہ اتار کر تار تار کر دیا اور کپڑے بھی پھاڑ دیے۔ اب جس کا ہاتھ پہنچتا تھا، انہیں ہراساں کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات اتنی بڑھی کہ اچانک ہی کہیں سے ایک خنجر برآمد ہوا۔ یہ تو پتہ نہیں چلا کہ خنجر کس نے نکالا مگر اس کی تیز دھار حسن کی ران کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی۔ یہ کاری زخم نہیں تھا مگر خون کا فوارا چھوٹ گیا۔ شاید، اس دن خون پھوٹنے کی وجہ سے ہی حسن کی جان بھی بچ گئی۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرے، بہتے ہوئے خون کا منظر دیکھ کر لوگ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ جو سرکشی پر اتر آئے تھے، ایک دم جیسے انہیں ہوش آگیا، جنون ہوا ہو گیا۔ انہیں خیال آیا کہ جوش میں نہ جانے وہ کیا کر گزرتے؟ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ ایک اور مقدس ہستی کے قتل کے کتنے قریب پہنچ چکے تھے؟

اگر اس سے پہلے حسن کے ذہن میں آگے کے لائحہ عمل، اپنے فیصلے پر کوئی شک اور شبہ رہا بھی تھا تو اس دھاچوکڑی کے بعد جاتا رہا۔ اگر وہ چاہتے بھی تو کسی صورت ایسے لشکر کی سپہ سالاری قبول نہیں کر سکتے تھے جو یوں، ایک دم ہی، بغیر سوچے سمجھے اپنے ہی رہنما کی شدید مخالفت پر اتر سکتے تھے۔ خلافت سے دستبرداری ہی آگے کا واحد راستہ تھا اور معاویہ کی تجاویز بھی معقول تھیں۔ ویسے بھی، انہوں نے حسن کو آج نہ سہی، آگے چل کر خلافت سونپنے کا یقین دلایا تھا۔ حسن نے اپنے تئیں یہ ضرور سوچا ہو گا کہ اگر ان کے والد، یعنی علی اگر خلافت کے لیے تین ادوار پر مشتمل کئی برسوں پر محیط عرصے تک انتظار کر سکتے ہیں، امن اور یگانگت کے لیے قربانی دے سکتے ہیں تو وہ بھی انہی کے نقش قدم پر چل کر چند برس، صرف ایک دور کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے؟

حسین علیہ السلام نے حسن کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ 'میں تم سے التجا کرتا ہوں، معاویہ کی بجائے علی کے الفاظ پر دھیان دو۔ علی کی بات مانو!'۔ یعنی یہ کہ ان کے خیال میں معاویہ چال چل رہے تھے اور دھوکہ دہی سے باز نہیں آئیں گے۔ ان کا طریقہ واردات، ڈھنگ ہی یہی ہے۔ حسین علیہ السلام نے طویل بحث کی کہ انہیں اس شخص سے اچھائی کی قطعاً کوئی امید نہیں اور بھلے وہ کتنے ہی وعدے کر لے، بھروسا مند نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، چھوٹے بھائی کی بڑے کے سامنے کم ہی چلتی ہے۔ ویسے بھی حسن ٹانگ پر زخم کھا کر پہلے ہی اپنے فیصلے پر قائل ہو چکے تھے۔

حسن لنگڑا کر چلتے ہوئے دوبارہ منبر کی سیڑھیاں چڑھے تاکہ کوفہ کے لوگوں سے آخری بار مخاطب ہو سکیں۔ 'اے عراق کے لوگو! تم نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے، میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ مجھ سے وفا داری کا وعدہ کیا ہے اور قسم اٹھائی ہے کہ جو میرا دوست ہے، وہ تمہارا بھی دوست ہو گا'، انہوں نے یہاں توقف کیا۔ پھر آواز مجتمع کر کے ایک دفعہ پھر اسی وعدہ پر قائم رہنے کا مطالبہ کیا۔ مزید گویا ہوئے، 'میں نے یہ درست سمجھا کہ معاویہ کے ساتھ امن قائم کیا جائے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ ان کی حیثیت تسلیم کر لی جائے کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر وہ چیز جو کسی انسان کے خون کو بہنے سے روک سکتی ہے، ہر اس شے سے بہتر ہے جو خون بہانے کا سبب بن جائے'۔

حسن نے تقریر ختم کی تو چاروں طرف خاموشی تھی۔ ٹک خاموشی، جیسے لوگوں کو ان کے اندر بھی چپ لگ گئی ہے۔ اسی سماں میں حسن منبر سے اترے اور لوگوں کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے مسجد سے باہر نکل گئے اور سب انہیں جاتا، ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ حسن نے اپنے بھائی حسین علیہ السلام کو فوراً ہی تیاریاں مکمل کرنے کا حکم دیا اور فوراً مدینہ کی طرف کوچ کا فیصلہ کیا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جس قدر تیزی سے ممکن ہو سکے، وہ چلے جائیں۔ کوفہ سے جتنی جلدی رخصت مل جائے، وہ اس پر خدا کے شکر گزار ہوں گے۔

ان حالات میں آخر حسن کو کون الزام دے سکتا تھا؟ شیعہ انہیں اس فیصلے پر ہر گز قصور وار نہیں سمجھتے۔ شیعہ اسلام میں وہ دوسرے امام مانے جاتے ہیں۔ علی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جائز وارث اور جانشین ہیں۔ انہوں نے ایک سلطنت کی حکمرانی ٹھکرا دی تھی۔ اقتدار تو خیر آنی جانی چیز ہے، لوگ کہیں گے کہ انہوں نے ایسا کر کے رہتی دنیا تک سر پر روحانی بالادستی کا تاج سجا لیا۔ تقریباً سبھی مسلمانوں کا ماننا ہے کہ حسن نے اپنا ایمان دنیاوی آلائشوں اور عارضی طاقت میں نہیں بلکہ روحانیت اور آخرت کی ابدی زندگی میں رکھ دیا۔ کئی نکتہ چین بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان کے اس فیصلے میں بہر حال عراق کے خزانے سے ملنے والے بھاری مال و دولت کا بھی ہاتھ تھا۔

یہ تو معلوم نہیں کہ حسن کو خزانے سے کتنی مقدار میں مال و دولت حوالے کی گئی۔ ویسے بھی ایسی

صورتحال میں، ان معاملات کا کبھی پتہ نہیں چلتا۔ کچھ لوگوں نے روایت کی ہے کہ یہ پچاس لاکھ چاندی کے درہم تھے، یعنی اس زمانے میں مدینہ جیسے شہر میں ایک متمول اور طویل زندگی گزارنے کے لیے کافی تھے۔ اس معاہدے کی دوسری شق بارے ہم دیکھیں گے کہ آگے چل کر حسن اس دولت کے بل بوتے پر خوشحال اور لمبی زندگی گزارنے کے لیے تادیر زندہ نہیں رہیں گے۔ معاویہ کے متعلق حسین علیہ السلام کا شبہ بھی درست ثابت ہوگا۔

معاویہ اب آشکارا پانچویں خلیفہ تھے۔ وہ انتہائی شان اور ٹھسے سے کوفہ میں داخل ہوئے اور خوب دھوم دھڑکا کیا گیا۔ انہوں نے کوفہ کے لوگوں کو ان کے ہاتھ پر بطور خلیفہ بیعت کرنے کے لیے تین دن کا وقت دیا اور انحراف کی صورت انجام سے متعلق متنبہ کرنے یا اس کی مثال قائم کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پورے شہر نے پہلے ہی دن وفاداری کا اعلان کر دیا اور جوق در جوق قطاروں میں لگ کر روایتی انداز میں بیعت کی۔ شہر کا ماحول دیکھنے لائق تھا، چاروں طرف جوش و خروش اور ولولہ تھا۔

اگرچہ عراقیوں کے دل معاویہ کے ساتھ نہیں تھے مگر ان کے مفادات بالضرور ہی ان سے جڑے تھے۔ کوئی انہیں اس روش، ان کی متلون مزاجی اور ڈھل مل پر لعن طعن کرتا ہے تو کئی ایسے بھی ہیں جن کے خیال میں کوفہ کے لوگ عملی اور حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ ویسے بھی، عراقی کافی عرصے سے معاویہ جیسے ہی کسی 'مرد آہن' کی تلاش میں تھے۔ علی ساری عمر اتحاد اور امت میں یگانگت کی صرف بات کرتے رہے مگر معاویہ دراصل وہ شخص تھے، جو ان کے لیے یہ مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ جیسا کہ علی کا ماننا تھا، معاویہ یہ انتہائی مشکل کام ایمان اور اصولوں کی تحت نہیں بلکہ زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، انتہائی عملی طریقے سے سرانجام دیں گے۔

پانچ سال کی طویل اور خون ریز خانہ جنگی کے بعد اب بالآخر امن اور قانون کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ وہ سلطنت جو ماضی قریب میں تقریباً تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی، اب ایک دفعہ پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہونے لگی۔ ایک طرح سے کہیے، فتنے سے چھٹکارا حاصل ہو گیا تھا، ریاست کو بچا لیا گیا تھا۔ معاویہ انیس برس تک حکمرانی کریں گے اور بالآخر جب انہیں موت آن لے گی تو وجوہات قدرتی ہوں گی، جو اپنے

آپ میں اس دور میں قائم امن اور خوشحالی کا اشاریہ کہلایا جاسکتا ہے۔ان کی موت پر ایک قصیدہ گو لکھے گا، 'عربوں کی تلوار اور تیر سے خدا نے بالآخر نفاق، نزاع اور جنگ وجدل کا خاتمہ کر دیا'۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب تو سبھی ان کے گن گاتے تھے، قصیدے لکھے گئے اور ان کی شان میں غنائی نظمیں تخلیق ہوئیں۔ کیوں نہ ہوتیں؟ انہوں نے پوری سلطنت میں امن قائم کیا تھا لیکن یاد رہے امن سے پہلے کے نفاق اور پھوٹ میں جو کردار معاویہ کا رہا ہے، اس کا تذکرہ زبان پر لانے کی کسی شاعر میں کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ شاعروں کو بھی کیا دوش دیا جائے، ان کے وہ کام قصیدہ اور سورمائی داستانوں میں ڈھل ہی نہیں سکتے تھے۔

کوفہ کا شہر بھی بالآخر اطاعت شعار ہو گیا تو وہ شخص جس کا قول یہ رہا ہے کہ، 'اسے کسی خوش نما جگہ پر پھوٹتے ہوئے تازہ پانی کے چشموں سے زیادہ کوئی چیز نہیں بھاتی۔۔۔'۔تب تو اشارہ دمشق کی طرف ہوا کرتا تھا مگر اب شام کے بعد عراق بھی ہاتھ تلے آتے ہی کم از کم سطحی طور پر ایسی ہی جگہ بن جائے گا۔ وہ خوش و خرم، انتہائی اطمینان سے اس پورے خطے پر تعیش اور تاشی کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ وہ طاقت کا استعمال کرنا جانتے تھے، انہیں نوازنے کا ہنر آتا تھا اور طیش بھی صرف حسیت اور ضرورت کے مطابق ہی دکھاتے تھے۔ایک طرح سے یہ جدید طرز حکومت کہلایا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ معاویہ نے دمشق میں عربی گھوڑوں اور اونٹوں کا ایک بڑا قافلہ داخل ہوتے دیکھا۔ اس قافلے کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں کاکیشیائی حسین علیہ السلام باندیاں بھی تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور اپنے حال پر طمانیت اور خلافت میں پھیلی خوشحالی کا سوچ کر کہنے لگے، 'اللہ ابو بکر کو غریق رحمت کرے، انہوں نے کبھی اس دنیا کی چاہ نہیں کی اور نہ ہی دنیا کو ان کی کبھی کوئی خاص ضرورت رہی۔ پھر دنیا نے عمر کی خواہش کی لیکن ان کا یہ تھا کہ وہ ساری زندگی دنیا سے دور بھاگتے رہے۔ان کے بعد عثمان آئے۔انہوں نے اس دنیا کو خوب استعمال کیا مگر یہ دنیا انہیں کھا گئی۔۔۔ لیکن میرا یہ ہے کہ میں اس دنیا میں بہت خوش پھرتا ہوں!'۔

معاویہ نے علی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ ان کا نام یوں گول کر گئے جیسے اس طرح انہیں تاریخ سے بھی مٹا دیں گے۔ لیکن وقت آئے گا، جب تاریخ ان کا نام یاد رکھے گی۔ معاویہ ایک مدبر سیاستدان کا دماغ رکھتے تھے جس نے علی جیسے روحانیت پسند کے مقابل بازی مار لی تھی۔ وہ پہلے ہی جانتے تھے کہ دنیاوی

معاملات میں علی جیسے شخص کی ایک نہیں چلے گی اور بالآخر جیت انہی کی ہونی تھی۔اس دنیا میں چالاکی ہی کام آتی ہے، صرف زیرک دماغ ہی چل پاتے ہیں۔جب ایسا ہوتا ہے تو ایک کو 'خاک اور خار' پر بسر کرنی پڑتی ہے مگر دوسرا 'حسین علیہ السلام باندیوں کی صحبت میں تازہ دم اصیل نسل کے گھوڑوں کی سواری' کا لطف اٹھاتا ہے۔

اگرچہ معاملات پوری طرح ہاتھ میں تھے مگر معاویہ کو خوب پتہ تھا کہ عراقی بہرحال مسئلہ بن سکتے ہیں۔انہوں نے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت تو کرلی تھی مگر معاویہ ان کے حلف اور وفاداری، یعنی زبانی کلامی عہد پر تکیہ نہیں کر سکتے تھے۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے علی کی اطاعت کا وعدہ کیا تھا اور پھر سرکشی پر اتر آئے تھے۔ حسن کو یقین دہانی کرائی تھی مگر وقت آنے پر ان کی درگت بنا ڈالی۔ معاویہ کو کسی بھی صورت عراقیوں سے کسی بھی طرح وفاداری کی امید نہیں تھی۔اگر وہ ایسا سوچتے تو بلا شک و شبہ ان کی اپنی بے وقوفی ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود یہ انتہائی ضروری تھا کہ ان لوگوں کے عہد و پیمان پر کسی نہ کسی طرح یقین کر کے انہیں اطاعت گزاری پر برقرار رکھا جائے۔ چونکہ انہیں یقین تو نہیں تھا اس لیے اطاعت حاصل کرنے کے لیے سخت اقدامات کی ضرورت تھی۔اس مقصد کے لیے انہیں کسی ایسے شخص کی خدمات درکار تھیں جو کوفہ کے لوگوں کو راہ راست پر رکھ سکے، سختی برت سکے اور کسی بھی بدمزہ صورتحال کو آہنی ہاتھوں سے کچلنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حسن کو کوفہ سے جاتا دیکھ کر یہاں کے لوگ ایک طرح سے خوش تھے۔ صرف لوگ ہی خوش نہیں تھے، حسن نے بھی جان چھوٹنے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ لیکن اب یہی لوگ، جلد ہی اپنی سوچ کہ شاید معاویہ کی صورت انہیں ناخدا مل گیا تھا، بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

معاویہ نے زیاد کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ زیاد ایک منجھے ہوئے جنگجو اور سپہ سالار مگر انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے۔انہیں کسی زمانے میں 'ابن ابی' بھی کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ابن ابی کا مطلب 'اپنے باپ کا بیٹا' ہے۔زیاد کے والد کی شناخت، بیک وقت متنازعہ اور تفریح کا سامان تھی۔لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ دراصل زیاد، معاویہ کے والد ابوسفیان کی ناجائز اولاد ہیں۔کچھ کہتے کہ ان کی ماں ابوسفیان کی باندی تھی، بعض نے زیاد کی ماں کو 'داشتہ' بھی کہا ہے۔سب سے بدتر، کچھ لوگ کہتے کہ وہ عیسائی تھی اور زیاد 'نیلی

آنکھوں والی ماں کا بیٹا' ہے۔ یہ افواہیں بہت پہلے کی بات ہے۔ اب کسی میں جرات نہیں تھی کہ زیاد کو یوں پکارا کرے یا ان کی پیٹھ کے پیچھے بھی اس طرح کے ٹھٹھے اڑا سکے۔ زیاد کا ایسے لوگوں سے نبٹنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ افواہیں پھیلانے والے کو پکڑ کر زندہ زمین میں گاڑ دیتے یا بوٹی بوٹی نوچ کر آگ میں جلا دیتے۔ زیاد اپنی بات واضح کرنے میں عجب رنگ رکھتے تھے۔ ان کا طریقہ انتہائی ظالمانہ اور قانون وغیرہ کے دائرے سے کہیں باہر ہوا کرتا تھا اور وہ رعایا کو کسی بھی طرح خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

'مجھے اپنے ہاتھ اور زبان سے محفوظ رکھنا' وہ گورنر کا منصب سنبھالنے کے بعد کوفہ کے لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، 'اور میں تمہیں اپنے ہاتھ اور تلوار سے محفوظ رکھوں گا۔ اللہ کی قسم! مجھے تم لوگوں میں کئی ایسے نظر آتے ہیں جو میرے غضب کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ تو کان کھول کر سن لو، اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو کوشش کرو، تمہارا نام ان لوگوں میں نہ آنے پائے'۔

پہلے پہل تو کوفہ کے لوگوں نے زیاد کی خوب عزت کی، وہ لحاظ کرتے اور ڈر کے مارے دب کر رہتے۔ علی کے دور میں پھیلی ہوئی انارکی اور خانہ جنگی کے بعد کم از کم زیاد نے عوام کو تحفظ دلا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے یہ امن زبردستی قائم کر رکھا تھا۔ 'وہ حکم دیتے اور لوگ ان کی اطاعت اور تابعداری پر مجبور ہو جاتے' ایک کوفی نے بعد میں اس دور کو یاد کرتے ہوئے بتایا، 'اگر کسی مرد یا عورت سے راہ چلتے کوئی چیز گر جاتی تو کسی میں اتنی جرات نہیں ہوتی تھی کہ اس شے کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ یہ وہیں زمین پر پڑی رہتی، تا آنکہ اس چیز کا مالک واپس آ کر خود نہ اٹھا لیتا۔ عورتیں رات کو دروازے کھلے چھوڑ کر سو جاتی تھیں۔ اگر زیاد کے پہرے میں کسی کے گھر سے ایک رسی بھی چوری ہو جاتی تو انہیں خبر ہوتی تھی کہ چور کون ہے؟'۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے 1930ء کے عشرے میں اٹلی کے لوگوں نے مسولینی کی آمرانہ طرز حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا اور صبر کر کے، اس طور کو مان کر بسر رکھتے تھے۔ مسولینی کے دور میں لوگ کہا کرتے تھے کہ 'اس نے کمال ہی کر دیا۔ دیکھو تو، ٹرینیں اپنے مقررہ وقت پر چلتی ہیں'۔ ساتویں صدی عیسوی میں عراقیوں نے بھی خود کو زیاد کے راج کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا، اس پر مجبور اگر راضی تھے۔ زیاد کے دبدبے اور سختی کا یہ عالم تھا کہ خوارج بھی اب کولہوں کے بل بیٹھ گئے اور مجال ہے کہ پہلے کی طرح اکڑ فوں کرتے۔ کہا

جاتا ہے کہ انہیں ہر وقت مکافات کا دھڑ کا لگا رہتا۔ سہم کر رہتے کہ نہ جانے کس وقت انتقامی کاروائیوں کا آغاز ہو جائے۔

عراق کے لوگوں کو اس تحفظ اور امن کی قیمت خوف اور دہشت میں بسر رکھنے کی صورت ادا کرنی پڑی۔ زیاد نے اس دور میں خفیہ پولیس کا نظام تشکیل دیا تھا جس کے ذمے نہ صرف پورے عراق میں 'گم ہونے والی رسیوں' کا پتہ لگانا تھا بلکہ ساتھ ہی کونے کونے میں چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی مخالفت اور مبینہ سازشوں کی پوری خبر رکھنے کا کام بھی تھا۔ جیسا کہ پہلے ہی دن لوگوں پر واضح کر دیا تھا، وہ کبھی کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتتے تھے۔ لچک دکھانے کا تو سوال ہی نہیں تھا، سخت گیری اور غیر مصالحانہ طرز تھی۔ جرم ثابت ہو جاتا تو اکثر اجتماعی سزائیں دی جاتیں۔ باغات جڑ سے اکھاڑ دیے جاتے، زمین پر قبضہ کر لیا جاتا، ایک شخص کے جرم پر اس کے کنبے اور کبھی کبھار پورے قبیلے کے گھر مسمار ہو جاتے، رشتہ داروں کو دھر لیا جاتا اور جہاں ضروری سمجھا جاتا، بے انتہا سختی برتی جاتی۔ یہی نہیں، وہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی پر بھی ڈرا دھمکا کر تیار رکھتے۔

'ہر شخص اپنے آپ کو بچائے!' حکم جاری ہوا، 'موذی اور تخریب کاروں، خلیفہ کے مخالفین کی مجھے پوری خبر ملنی چاہیے۔ ان کی فہرستیں تیار کرو اور چپ چاپ میرے حوالے کر دو تو تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ لیکن اگر تم نے انکار کیا تو یاد رکھو، میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ ایسے کسی بھی شخص کا خون اور جائیداد، حلال ہو گی'۔ یہ زیاد کے کئی حکم ناموں میں سے کشید کردہ چند احکامات ہیں۔

خفیہ پولیس، جاسوسوں کے نیٹ ورک اور انتقامی کاروائیوں کے بل بوتے پر زیاد نے جس طرح عراق پر حکمرانی کی، چودہ سو برس بعد بالکل اسی طرح ایک اور آمر بھی حکومت چلایا کرے گا۔ زیاد کی طرح صدام حسین علیہ السلام بھی سنی تھے اور انہیں شیعہ کی اکثریتی آبادی پر حکمرانی کرنا تھی۔ اس مشکل کام کو احسن طریقے سے سرانجام دینے کا ان دونوں کو یہی طریقہ سوجھا۔ اگر لوگوں کے دلوں میں علی کا غم تھا تو زیاد اس کا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عوام کے دلوں پر تو کنٹرول نہیں کر سکتے تھے مگر ظاہر ہے وہ ان کے عمل اور ہر قدم پر،

ذہنوں پر ہر طرح سے اثر انداز ہو سکتے تھے، نظر رکھ سکتے تھے۔ زیاد اتنے ہی سنگ دل واقع ہوئے تھے جتنے صدام کے قصے مشہور ہیں۔ یعنی، ان کا یہ طریقہ ایسا کارگر تھا کہ ایک طویل عرصے تک ان دونوں کو اپنی جگہ سے ہلانا، حکومت سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا۔ زیاد تو نہیں ہلے مگر صدام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہیں اقتدار سے الگ کرنے کے لیے مغرب کو جھوٹ کا سہارا لے کر پورے ملک پر دھاوا بولنا پڑا تھا۔

زیاد کو عراق کا گورنر مقرر کرنے کا ایک مقصد تھا جو سمجھ میں بھی آتا ہے۔ معاویہ نے چن کر اس کام کے لیے انتہائی موزوں شخص کا انتخاب کیا تھا مگر وہیں انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ کل کلاں زیاد اپنی نئی دریافت کردہ حکمرانی کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر، عراقی افواج کی مدد سے انہی کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ عراق کے گورنر کو ہر طرح کا اختیار سونپنے کے علاوہ یقینی بناتے کہ زیاد ہمیشہ انہی کے وفادار رہیں گے۔ اسی لیے معاویہ نے فیاضی برتتے ہوئے اب جا کر وہ اہم قدم اٹھایا، جس کا انہیں اس سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ عوامی سطح پر زیاد کو ابوسفیان کا جائز بیٹا قرار دے کر ان کے ساتھ صاف خون کا رشتہ جوڑ دیا۔ اس ضمن میں باقاعدہ حکم نامہ جاری ہوا اور معاویہ نے انہیں اپنے سوتیلے بھائی کی حیثیت عطا کر کے عزت افزائی کی۔ معاویہ کے اس اعلان پر زیاد کو ماضی میں لاحق کلنک کے اس ٹیکے سے چھٹکارا مل گیا اور اس عزت افزائی پر تذلیل کے سارے داغ دھل گئے۔ ساتویں صدی میں مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں طاعون کی کئی چھوٹی بڑی وبائیں پھوٹی تھیں۔ ان میں سے ایک وبا کا نشانہ زیاد بھی بن گئے۔ ان کے انتقال کے بعد معاویہ نے موزوں سمجھا کہ زیاد کی وفاداریوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے زیاد کے بیٹے، یعنی اب معاویہ کے جائز بھتیجے عبید اللہ یا ابن زیاد کو عراق کا نیا گورنر مقرر کر دیا۔ زیاد کے بارے تو افواہیں تھیں، عبید اللہ نے صحیح معنوں میں خود کو 'ابن ابی' یعنی 'اپنے باپ کا بیٹا' ثابت کرتے ہوئے، انہی کی طرز حکمرانی کو جاری رکھا۔

عراق پوری طرح زیر ہو گیا اور شیعت علی کی تقریباً نشانیاں یعنی ہمدردی وغیرہ دب گئی۔ تجارتی راہداریاں ہر طرح سے محفوظ تھیں اور تجارت بغیر کسی دباؤ کے پوری زور شور سے جاری تھی۔ سلطنت جس کی حدیں مغرب میں الجیریا اور شمال میں اس علاقے تک پھیل چکی تھیں جہاں آج کل پاکستان واقع

ہے۔اس وسیع و عریض مملکت کے کونے کونے سے محصولات جمع ہو کر دمشق پہنچ رہے تھے اور معاویہ کے لیے ہر طرح سے سکون اور اطمینان کا دور دورہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو انہیں ابھی بھی پریشان کیے رکھتی تھی۔ یہ وہ وعدہ تھا جو انہوں نے حسن سے کیا تھا، یعنی وقت آنے پر انہیں اپنا جانشین بنا کر اگلا خلیفہ مقرر کرنا تھا۔ حسن کو دستبرداری پر آمادہ کرنے کے لیے اس وقت یہ وعدہ ضروری تھا۔انہوں نے یہ حامی بھری تھی، اکثر گھاگ سیاستدان اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ایسا ہی کرتے ہیں، اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ترجیحات کے ساتھ حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ اس طرح کے وعدے وعید، تھوڑے عرصے بعد بے کار ہو جاتے ہیں۔ایک عظیم فرمانروا کی قدر و قیمت اس کی زبان نہیں بلکہ میراث ہوا کرتی ہے۔تاریخ بعدازاں اس بات کا ثبوت ان کی چھوڑی ہوئی سلطنت اور عظیم الشان بادشاہی کی صورت میں رقم کرے گی۔ معاویہ سے پہلے تک 'خلافت راشدہ' کا دور تھا، لیکن اب وہ پہلی بار ایک خاندان کا شاہی سلسلہ، یعنی 'خلافت امویہ' جاری کریں گے۔ یعنی یہ کہ معاویہ کے بعد ان کا فرزند یزید حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔

معاویہ کے یہ ارادے، یعنی اپنے خاندان کا عہد سلسلہ شاہی کی خواہش خلافت کی ہئیت اور شکل کو بدل کر رکھ دے گی۔ تاریخ میں ان کا یہ قدم امت کے تصور پر کاری وار سمجھا جائے گا۔اس بابت شیعہ اور سنی، دونوں ہی متفق ہیں۔ محمد ﷺ کے بعد اسلام کے اولین برسوں میں جو جمہوری روایت قائم ہوئی تھی، یعنی شوریٰ کا تصور ماضی کا قصہ بن کر کر رہ جائے گا۔ اگرچہ تب بھی، زیادہ تر یہ تصور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آشکار نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اصولی طور پر اس کا کبھی نہ کبھی وجود رہا ہی تھا۔اس پر عمل درآمد پوری طرح نہیں کیا گیا مگر پھر بھی لوگ ایک زمانے تک استصواب رائے اور ہم آہنگی پر زور دیتے رہے تھے، اب تو وہ معمولی سی کرن بھی آئی گئی ہوئی۔ جیسے کبھی بازنطینی جور و جبر اور استبدادی حکومت میں عیسائیت کو تصرف میں لا کر اپنا قبلہ سیدھا کر رکھا تھا، اسلام کو اموی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا کریں گے۔

اس طرز کا آغاز خود معاویہ نے کیا تھا، یزید کو جانشین مقرر کرنے سے بھی کافی پہلے ہی اس کی داغ بیل

ڈال دی تھی۔ انہوں نے قدیم شاہی روایت کے مصداق، یروشلم کے شہر میں تاج پوشی کی رسم ادا کی تھی اور خود کو اسلامی سلطنت کا بلا شرکت غیرے خلیفہ اور اصل میں بادشاہ قرار دیا تھا۔ یہاں انہوں نے ماضی کے بازنطینی بادشاہوں کا کردار اپنا لیا تھا، ان کی ہی طرح شاہانہ طرز اختیار کیا تھا اور جیسے ان سے پہلے بازنطینی بادشاہ عیسائی مقدس مقامات کے سرپرست اعلیٰ سمجھے جاتے تھے، معاویہ بھی خود کو یہی کہلوائیں گے۔ وہ اب دونوں مذاہب، یعنی عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات کے مربی اور نگہبان تھے۔ ان کی فوج میں کئی سپہ سالار عیسائی تھے، ان کے ذاتی معالج ابن اثل بھی عیسائی تھی۔ 'دمشق کا یوحنا' نامی عیسائی راہب اور مشہور پادری کے دادا، ساری عمر معاویہ کے دربار سے منسلک رہا اور ان کی نسل خلافت امویہ کی وظیفہ خوار رہی۔ مقصد یہ ہے کہ معاویہ کی حکومت پر ہر طرح سے بازنطینی رنگ چڑھا ہوا تھا، وہی رسمیں، رواج اور طور طریقے تھے۔ اسی وجہ سے خلافت کا تصور جلد ہی موروثی ملوکیت یا شاہی نظام حکومت میں ڈھل جائے گا اور آخر کار معاویہ مرتے وقت اس بات پر قائل ہوں گے کہ اپنے بیٹے کو خلافت کا جانشین مقرر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور معاویہ کی سوچ اور طرز حکمرانی پر بلاشبہ یہ گماں ہوتا ہے کہ یہ بازنطینی اور فارسی زمین پر رائج، اسی پرانے نظام حکومت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بعد ازاں سکالر، یہاں تک کہ سنی علماء بھی معاویہ کو 'راشد' یا 'خلیفہ راشد' یعنی سچی راہ پر سدھایا ہوا، سکھلایا ہوا حکمران نہیں مانیں گے۔ حکومت کی اس قدیم شہنشاہی بارے یہ ہے کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یزید اس قدیم شاہی طرز زندگی کا بگڑا ہوا، مگر واقعی جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

یزید اس برباد نسل کی تصویر تھا جسے جوانی میں عیاشی اور اسراف کے سوا کچھ نہیں سوجھا۔ یعنی یہ کہ اسے کسی بھی طرح سے ایک فرد کے اسلامی تصور میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ حسن نے یزید کے بارے کہا، 'وہ ریشم پہن کر نشے میں دھت رہتا ہے'۔ یہاں تک کہ زیاد بھی معاویہ کے اس جانشین پر اکثر غصہ رہا کرتے تھے۔ بلکہ وہ معاویہ کے ان خیالات، یعنی یزید کو اگلا خلیفہ بنانے کے ارادوں پر ان کے منہ پر بھڑک جایا کرتے تھے۔ انہوں نے معاویہ کو ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا کہ یزید 'بآسانی پھانسا جا سکتا ہے اور یہ لاپرواہ اور غافل واقع ہوا ہے۔ اسے شغل میلے اور شکار کے علاوہ کچھ سمجھ نہیں ہے'۔ معاویہ کا بیٹا یزید بلاشبہ طور پر ٹیکساس کے کسی امیر زادے کی مثال تھا جسے بیٹھے بٹھائے باپ کی امارت اور وسیع اختیار ہاتھ لگ گیا تھا۔

لیکن چیدہ لوگوں کے اوپر بیان کردہ خدشات، یزید کے بارے غلط اندازہ لگانے کے مترادف ہیں۔ کیا معاویہ اتنے ہی سادہ واقع ہوئے تھے کہ انہیں اپنے بیٹے کے لچھن معلوم نہ ہوتے؟ وہ شخص جو سامنے کھڑے کسی بھی آدمی کو دیکھ کر اس کی حیثیت پہچان لیتا تھا، کیا وہ اپنے بیٹے سے ناواقف رہا ہو گا؟ معاویہ کبھی بھی ایک عیاش اور بدکار آدمی کو جانشین بنا کر اپنی میراث اور نام کو خراب نہیں کر سکتے تھے۔ شاید یزید کو شراب نوشی پسند رہی ہو، وہ ریشم پہنتا ہو یا اکثر موج میلا کرتا رہا ہو مگر عملی میدان میں اس نے ہمیشہ خود کو ایک بہترین منتظم اور سپہ سالار ثابت کیا تھا۔ بھلے وہ اسلامی اصولوں کے تحت 'مومن' کی مثالی تصویر نہ رہا ہو، سلطنت کے امور چلانے کے لیے اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟ معاویہ خود یہاں تک کیسے پہنچے تھے؟ ویسے بھی معاویہ یزید کو ایک تخت شاہی کا جانشین بنانا چاہتے تھے، منبر پر کھڑا کر کے خطبات دلانا مقصد نہیں تھا۔

معاویہ نے یقیناً ان اعتراضات کا خوب جواب سوچ رکھا تھا۔ وہ دلائل سوچتے ہوں گے اور انہوں نے اپنے تئیں ہر موقع پر اپنے اس ارادے کا خوب دفاع کیا تھا۔ وہ کیوں نہ سوچتے؟ مثلاً، اہل بیت کا خلافت پر دعویٰ، ان سے کیسے مختلف تھا؟ کیا ان کا مطالبہ خونی رشتوں اور موروثیت پر مبنی نہیں تھا؟ معاویہ کا یہ قدم کوئی انوکھا تو نہیں تھا، علی نے خلافت سنبھال کر کیا موروثیت کو شہ نہیں دی؟ پھر یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ اگر کوئی شخص خوش قسمتی سے اس خاندان میں پیدا ہو گیا ہے تو کیا نسب کے ساتھ ساتھ اسے ورثے میں روحانی طاقت اور قیادت کا اختیار، یعنی سب کچھ مل گیا؟ باقی لوگ کہاں جائیں؟ کیا پانچویں خلیفہ کا بیٹا، خلافت کا اتنا ہی حقدار نہیں ہے جتنا چوتھے خلیفہ کا فرزند خود کو سمجھتا ہے؟ اور خلافت کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے، وہ استحکام جو معاویہ نے اپنی قابلیت پر اسلامی سلطنت کے لیے حاصل کر لیا تھا، کیا ان کے بعد اسے قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ معاویہ کی مرضی پر عمل کیا جائے؟

علاوہ ازیں، یہ ایسی بات تو نہیں تھی کہ جیسے معاویہ محمد ﷺ کے خاندان سے خلافت چھین رہے ہوں۔ ہاں، اہل بیت کو اس سے علیحدہ ضرور کر رہے تھے مگر خاندان کا تصور گھرانے سے کہیں بڑا نہیں ہے؟ کیا معاویہ بھی پیغمبر کا خاندان نہیں تھے؟ کیا محمد ﷺ ان کے بہنوئی نہیں تھے؟ اور کیا بنو امیہ کے لوگ

آپؐ کے خاندان کے لوگ نہیں ہیں؟ معاویہ کے دادا امیہ، محمد ﷺ کے دادا عبد المطلب کے چچازاد تھے، اس طرح معاویہ اور یزید دونوں ہی آپؐ کے دور پار سے رشتہ دار ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ شجرہ نسب میں کسی دوسری لکیر پر ہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، لے دے کر وہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟

یقیناً معاویہ ایسا ہی سوچتے رہے اور گاہے بگاہے مختلف عوامی مجالس اور ذاتی محافل میں یہی منطق سامنے لاتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وقت آنے پر انتہائی آسانی سے یزید کو جانشین مقرر کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ خیر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں اس کے لیے کسی ماحول کو ترتیب دینے کی، اس مشق کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ جلد ہی انہیں اس بارے سوچنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہوا یہ کہ حسن چھیالیس سال کی عمر میں، تقریباً مدینہ لوٹنے کے نو سال بعد انتقال کر گئے۔ سنی کہا کریں گے کہ ان کی موت قدرتی وجوہات کی بناء پر ہوئی جبکہ شیعہ اس ضمن میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں مشہور ہے کہ معاویہ نے وقت سے پہلے ہی حسن کو راستے سے ہٹانے کے لیے، اپنے پسندیدہ ہتھیار یعنی زہر ملا شہد پلا کر مروا دیا۔

کچھ سنی سکالروں اور شیعہ کے مطابق معاویہ کو اس مقصد کے لیے ان کی کمزوری ہاتھ آ گئی تھی۔ جس نے حسن کو وہ زہر ملا شہد پلایا، اس پر کسی کو شک بھی نہیں تھا۔ یہ حسن کی بیویوں میں سے ایک تھی جس کا نام جعدہ تھا۔ جعدہ نے حسن سے اس امید پر بیاہ کیا تھا کہ وہ اپنے والد، یعنی علی کے بعد خلیفہ مقرر کیے جائیں گے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ وہ حسن کے بچوں کی ماں ہو گی، یعنی طاقت اور اختیار اس کے ہاتھ میں ہو گا۔ حسن کی دوسری بیویوں سے کئی بیٹے پیدا ہوئے لیکن جعدہ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ملی۔ نہ ہی اس کی پہلی خواہش پوری ہوئی، یعنی سلطنت کے خلیفہ کی بیوی کا رتبہ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ جب حسن نے معاویہ کی طرف سے پیش کی جانے والی خلافت سے مشروط علیحدگی قبول کر لی تو جعدہ کو اس کا خاصا رنج تھا۔ وہ اب مدینہ میں رہائش پذیر ایک عالم کے گھر میں بے اختیار گھریلو عورت تھی اور مدینہ میں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ جہاں حسن کی رہائش تھی، وہ جگہ بھی عام سی تھی اور ان کا امور خلافت تو دور کی بات، مدینہ

کے معاملات میں بھی کوئی کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جعدہ نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس کا شوہر خلیفہ نہیں بن سکتا تو ایک دوسرا شخص تو ضرور ہی بنے گا۔ کیوں نہ، حسن کا پتہ کاٹ کر اس شخص سے نباہ کر لیا جائے؟ شاید اس طرح اس کی خواہشات پوری ہو جائیں؟ شاید یہی سوچ کر اس نے معاویہ کی پیشکش قبول کر لی تھی۔

معاویہ نے جعدہ کو اس کام کے لیے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ صرف مال و دولت نہیں تھا بلکہ یزید سے اس کے نکاح کی بھی حامی بھری تھی۔ اگر حسن راستے سے ہٹ جائیں یا ہٹا دیے جائیں تو پھر یزید کو جانشین بنانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ یزید خلافت سنبھال لیتا اور جعدہ کی مرضی پوری ہو جاتی۔ معاویہ نے کبھی کسی کا قرض نہیں چھوڑا، وہ مال و دولت کے معاملے میں عثمان کی ہی طرح سخی واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جعدہ کو حسب وعدہ مال و دولت تو دے دیا مگر بیٹے کا ہاتھ نہیں دیا۔ روایت میں ملتا ہے کہ حسن کی موت کے بعد حال ہی میں بیوہ ہونے والی جعدہ نے جب وعدے کے دوسرے حصے کی طرف معاویہ کی توجہ مبذول کروائی تو انہوں نے اسے جھڑک دیا، 'کیوں بھلا؟ کیا میں اپنے بیٹے کا بیاہ ایسی عورت سے کرواؤں گا جو اپنے شوہر زہر بھی دے سکتی ہے؟'

شیعہ اسلام کے دوسرے امام حسن کو مدینہ کے مرکزی قبرستان میں دفن کیا گیا حالانکہ یہ ان کی وصیت نہیں تھی۔ ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے نانا، یعنی محمد ﷺ کے پہلو میں دفن کیے جائیں۔ محمد ﷺ کی قبر عائشہ کے سابقہ رہائشی کمرے، مسجد کے احاطے میں واقع تھی۔ حسن کی آخری خواہش کے مطابق جب ان کی میت کو مسجد کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو مدینہ کے گورنر نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا اور مرکزی قبرستان کی طرف رخ موڑنے کا حکم دیا۔ معاویہ حسن کو پیغمبر کے پہلو میں دفن ہو کر امر ہونا، کسی بھی صورت قبول نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مزارات اور مقبروں کی طاقت سے خوب واقف تھے۔

اس ضمن میں کئی روایات ایسی بھی ہیں جس میں حسن کی تدفین کے معاملے میں ایک دوسری شخصیت پر بھی الزام دھر دیا گیا ہے۔ جنگ جمل کے بعد سے اب کئی برس ہو چلے تھے اور عائشہ نے مدینہ میں مستقل

سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہ اب سیاست اور امور مملکت سے دور، بمشکل اسلام کی سفیر کے طور پر بسر کر رہی تھیں۔ وہ اب اپنی عمر کے اس حصے میں تھیں کہ بزرگوں میں شمار ہوتا تھا اور لوگ ان کی عمر اور رتبے کا احترام کرتے تھے۔ وہ چھوٹے موٹے تنازعات حل کرواتیں، لوگ شادی بیاہ کے فیصلوں میں ان سے مشورہ کرتے اور جہاں ان کو ضرورت پڑتی، وہ محمد ﷺ کے ساتھ بتائی زندگی کے احوال سناتیں اور اکثر اسی دور کی یادداشتوں کا سہارا لے کر اپنی من مرضی چلاتیں۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید انہوں نے ماضی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے لیکن جب انہوں نے سنا کہ لوگ حسن کا جنازہ مسجد کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہیں تدفین کا ارادہ رکھتے ہیں تو فوراً ہی دیرینہ آزردگی اور بیر پھر سے نکل آئی۔ وہ باہر نکل آئیں۔

جو شخص عائشہ کی غلطیوں پر انتقام الٰہی بن کر ٹوٹ پڑا تھا، یعنی علی کا بیٹا پیغمبر کے پہلو میں دفن کیا جائے گا؟ اس جگہ پر جہاں کبھی ان کی رہائش ہوا کرتی تھی؟ بلکہ وہ جگہ تو قانونی طور پر ابھی بھی عائشہ کے نام تھی۔ کیا ہوا اگر محمد ﷺ کے بعد ان کی بیواؤں کو وہاں سے نکال کر نخلستان میں نسبتاً کھلی جگہ پر منتقل کر دیا تھا، آپؐ کے زمانے کی نسبت سے تو یہ احاطہ جس میں رہائشی کمرے تھے، بیواؤں کے ہی تو نام تھے۔ وہ کسی بھی صورت اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ذاتی استعمال میں رہنے والا بھورے رنگ کا خچر سواری کے لیے تیار کرنے کا حکم دیا۔ زین کس دی گئی اور عائشہ اس پر سوار ہو کر سیدھا جنازے کے جلوس کا راستہ روک کر سامنے کھڑی ہوئیں۔ اس وقت یہ جلوس مسجد کے نزدیک ہی تنگ گلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ 'وہ کمرہ ابھی بھی میری ملکیت ہے' عائشہ نے بلند آواز میں کہا، 'میں اس کمرے میں مزید کسی کی تدفین کی اجازت نہیں دوں گی'۔

جلوس فوراً ہی رک گیا اور شریک افراد چپ چاپ کھڑے تھے۔ جلد ہی مزید لوگ بھی پہنچ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم چار گنا ہو گیا۔ دونوں طرف لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع تھی اور لگ رہا تھا کہ ہاتھا پائی شروع ہو جائے گی۔ کچھ لوگ حسین علیہ السلام کی طرف داری کر رہے تھے جو اپنے بھائی کی میت جلوس کے آگے رکھ کر پاس ہی کھڑے تھے۔ دوسری طرف عائشہ کی حمایت میں بھی کئی لوگ نکل آئے تھے، جو خچر پر جم کر بیٹھیں، پیچھے ہٹنے سے انکاری تھیں۔ عائشہ کے ایک بھانجے نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کروانا چاہا،

'ہم ابھی تک جنگ جمل میں آئی چوٹوں کو سہلا رہے ہیں۔ وہ زخم تو بھرنے میں نہیں آتے اور آپ اب چاہتی ہیں کہ لوگ بھورے خچر کی لڑائی میں جت جائیں؟' بات بڑھتی گئی اور دونوں اطراف سے تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ سب نے تیاری کر لی کہ اب لوگ ایک دوسرے سے بھڑ جائیں گے۔ یہ خطرہ بھانپتے ہی حسین علیہ السلام نے فوراً ایک حل پیش کیا تاکہ بدمزگی نہ ہو۔

حسین علیہ السلام نے کہا کہ یہ درست ہے کہ ان کے بھائی نے پیغمبر، یعنی اپنے نانا کے پہلو میں دفن کیے جانے کی خواہش رکھتے ہوئے، یہی وصیت کی تھی لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ ایسا صرف اور صرف تب کیا جائے اگر 'نقص امن کا کوئی خدشہ نہ ہو'۔ چونکہ اب بات بڑھ کر لڑائی کی حد تک جا پہنچی ہے اور 'نقص امن' کا اندیشہ ہے۔ ڈر یہ تھا کہ حسن کے جنازے پر لوگ ایک دوسرے کو کاٹ پھینکیں گے، چنانچہ حسین علیہ السلام نے حکم دیا کہ جلوس کا رخ بدل دیا جائے اور بجائے مسجد، مرکزی قبرستان میں تدفین کی جائے گی۔ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں تو دفن نہیں کیا جا سکا مگر ان کی قبر اپنی ماں، یعنی فاطمہ کی قبر کے ساتھ ہی بنا دی گئی۔

یوں یہ قصہ بھی تمام ہو گیا۔ کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسا معاویہ کے حکم پر، یعنی ان کے مقرر کردہ مدینہ کے گورنر کی ایماء پر ایسا کیا گیا یا یہ عائشہ کے اصرار کے سبب ہوا۔ لیکن ظاہر ہے، یہ معاویہ کا زمانہ تھا اور ان کا حکم چلتا تھا۔ ایسے میں، سارا الزام عائشہ کے سر پر دھر دینے سے ساری توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی اور معاویہ صاف دامن بچا گئے۔ بے باک اور کبھی نہ دبنے والی ام المومنین، پہلے صرف رتبے مگر اب عمر کی زیادتی کی وجہ سے بھی، کسی بھی طرح کی نکتہ چینی سے نکل چکی تھیں۔ لوگ ان کا لحاظ کرتے تھے اور ظاہر ہے، اس معاملے میں بھی کسی شخص نے ان کی طرف سیدھی انگلی اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عائشہ ابھی تک ذاتی زور اور اپنا ہی طور طریقہ برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ مثال یوں کہ آگ تو بجھ گئی تھی مگر چنگاریاں اب بھی باقی تھیں۔ 'کیا تمہیں خوف نہیں آتا کہ کسی دن میں تم سے اپنے بھائی محمد بن ابو بکر کے قتل کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لوں؟' عائشہ نے ایک دفعہ معاویہ سے پوچھا، جو اس وقت مدینہ میں تھے اور عائشہ کا حال احوال پوچھنے خود ان کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ بعد میں بھی

کئی محفلوں میں اس ملاقات کا تذکرہ کرتے رہے اور وہ آخر میں کہتے جو عائشہ کے بارے ان کی کہی یہ بات آج بھی زبان زدعام ہے کہ، 'کبھی کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ کسی معاملے کو میں بند رکھنا چاہوں تو وہ اسے بند ہی رہنے دیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مسئلے کو کھولنا چاہوں تو وہ مجال ہے کہ اسے آسانی سے کھلنے دیں؟' امور خلافت سے زبردستی علیحدگی اور اب گوشہ نشینی میں بسر رکھتے ہوئے بھی عائشہ اپنی حیثیت اور رتبہ قائم رکھنے پر مصر تھیں، وہ اپنی عزت کروانا جانتی تھیں مگر اب یہ تھا کہ وہ زیادہ تر وقت کڑھنے میں گزرتا تھا۔

یہ عمر کا وہ حصہ تھا جس میں ان کے مشغولات بھی وہی تھے جو آج کل بھی عملی زندگی سے فراغت پانے کے بعد نامی گرامی عمر رسیدہ بزرگوں کے ہوا کرتے ہیں، یعنی وہ اپنی یادداشتیں جمع کرتی رہتیں یا کہیے لکھوایا کرتی تھیں۔ وہ محمد ﷺ کے ساتھ بِتائی زندگی کے واقعات یاد کر کے سناتی رہتیں۔ بعد ازاں ان کے بیان کردہ یہ واقعات 'حدیث' کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یعنی لوگ ان واقعات میں سے محمد ﷺ کے اقوال اور طور طریقے کشید کیا کریں گے اور ان کے افعال اور تعلیمات سنت بن جائیں گی۔ سنت کے بارے یہ ہے کہ فقہ اسلام میں قران کے بعد سنت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عائشہ یہ واقعات بار بار سناتیں اور ہر بار تفصیلات کو پہلے سے زیادہ شستہ بنا دیتیں۔ اگر کوئی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرواتا کہ شاید ان سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ پچھلی دفعہ ان کا بیان مختلف تھا تو بجائے صاف تصحیح کے وہ طریقہ اختیار کرتیں جو آج جدید دور کے سیاستدانوں میں عام ہے۔ یعنی وہ کہتیں کہ تب ان سے اس بابت کہنے میں کوئی بھول چوک ہو گئی ہو گی مگر اب جو وہ بات کہہ رہی ہیں، وہی درست سمجھی جائے۔ یا پھر وہ سوال پوچھنے والے کو بیچ بات کے ہی ٹوک دیتیں اور اکثر اپنے پہلے بیان سے منکر ہو جاتیں، کہتیں کہ انہوں نے کبھی ایسا کہا ہی نہیں تھا یا صاف صاف کہہ دیتیں کہ پچھلی باتوں کو چھوڑو، جواب کہہ رہی ہوں، وہی ٹھیک ہے۔

اس طور دستبردار ہو کر زندگی گزارنے کا اثر تھا یا عمر کا تقاضا تھا کہ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ ایک دم بھڑکتی نہیں تھیں اور لہجہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔ حسن کی موت کے بعد چند برسوں کے اندر ہی معاویہ نے خلافت کو بادشاہت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ عائشہ یہ حال دیکھ کر اکثر علی کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی

غلطی پر پشیمان رہتیں۔ 'پیغمبر خدا کے بعد مجھ سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں'، انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ وہ اب بھی سیاسی منظر نامے پر نظر رکھتی تھیں، ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ عرب کے طول و عرض سے قبائلی سردار جب بھی مدینہ آتے، وہ عائشہ کے یہاں ضرور ہی حاضری دیتے اور یہ ان سے بات چیت میں اکثر ایسی ہی باتیں کرتیں۔ لوگ ان کی خدمت میں تحفے پیش کرتے اور انہیں خوب عزت بخشی جاتی، رتبے کا لحاظ کیا جاتا اور پیغمبر کی نسبت سے ان کی بے حد ستائش ہوتی۔ لیکن عائشہ جانتی تھیں کہ ان کے یہ مشغولات کس قدر بے معنی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ اسلام کی داستان میں مرکزی کردار تھیں مگر اب ان وہ کونے سے لگ چکی تھیں۔ وقت بدل گیا تھا، خلافت اور اس کا تصور بھی جاتا رہا تھا۔ ایسے میں عائشہ کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس عظیم نظریہ حیات اور امت کی زندہ یادگار بن کر بسر کیا کریں۔

گو عائشہ نے خود کو سیاست اور امور سلطنت سے دور کر لیا تھا مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں اب بھی چین نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ قبائلی سردار مدینہ جاتے تو ان کے یہاں حاضری لگاتے، اسی طرح نامی گرامی سپہ سالار اور یہاں تک کہ معاویہ خود بھی ان کی خیر خبر رکھتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ مصر کے گورنر عمرو بھی اکثر عائشہ سے ملنے آجاتے۔ عمرو جب بھی جاتے، کوئی لگی لپٹی نہ رکھتے اور اکثر حد پار کر جاتے۔ عائشہ جانتی تھیں کہ وہ خود ایسا نہیں کہتے بلکہ جب بھی انہیں اکسانے والی باتیں کرتے ہیں تو اس میں معاویہ کی بھی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ایک دن عمرو عائشہ سے کہنے لگے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم جنگ جمل میں ماری جاتیں۔ وہ اس بات پر ہکا بکا رہ گئیں، فوراً ہی وجہ پوچھی اور یہ عائشہ ہی تھیں جو عمرو جیسے شخص سے الجھ سکتی تھیں۔ غیر متوقع طور پر انتہائی بے تکلفی سے جواب آیا، 'کیونکہ اس طرح تم عروج کے زمانے میں مر جاتیں اور جنت میں جاتیں۔ جبکہ ہم تمہاری موت کو علی کے ہاتھوں سرزد ہونے والا مذموم اور ملعون فعل مشہور کر دیتے'۔

یہ کہہ کر عمرو تو چلے گئے مگر ظاہر ہے عائشہ کو باقی ماندہ عمر اس بارے کڑھتا رہنے کے لیے مدینہ میں ہی چھوڑ گئے۔ وہ ہمیشہ ہی خود کو اسلام کا مرکز، امت کی دیوی سمجھتی آئی تھیں۔ وہ خود کو مسلمانوں کی ملکہ سمجھتی

تھیں مگر کیا وہ کسی کی بچھائی شطرنج کی اس بازی پر صرف اور صرف ایک پیادہ تھیں؟

معاویہ نے حسن کی موت کے بعد رسمی طور پر اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے حسین علیہ السلام کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اپنے تئیں وہ بے شک وشبہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ علی کے چھوٹے فرزند کو بھی پہلے کی طرح خلافت سے علیحدگی پر آمادہ کر لیں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ علی بھی ثالثی پر رضا مند ہو گئے تھے اور حسن نے بھی وقت آنے پر مشروط علیحدگی اختیار کر لی تھی، حسین علیہ السلام بھلا ایسا کیوں نہیں کریں گے؟ کیا وہ ان دونوں سے مختلف تھے؟ واقعتاً بھی ایسا ہی تھا۔ اگلے دس برس، جب تک معاویہ زندہ رہے، حسین علیہ السلام مجہول ہی رہے۔ وہ اس بابت خاموشی اختیار کیے رہے۔ حسین علیہ السلام جانتے تھے، خاموشی میں ہی عافیت ہے۔ وہ علی اور حسن کا حال دیکھ چکے تھے۔ صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ معاویہ کے اختیار میں اس دنیا کی ہر چیز تھی مگر عمر واحد شے تھی، جس کو ڈھلنے سے وہ روک نہیں سکتے تھے۔ وقت پر معاویہ کا بھی موت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

معاویہ زندگی بھر گٹھیا، جوڑوں کے درد اور موٹاپے میں مبتلا رہے اور بالآخر اسی کے سبب جان سے ہار گئے۔ بیماری کے باوجود آخری دن تک ان کا طور یہی رہا کہ معاملات پر گرفت مضبوط رہے۔ وہ تکیے کے سہارے سیدھا بیٹھے رہتے اور آنکھوں میں سرمہ لگاتے تاکہ اس طرح جاندار نظر آیا کریں۔ چہرے پر ہر وقت تیل مل کر رکھتے تاکہ چمک سے منہ پر زندگی کی رونق اور جسمانی قوت کا شائبہ باقی رہے۔ اگر زندگی بھر ان کا طریق غرور اور شان تھا تو اب اس عمر تک پہنچ کر وہ خود نمائی میں بھی مبتلا ہو گئے لیکن آخری دنوں میں انہیں اچانک پرہیز گاری اور تقویٰ کا بھی خیال آیا۔ تاکید کی کہ مرنے کے بعد انہیں اس قمیص میں دفنایا جائے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں دی تھی۔ وہ اب تک پیغمبر کی یہ قمیص اور چند ناخن سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ 'نبی کے ناخنوں کو کاٹ کر ان کا کترن بنا لینا اور میرے منہ اور آنکھوں پر چھڑک دینا۔ شاید اس طرح خدا ان کے صدقے مجھ سے رحم کا معاملہ کرے؟'۔

معاویہ مرے تو یزید ان کے سرہانے اور حسین علیہ السلام دماغ پر کھڑے تھے۔ انہوں نے یزید کو وصیت کی اور کچھ اس طرح خبردار کیا، 'حسین علیہ السلام کمزور اور ادنیٰ شخص ہے لیکن عراق کے لوگ بغاوت کے لیے اسے

اکسانے سے باز نہیں آئے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو تم اسے شکست دینا اور پھر معاف کر دینا کیونکہ وہ پیغمبر کا نواسا ہے اور اس کا یہی بڑا حق ہے'۔

اگر یزید معاویہ کی بات پر توجہ دیتا تو شاید صدیوں سے جاری نزاع اور جھگڑا ٹل سکتا تھا۔ وہ انقسام جواب دب چکا تھا، وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا لیکن ظاہر ہے، شاید اس کے ساتھ امت اور خلافت کا تصور بھی مر جاتا۔ لیکن ایک یا دوسری صورت، ہم جانتے ہیں کہ تاریخ بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جو سرکش واقع ہوئے ہوں۔

22 اپریل، 680ء کے دن یزید کو نیا خلیفہ بنا دیا گیا۔ منصب سنبھالتے ہی اس کا پہلا کام پیر جمانا اور خود کو مستحکم کرنا تھا۔ فوراً ہی زیاد کے بیٹے عبید اللہ کی بطور گورنر عراق توثیق کر دی تاکہ اگر وہاں کوئی مخالفت سر بھی اٹھائے تو فی الفور کچلی جا سکے۔ ساتھ ہی مدینہ کے گورنر کو خط کے ذریعے حکم جاری کیا کہ حسین علیہ السلام کو گرفتار کر لے۔ 'اتنی سختی سے پیش آؤ کہ حسین علیہ السلام کے پاس حرکت کا موقع بھی نہ رہے اور نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت سے قبل کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ اگر وہ تعاون نہ کرے یا مزاحمت پر اتر آئے تو بے شک ختم کر دو'۔

لیکن مدینہ کا گورنر، جو معاویہ کے احکامات کی فوراً تعمیل کرتا تھا، یزید کا خط پڑھ کر پس و پیش سے کام لینے لگا۔ حسن کی میت کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے سے روکنا ایک بات تھی مگر حسین علیہ السلام کا، یعنی پیغمبر کی بچ جانے والی آخری نشانی، ان کے نواسے کو کیسے قتل کرتا؟ یہ سوچ کر ہی اسے ہول اٹھتے تھے۔ 'میں یہ نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی مجھے اس کے عوض ساری دنیا کی مال و دولت لا دے اور اختیار دلا دے، میں پھر بھی یہ نہیں کر سکتا'، گورنر نے اپنے مشیروں سے کہا۔

شاید یہ مدینہ کا گورنر ہی تھا جس نے حسین علیہ السلام کو حالات بارے متنبہ کر دیا تھا یا شاید یہ گورنر کے مشیروں میں سے کوئی تھا، جس نے حسین علیہ السلام کو خبر کر دی اور احتیاط برتنے کا مشورہ دیا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ جس دن یزید کا خط پہنچا، اسی رات تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حسین علیہ السلام نے اپنے قریبی رشتہ

داروں، عزیزوں اور خیر خواہوں کو جمع کیا اور فوراً ہی مدینہ سے رخصت لی۔ اس قافلے کا رخ مکہ کی طرف تھا۔

حسین علیہ السلام ابھی مکہ بھی نہیں پہنچے تھے کہ ایک کے بعد دوسرے قاصد کی آمد شروع ہوئی۔ یہ قاصد بغیر رکے، کوفہ سے طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کر کے حسین علیہ السلام تک پہنچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں خطوط ہوتے جن میں حسین علیہ السلام سے عراق جانے کی استدعا کی گئی تھی۔ لوگ منتیں کر رہے تھے کہ وہ آئیں اور انہیں یزید اور اس کے گورنر عبید اللہ کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلائیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ مزید کوئی تامل نہ برتیں اور خلافت کا دعویٰ کریں اور اسلام کی روح کو زندہ کریں جو امویوں کے ہاتھ ملوکیت کی شکل میں کچلی جا چکی تھی۔ حسین علیہ السلام مکہ پہنچ چکے تھے اور ان خطوط کی بہتات میں بالآخر وہ خط آ گیا جس کا حسین علیہ السلام کو شدت سے انتظار تھا اور وہ قائل ہو گئے۔ یہ خط مسلم کی جانب سے لکھا گیا تھا۔ مسلم حسین علیہ السلام کے ہمزاد تھے، جنہوں نے انہیں فوراً عراق کا رخ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور تصدیق کی تھی کہ ان کے ساتھ بارہ ہزار مسلح افراد کا لشکر جمع ہے جو ان کے جھنڈے تلے، ایک اشارے پر لڑ مرنے کو تیار کھڑے ہیں۔

اس خط کے جواب میں حسین علیہ السلام کا فیصلہ اسلام میں تفریق کا حتمی قدم ثابت ہو گا، آپ اپنی سہولت کے لیے اسے تابوت میں کیل وغیرہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ دراڑ اب ایسے شگاف میں بدل جائے گی جو کبھی بھر نہیں سکتی۔ مسلمانوں کے دل و دماغ، سائیکی میں یہ نفاق بیٹھ جائے گا اور اسلام کا الہامی تصور، یہ نظریہ حیات اور آفاقی پیغام خلافت اور ملوکیت کے چکر میں پھنس کر کہیں گم ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اندھیرا ہو گا کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملے گا۔ شیعہ اسلام کے تیسرے امام، پہلے کے فرزند اور دوسرے کے بھائی، حسین علیہ السلام ابن علی 680ء میں ستمبر کے مہینے میں اپنے خاندان اور بہتر مسلح جنگجوؤں کے ساتھ مکہ سے نکلے اور عراق کا قصد کیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سفر نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ہے۔ وہ اپنی موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ماہ کے اندر وہ انتہائی بے دردی سے قتل کر دیے جائیں گے۔ معاویہ کا خیال تھا کہ حسین علیہ السلام 'کمزور اور ادنیٰ' شخص ہے مگر اب یہ 'معمولی' آدمی ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گا۔ 'شہداء کا شہزادہ' بن جائے گا۔

باب 13

شیعہ کے مطابق یہ بات قطعاً درست نہیں ہے کہ حسین علیہ السلام کو اپنے انجام کی خبر نہیں تھی۔ اس سارے معاملے کا محور ہی یہ نکتہ ہے کہ حسین علیہ السلام کو بگڑتے ہوئے حالات کا پوری طرح ادراک تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ کس ڈگر چل رہے ہیں اور بالآخر انجام موت ہے، قربان ہونا ہے۔ انہیں سب پتہ تھا۔ مثلاً، سفر عراق ابھی شروع ہی ہوا تھا اور انہیں کئی لوگوں نے قدم قدم پر متنبہ کیا، آگے نہ بڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے خیر خواہ خطوط لکھ کر حسین علیہ السلام کو حالات سے آگاہ کر رہے تھے۔ صرف انہیں ہی نہیں، ان کے خاندان کے لوگوں اور بہتر جنگجوؤں سے بھی خط و کتابت جاری تھی، ان سے بھی پیش خیمے کا تذکرہ کیا اور خطرات سے مسلسل آگاہ کرتے رہے۔

'کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ کوفہ کے لوگ تمہاری آواز پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے جابر حاکموں کو گدی سے اتار پھینکیں گے؟' حسین علیہ السلام کے ہمزاد بار بار پوچھتے، 'یہ لوگ تو باآسانی بک جاتے ہیں۔ عراقی درہم کے غلام ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہیں بھی بیچ راستے میں چھوڑ دیں گے بلکہ وقت آیا تو یہ تم سے بھی جنگ کرنے سے باز نہیں آئیں گے'۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے حسین علیہ السلام کو ان باتوں سے اب قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ کہیے ان کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے انہیں کسی سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ مثلاً یہ جواب، 'واللہ، اے میرے بھائی! میں جانتا ہوں کہ تم ایسا میری خیر خواہی میں کہتے ہو۔ تمہاری صلاح سچی اور معقول ہے' مزید لکھتے ہیں، 'لیکن جو قسمت میں لکھا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ میں رکوں یا چلوں، آگے بڑھوں یا پیچھے ہٹ جاؤں۔۔۔ جو لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا'۔

پھر بھی، قسمت پر اتنا بھروسا؟ آخر کیوں؟ آنے والی خبریں اچھی نہیں تھیں اور اطلاعات میں انتباہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے آخر آگے کا سفر کیوں جاری رکھا؟ مکہ سے نکلے ابھی صرف ایک دن گزرا تھا کہ قاصد ایک دوسرے ہمزاد کا پیغام لایا، 'اللہ کے نام پر واپس لوٹ آؤ' مزید لکھا

تھا، 'عراقیوں کے دل بے شک تمہارے ساتھ ہوں گے مگر مجھے ڈر ہے کہ ان کی تلواریں یزید کے لیے چلتی ہیں' حسین علیہ السلام نے اس تنبیہ پر بھی اپنے خیر خواہ کو تسلیمی جواب لکھا۔ اس کا خط جیب میں ڈالا اور سفر بدستور جاری رکھا۔

اس سے اگلے دن مکہ کے گورنر کا خط آ گیا۔ اس نے نہ صرف اپنے عہدے بلکہ اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال کر حسین علیہ السلام کو یہ خط لکھا تھا۔ خط میں اس نے ذاتی طور پر حسین علیہ السلام سے لوٹ آنے کی اپیل کی تھی اور 'خوش اخلاقی، نرمی، کشادہ دلی اور تحفظ' کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن حسین علیہ السلام نے جواب دیا، 'حفاظت اور کشادہ دلی کا وعدہ صرف خدا کا ہے۔ وہ سب سے بہتر محافظ اور رحم کرنے والا ہے'۔

جہاں کئی لوگ انہیں متنبہ کر رہے تھے، وہیں کچھ ایسے بھی تھے جو راستے میں ان کے ہمراہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ شریک سفر ہو گئے۔ یہ قافلہ جب حجاز کی پہاڑیوں کو پار کر کے جزیرہ عرب کے شمال میں لق و دق صحرا میں داخل ہوا تو رفتار ایسی تھی کہ دن بھر سفر کے بعد رات کا پڑاؤ کسی چشمے یا کنوئیں کے کنارے پڑتا، جہاں ستانے کی جگہ مل جاتی اور اگلے دن کے لیے پانی کا سامان ہو جاتا۔ یوں، جلد ہی ان کے اس سفر کی خبر صحرا میں پھیل گئی۔ پانی کے ذخیروں اور آس پاس آبادیوں میں ان کے مقصد اور ارادوں کا چرچا ہو گیا۔ جو بھی سنتا، ہمت اور نیت کا قائل ہو جاتا، یوں جلد ہی صحرا کے قبائلی جنگجو ان کی صفوں میں شامل ہونے لگے۔ ان میں سے زیادہ تر اس بات پر خوش تھے کہ بالآخر حسین علیہ السلام قیادت کو واپس عرب میں لے آئیں گے۔ تین ہفتوں پر محیط اس سفر کا پہلا ہفتہ پورا ہوا تو شروع میں اگر صرف بہتر جنگجو ساتھ تھے، اب تعداد بڑھ کر سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ جلد ہی یہ خیال بھی پنپنے لگا کہ عراق تک پہنچتے پہنچتے، یہ مختصر قافلہ ایک بڑے مگر انتہائی منظم لشکر میں بدل جائے گا۔

اس حوصلہ افزاء صورتحال کے باوجود خیر خواہوں کے پیغامات، تنبیہ کا تانتا پھر بھی بندھا رہا۔ ہر ایک خط میں عراق سے دور رہنے کی تاکید کی جاتی، احتیاط سے کام لینے کو کہا جاتا۔ ہر بار، ہر خط کے جواب میں حسین علیہ السلام پیغام بھجوانے والے کا شکریہ ادا کرتے، اس کی تجویز اور تاکید کو 'نیک نیت اور معقول' قرار دیتے اور اس کو نظر انداز کر دیتے۔ پھر ایک دن وہ پیغام آیا جسے وہ کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

قاصد گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اتنی تیزی سے قافلے کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے اس کے پیچھے کوئی خطرہ ہو۔ وہ اتنی سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا کہ بیسیوں میل دور بھاگتے ہوئے سرپٹ گھوڑے کے کھروں سے دھول اٹھتی ہوئی دیکھی جاسکتی تھی۔ یہ پیغام رساں پیچھے سے نہیں بلکہ سامنے سے آرہا تھا۔ اس سے پہلے لوگ مکہ اور مدینہ سے انہیں خط لکھ کر حالات سے چوکنا رہنے کی تاکید کرتے رہے تھے مگر پہلی بار کوئی شخص عراق سے پیغام لایا تھا۔ حسین علیہ السلام کا قافلہ دن بھر سفر کی تھکان سے چور تھا اور پڑاؤ ڈالنے کی تیاریاں جاری تھیں کہ یہ آدمی آن پہنچا۔ گھوڑے سے اترا، کسی نے پینے کے لیے پانی دیا تو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ خبر اتنی اہم تھی کہ اسے فوراً حسین علیہ السلام تک پہنچایا جانا انتہائی ضروری تھا۔

اس قاصد کو حسین علیہ السلام کے ہمزاد مسلم نے بھجوایا تھا۔ اس سے پہلے مسلم نے خط لکھ کر حسین علیہ السلام کو فوراً عراق پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ ان کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ کوفہ کے لوگ واقعی ان کے ساتھ نکل آئے تھے اور حسین علیہ السلام کے ہاتھ پر بحیثیت خلیفہ بیعت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یزید کے گورنر عبید اللہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پکا تہیہ کیا تھا اور حسین علیہ السلام کو بلا بھیجا تھا، تاکہ ان کی سپہ سالاری میں دمشق پر چڑھائی کر سکیں۔ یزید کے تخت کو اکھاڑ پھینکیں اور حسین علیہ السلام کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی کا اصل جانشین بنا کر خلافت کی کرسی پر بٹھا دیں۔ قاصد نے بتایا کہ یہ سب سچ تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ معاملات اتنے آسان نہیں رہے جتنے پہلے دکھائی دیتے تھے۔

مسلم جس قدر خلافت اور اسلام کی اصل روح بارے جذباتی واقع ہوئے تھے، اگر اس کے مقابلے میں معمولی سمجھ بوجھ سے بھی کام لیتے تو فوراً بھانپ جاتے کہ کوفہ کے لوگوں کی طرف سے جوش و خروش سے حمایت کا یقین دلانا صرف وقتی ابال تھا۔ وہ ایک متوکل تھے، یعنی انہوں نے پورے معاملہ کی چھان بین کرنے کی بجائے فوراً ہی لوگوں کی زبان پر توکل، یعنی تکیہ کر لیا۔ وہ بھول گئے کہ وعدہ کرنا ایک بات ہے، مگر اس وعدے کی بنیاد پر ہتھیار اٹھائے، ہمت باندھ کر اسے پورا کرنا، قطعی طور پر الگ چیز ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ مسلم جذبات میں بہہ گئے اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر اس چیز پر یقین کر بیٹھے، جو ان کے دل میں تھا۔ جس چیز کی انہیں چاہ تھی، جو وہ ممکن ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

جیسے مسلم، ویسے ہی کوفہ کے باسیوں کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ معاویہ کے طویل دور میں جس طرز کی حکمرانی عراق میں جاری رہی، گورنر نے جس طرح انہیں دبا کر رکھا تھا، معاویہ کے گزر جانے کے فوراً بعد عوام میں ایک دم امید پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ جوش جذبات میں بہہ گئے اور ایسے میں ان کی نظر میں حسین علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو قیادت سنبھال کر انہیں اس جبر و استعداد اور ناانصافی سے چھٹکارا دلا سکے۔ لیکن بات یہ ہے کہ امید جس قدر عمدہ خیال ہے، اس کا تصور اتنا ہی دقیق ہوتا ہے، ذرا سی مشکل آنے پر یہ فوراً، بھک سے کافور بھی ہو سکتا ہے۔ کوفیوں کو اپنے گھر بار کا خیال بھی رکھنا تھا، بچے پالنے تھے، معاش اور گزران کا بھی سوچنا تھا اور اپنی حفاظت بارے بھی پریشان تھے۔ معاویہ کے بعد یزید کا پہلا حکم ہی عراقیوں کے بارے جاری ہوا تھا۔ کوفیوں کو اب جا کر زمینی حقائق کا واقعی ادراک ہوا کہ کچھ بھی نہیں بدلا اور ایسے حالات میں پہلے کی ہی طرح بسر کرنے میں ہی عافیت ہے۔ کسی بھی امید پالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دراصل، ان کو دبا کر رکھنے والی قوتیں امید کی اس باریک کرن سے کہیں برتر تھیں۔

عراق کا گورنر یعنی زیاد کا بیٹا عبید اللہ پہلے ہی جابر اور سخت طبیعت مشہور تھا۔ یزید نے اس کا عہدہ برقرار رکھا تھا اور حکم جاری کیا تھا کہ ممکنہ طور پر اٹھنے والی کسی بھی بغاوت کو سختی سے کچل دے۔ یہ شہ ملتے ہی عبید اللہ اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ سخت دلی کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ اپنے باپ کی ہی طرح وہ بھی خود کو صحیح معنوں میں اپنے باپ کا بیٹا ثابت کرے گا۔ زیاد کی ہی طرح بلکہ کسی بھی زمانے میں جابر اور ستم شعار حکمران کی طرح، عبید اللہ کو اس بات کی پوری سمجھ تھی کہ امید بھلے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس طرح کی کسی بھی امید کی روشنیوں کو کیسے گل کیا جا سکتا ہے، تحریک کیسے ختم ہو۔ لوگ جانتے تھے کہ عبید اللہ کسی بھی صورت حسین علیہ السلام کو کوفہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔ خفیہ پولیس، جاسوسوں کا نیٹ ورک، انتہائی سخت جان فوج اور عبید اللہ کی طبیعت، یہ سب جمع کریں تو کوفہ کا بچہ بچہ جان گیا کہ حسین علیہ السلام کا اس شہر میں داخل ہونے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس بات کا ثبوت یوں سامنے آیا کہ جیسے حسین علیہ السلام کوفہ میں جیتے جی داخل نہیں ہو سکتے، مسلم بھی زندہ اور صحیح سلامت شہر سے باہر نہیں جا سکیں گے۔

'خواہ مخواہ خود کو ہلاکت میں مت ڈالو' عبیداللہ نے کوفیوں کو مخاطب کر کے کہا، 'اگر تم میں سے کسی نے اس شخص کو پناہ دی تو یاد رکھو، تمہارا وہ حال کیا جائے گا جو تم نے خود اپنے لیے کمایا ہو گا'۔ یوں، گاجر اور چھڑی کے قصے میں لوگوں کو چھڑی دکھادی اور گاجر کا یہ ہوا کہ اسی اعلان میں مسلم کی اطلاع دینے یا حوالگی پر ان کے سر کی بھاری قیمت بھی مقرر کر دی گئی۔

کوفہ میں کسی کو ذرہ برابر شک نہیں تھا کہ اگر نافرمانی کی تو چھڑی کیسے چلے گی۔ عبیداللہ کے ہاتھوں انجام کیسا دردناک ہو سکتا ہے۔ ماضی میں کئی بار ایسا ہوا کہ جس شخص نے بھی اسے ناخوش کیا، اس کو بیچ چوراہے میں، جہاں اونٹوں کی منڈی لگا کرتی تھی، پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ لاش کئی ہفتوں تک یہی ٹنگی سڑتی رہتی اور صرف اس شخص نہیں بلکہ اس کے رشتہ داروں کے بھی گھر مسمار کر دیے جاتے۔ پورے کے پورے کنبے کو شہر بدر کر کے صحرا میں پھینک دیا جاتا اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا تھا۔ وہ بارہ ہزار جنگجو جنہوں نے جوش خروش میں مسلم کی سپہ سالاری میں حسین علیہ السلام کے جھنڈے تلے لڑنے کا وعدہ کیا تھا، اس اعلان کے بعد ایک دم ان کی تعداد گھٹ کر پہلے چار ہزار ہوئی، پھر تین سو رہ گئے اور ایک دن ایسا آیا کہ مسلم کے ساتھ صرف چند لوگ ہی کھڑے تھے۔ جب یہ حال دیکھا تو اگلے ہی دن وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے اور بھرے پرے شہر کوفہ میں مسلم اکیلے رہ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلم کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ شہر بھر میں چھپتے چھپاتے، پاپیادہ پھر رہے تھے۔ راستے میں لوگوں کو روک کر مدد مانگتے تھے اور مدد تو در کنار، پینے کو پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ جس دروازے پر جاتے، وہ بند ہی ملتا اور بار بار کھٹکھٹانے پر بھی کوئی باہر نہ نکلتا۔ عبیداللہ کی خفیہ پولیس کا ایسا ڈر تھا کہ لوگ پناہ تو دور کی بات، انہیں نظر اٹھا کر دیکھنے سے بھی گریزاں تھے۔ پھر ایک دن، اچانک ایک دروازہ کھل ہی گیا اور ان لوگوں نے مسلم کو اندر بلا کر چھپا لیا۔ مسلم کی جان میں جان آگئی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس شخص نے انہیں بچانے کے لیے نہیں بلکہ بیچنے کے لیے پناہ دی تھی۔ وہ مسلم کو عبیداللہ کے حوالے کر کے انعام حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اسی شام عبیداللہ کے سپاہی گرفتار کرنے آئے تو اس وقت تک مسلم نے کسی نہ کسی طرح، ایک انتہائی

جرات مند شخص کو پیغام رسانی پر آمادہ کر لیا تھا۔ اسے تاکید کی تھی کہ وہ فوراً روانہ ہو جائے اور رکے بغیر، دن اور رات سفر کرے۔ سیدھا حسین علیہ السلام کے قافلے سے جا ملے اور حسین علیہ السلام کو بالمشافہ ملے اور خود یہ اطلاع پہنچائے۔ 'حسین علیہ السلام سے کہو کہ وہ واپس لوٹ جائیں' مسلم نے کہا تھا، 'انہیں بتاؤ کہ کوفیوں نے مسلم سے جھوٹ بولا تھا اور وہ انہیں بھی دغا دیں گے'۔

جب مسلم کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر گورنر کے محل کی طرف لے جایا جا رہا تھا، یہ قاصد اس وقت تک شہر سے نکل کر صحرا میں گھوڑے پر سوار، سرپٹ حجاز کی طرف دوڑ رہا تھا۔ مسلم کا انجام کیا ہو گا؟ یہ بات مسلم، مسلم کا قاصد اور پورا شہر کوفہ بخوبی جانتا تھا۔ 8 ستمبر 680ء کو سوموار کے دن شام کے اندھیرے پھیلتے ہی کوفہ میں اگر اب تک یزید کے خلاف بغاوت کی کوئی امید باقی بھی تھی تو وہ گل ہو گئی۔ اگلی صبح، جب حسین علیہ السلام اپنے خاندان اور خیر خواہوں کا مختصر قافلہ لیے مکہ سے عراق کے لیے نکل رہے تھے، کوفہ میں مسلم کی سر کٹی لاش زمین پر گھسیٹ کر اونٹوں کی منڈی میں لائی گئی اور اسے عبرت کا نشان بنا کر بیچ چوراہے میں لٹکا دیا گیا۔

قاصد نے کوفہ کا حال اور مبینہ طور پر مسلم کا انجام من و عن سنا دیا۔ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ صحرا کے قبائلی جنگجو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر چپ چاپ، ایک ایک کر کے کھسکنے لگے اور قافلے کا ساتھ چھوڑ گئے۔ آخر میں حسین علیہ السلام، ان کا خاندان اور وہی بہتر جنگجو باقی رہ گئے جو ان کے ساتھ مکہ سے چلے تھے۔ حسین علیہ السلام کی یہ مہم شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو چکی تھی۔ اگر یہ حالات دیکھ کر حسین علیہ السلام نے ایک لمحے کے لیے بھی پلٹ کر واپس لوٹ جانے کے بارے سوچا تھا تو اس کا تاریخ میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

ہاں، یہ روایت ضرور ملتی ہے کہ حسین علیہ السلام نے کہا، 'ہر شخص نامعلوم راستوں پر سفر کرتا ہے اور اس کی انجانی منزل اس کی طرف بڑھتی رہتی ہے'۔ چنانچہ اگلی صبح انہوں نے سفر جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔

تنازعہ اس بات پر نہیں ہے کہ تب واقعہ کیا ہوا، اصل جھگڑا تو یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ تقریباً سمجھ سے

باہر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سوال کے جواب کا دار و مدار حسین علیہ السلام کی سوچ پر ہے۔ یعنی، وہ کیا سوچ رہے تھے ؟

آخر حسین علیہ السلام نے یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ ان کی مہم ناکام ہو چکی ہے، سفر کیوں جاری رکھا؟ کیا وہ اپنے حق خلافت پر دعویٰ کی سچائی پر اس قدر قائل تھے کہ زمینی حقائق کو ہی بھلا بیٹھے ؟ وہ اپنے نسب، یعنی بزرگی اور عالی شان مقام پر اور نسبت پیغمبری کی وجہ سے اس قدر صالحیت اور دھن میں مبتلا ہو گئے تھے کہ انہیں اپنے مقصد، یعنی خلافت اور امت کے تصور کو دوبارہ زندہ کرنے کے سوا کوئی دوسری شے نظر ہی نہیں آرہی تھی ؟ یا پھر کیا وہ اپنے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور غیرت کے بے پناہ احساس کے ہاتھوں پچھڑ گئے ؟ اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے سادہ واقع ہوئے تھے ؟ کیا ان کا یہ فیصلہ مایوسی، غیر متوقع نتائج پر نراس کا نتیجہ تھا یا وہ واقعی یوں بے یار و مددگار، بیچ صحرا میں بے دردی سے قتل ہو کر دنیا کا سب سے انوکھا احتجاج ریکارڈ کروانے کا ارادہ رکھتے تھے ؟ کیا وہ اس طرح کٹ کر اسلام کے آفاقی پیغام کو واقعی امر کرنا چاہتے تھے ؟ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا حسین علیہ السلام کا یہ فیصلہ غیرت کا تقاضا تھا، محض حماقت تھی یا وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر، فہم اور فراست کی انتہاؤں کو پار کر کے، آگے بڑھ رہے تھے ؟

حسین علیہ السلام جنگجو تھے اور نہ ہی انہیں امور سیاست سے رغبت تھی۔ وہ ایک عالم تھے۔ حسن کے بعد ان کی علمی حیثیت بارے یہ مشہور تھا کہ دنیا میں وہ واحد شخص ہیں جو واقعی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو اصل معنوں میں سمجھتا ہے، امت اور اسلام کے الہامی پیغام کی روح کو جانتا ہے۔ اب ان کی عمر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ تو پھر آخر مکہ اور مدینہ میں ہی آرام سے، سکون اور اطمینان کے ساتھ بسر کیوں نہ کی ؟ ان کے بعد شیعہ کے اماموں نے جس طرح خود کو ریاست کے امور سے الگ کر لیا، آخر وہی کام حسین علیہ السلام نے کیوں نہ کیا؟ انہیں کس بات کی بے چینی تھی ؟ یہی نہیں بلکہ آخر انہیں کیا سوجھی تھی کہ اپنی قسمت کوفیوں کے ہاتھ میں دے دی، کیا یہ وہی لوگ نہیں تھے جنہوں نے بیس سال پہلے علی کے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا؟ انہوں نے تو علی کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ حسن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ اس بات کو بھی چھوڑیے کہ اس بات کو تو اب بیس سال ہونے کو آئے تھے۔ بیس سال تک وہ معاویہ اور ان کے مقرر کردہ گورنر زیاد

کے زیر حکومت رہے اور اب ان پر یزید اور عبید اللہ کا حکم چلتا تھا۔ کیا حسین علیہ السلام واقعی یہ سمجھتے تھے کہ وہ بدل چکے ہوں گے؟ کیا ان کی سوچ کے مطابق ان حالات میں بھی حق اور انصاف کی بات جبر اور طاقت کے سامنے کھڑی رہ سکتی ہے؟ یا کیا وہ اس خیال خام میں گم تھے کہ یہ ستر، بہتر مسلح فدائی یزید کی منظم فوج کو واقعی شکست دے سکتے ہیں؟

سنی علماء کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک حسین علیہ السلام کا عراق کی جانب سفر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک وسیع سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ناموزوں امیدوار تھے۔ وہ ان کے اس منصوبہ اور نتیجے میں پیش آنے والے سانحے کو بدقسمتی ہی گردانا کریں گے۔ ان کا یہ عزم حد سے زیادہ رومان پسندی کی عملی تصویر ٹھہرے گا۔ ان کے مطابق یہ ایسی مہم تھی جس کی کوئی صورت، سر پیر نہیں تھا بلکہ اس کی چنداں ضرورت ہی نہیں تھی۔ حسین علیہ السلام کو بجائے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے تھا، محتاط رہتے اور تاریخ کے سامنے سرنگوں ہو جاتے۔

اس ضمن میں سنی آگے چل کر شیعہ کے سخت مخالف عالم دین، ابن تیمیہ کا حوالہ دیں گے جن کی تصنیفات آج بھی سنی مکتب فکر کا محور سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی باتیں، آج سنی آبادیوں کے دماغ میں پختہ ہو کر سختی سے بیٹھ چکی ہیں۔ ابن تیمیہ نے لکھا تھا کہ 'ایک جابر حکمران تلے ساٹھ سال بسر کرنا، کسی نا اہل شخص کی ایک رات کی حکومت سے بہتر ہے'۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ غیر موثر انداز میں چلائی جانے والی ریاست میں اسلامی قوانین کا اطلاق تو دور کی بات، ان کا پھلنا پھولنا بھی تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ان کی اسی دلیل کو آگے بڑھائیں تو وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ جیسے پہلے ہوتا تھا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں رہا کرتا تھا، اب ریاست اور مذہب ایک ہی چیز اور ایک جیسے بھی نہیں رہے۔

'خلفائے راشدین' کی اصطلاح ابن تیمیہ کی ہی ایجاد کردہ ہے۔ مراد یہ تھی کہ یہ چاروں یعنی ابو بکر، عمر، عثمان اور علی سیدھی راہ پر چلائے ہوئے یا سکھلائے ہوئے تھے۔ ان کے بعد آنے والا کوئی بھی خلیفہ صحیح معنوں میں قران اور رسول کی تعلیمات کی بنیاد پر خلافت قائم نہیں کر سکا یا دوسرے لفظوں میں کہیے تو ان چاروں کے بعد کوئی بھی حکمران حق و انصاف کی رو سے، رسالت کے معیار یا ربانی لحاظ سے اہل نہیں تھا۔

چاہے اس کے بعد کتنا ہی پارسا، نیکوکار اور اسلام کا خیر خواہ، سمجھ رکھنے والا شخص حکمران بن جائے یا کئی ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے خود اپنے لیے 'زمین پر خدا کا سایہ' وغیرہ جیسے خطاب منتخب کیے مگر وہ بہر حال 'راشد خلیفہ' نہیں ہو سکتے اور اس کا دور 'خلافت راشدہ' نہیں کہلائی جا سکتی۔ ابن تیمیہ کے مطابق حکومت چلانے کے لیے یا خدمت اسلام کے لیے یہ قابلیت، یعنی روحانی طور پر سدھایا ہونا کوئی اتنی ضروری چیز بھی نہیں تھی۔ معاویہ کی ہی مثال دیکھ لیں، انہوں نے انتہائی بدتر حالات میں خلافت سنبھالی اور اگرچہ وہ روحانیت پسند نہیں تھے مگر پھر بھی انہوں نے کمال مہارت سے وسیع و عریض سلطنت اسلامی کو بکھرنے سے بچا لیا جس کے بچنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مزید لکھتے ہیں کہ اگر معاویہ جیسا قابل شخص نہ ہوتا تو شاید اسلام کا آج دنیا میں کوئی نام لیوا بھی نہ ہوتا۔ معاویہ کے بیٹے یزید بارے ان کا خیال یہ ہے کہ انہیں اعتراف ہے کہ اس میں اپنے باپ جیسی سیاسی سمجھ بوجھ نہیں تھی مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس نے بہر حال کبھی مذہبی یا روحانی بالادستی کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اسے اس بات سے کوئی رغبت بھی نہیں تھی اور بحیثیت حکمران، اس کی حکمرانی کو اس طرح قابل برداشت کہا جا سکتا ہے۔ ابن تیمیہ کا کہنا یہ تھا کہ سیاسی رہنماؤں سے روحانی ہدایت یا رہبری کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ ان کا کام تو صرف امور مملکت کو احسن طریقے سے چلانا ہوتا ہے، چاہے وہ اس مقصد کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کر لیں۔ بھلے وہ جبر اور ظلم کا ہی سہارا کیوں نہ لیں، معاملات ٹھیک طریقے سے چلتے رہنا زیادہ اہم ہے۔ اپنے نکتہ نظر میں یہاں پہنچ کر ابن تیمیہ اپنی پہلی بات یعنی جابر حکمران تلے ساٹھ سال بسر کرنا وغیرہ کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں اور یہ فکر کا ایک چکر بن جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ امویوں اور ان کے بعد آنے والے عباسیوں کے ادوار اور طرز حکومت کے نتیجے میں ایک نئی مذہبی حاکمیت نے جنم لیا۔ اس مذہبی حاکمہ کی اکائی، یعنی علم دین کے اس طور پہنچنے والے ماہر کو 'عالم' یا اسم 'علامہ' کہا جاتا ہے جس کی روش جیسے عیسائیت میں پادریانہ، ویسے ہی اسلام میں ملائیت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ جوں جوں وقت کے ساتھ اسلامی سلطنت کا مرکزی سیاسی ڈھانچہ کمزور ہوتا گیا، علماء کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ حاکمہ دین اسلام کے دربان بن گئے۔ ان کی مثال ربی سکالروں جیسی ہی کہلائی جا سکتی ہے جو صدیوں سے ایک دوسرے الہامی مذہب یعنی یہودیت اور یہودی ریاست کے تصور کی عمارت پر پہرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ حسین علیہ السلام کا یہ سفر، یعنی

صرف روحانیت اور سماوی سوچ کے بل بوتے پر آگے بڑھنا، آخر کار بڑھتے بڑھتے ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کے یہاں قابل ملامت، سمجھ سے باہر اور منطق کی رو سے احمقانہ بات ٹھہر گئی ہے۔

دوسری طرف شیعہ ہیں۔ ان کے یہاں حسین علیہ السلام کا سفر عراق جرات اور بہادری کی بہترین مثال ہے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، قربانی کے جذبے سے سرشار، اپنے پورے ہوش و حواس میں، نتائج سے بخوبی آگاہ ہوتے ہوئے بھی آگے بڑھتے گئے۔ شیعہ کے مطابق حسین علیہ السلام کے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جان قربان کر کے امویوں کے ظلم اور جبر، بد عنوانی اور ہوس زر اور دنیا، اقتدار کی حرص کو بے نقاب کر دیں۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں گے اور انہیں گمراہی سے نکل کر اسلام کی سیدھی راہ پر چلنے کی وہ سوچ عطا کریں گے جو کبھی خود پیغمبر کا مقصد رہا کرتا تھا۔ وہ سوچ جو زمانے کی دھول، خلافت اور ملوکیت کے چکر میں گم ہو کر رہ گئی تھی، دوبارہ زندہ کریں گے۔ اہل بیت کے آخری چشم و چراغ کی یہ ادا رہتی دنیا تک دین اسلام اور امت کے تصور کو امر کر دے گی۔ شیعہ کے نزدیک حسین علیہ السلام روحانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں، الہام کے پیارے ہیں۔ وہ الہام کی سربلندی کے لیے اپنی جان بالکل ویسے ہی قربان کر دیں گے جس طرح تقریباً چھ سو برس پہلے ایک پیغمبر عیسیٰ، سولی پر چڑھ گئے تھے۔ یہ بعینہ ویسی ہی مقدس قربانی ہے، اپنی مرضی سے دوسروں کی، رہتی دنیا کی بھلائی کے لیے اپنی جان کا زیاں بھی قبول کر لیں گے۔ حسین علیہ السلام کی موت بالآخر نجات کا پیمان بن جائے گی اور دین اسلام کی آزادی کا نعرہ کہلائے گی۔

اسی نکتہ نظر کے تحت حسین علیہ السلام کی کہانی جلد ہی شیعہ اسلام کی بنیاد بن جائے گی۔ شیعہ اس سانحہ کو دین اسلام کی خدمت کا معیار مقرر کر دیں گے اور اس واقعہ سے شوق کشید کیا کریں گے۔ اسے الہامی پیغام کی نسبت جوش اور جذبے کا تول بنا لیں گے۔ مکہ سے عراق کی جانب یہ طویل سفر بالآخر شیعہ کے یہاں اگت سمنی کی طرح مشہور ہو جائے گا۔ گت سمنی سے مراد یروشلم کا وہ باغ ہے جس میں عیسیٰ کو دھوکا دیا گیا تھا۔ عیسائیت میں اسے اذیت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کوفیوں نے دغا دے دیا ہے، انہوں نے پرواہ کیے بغیر پھر بھی یہ سفر جاری رکھا۔ اس سفر کے آخر میں موت تھی، گت سمنی میں عیسیٰ کو بھی پتہ

تھا، شیعہ کہیں گے کہ حسین علیہ السلام بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے، مگر پھر بھی چلتے ہی رہے۔

مکہ سے روانہ ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے اور ان کا قافلہ کوفہ سے بیس میل کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ رات گزارنے کے لیے قادسیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عمر کے دور میں فارسی افواج کے خلاف حتمی لڑائی لڑی گئی تھی۔ وہ تابناک فتح اب کسی اور ہی زمانے کی بات لگتی تھی، جیسے کوئی ماضی کی الف لیلوی داستان ہو۔ حالانکہ یہ صرف تینتالیس برس پہلے کا واقعہ تھا۔ اس بابت سوچیں اور موازنہ دوسرے الہامی مذاہب سے کیا جائے تو لگتا ہے جیسے خلافت صدیوں کا سفر برسوں میں طے کر گئی ہے۔ خیر، یہاں لڑائی نہیں ہو گی۔ اس قصے کا انجام یہاں نہیں لکھا جائے گا۔ عبید اللہ نے گھڑ سواروں کی کئی ٹکڑیوں کو کوفہ کے آس پاس مضافاتی علاقے میں تعینات کر دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کوفہ جانے والے تمام راستوں پر پہرہ بٹھا کر بند کر دیا جائے۔ وہ راستہ جو قادسیہ سے ہو کر کوفہ جاتا تھا، اس پر بھی یہ گھڑ سوار چوکنا کھڑے تھے۔ گورنر کا حکم تھا کہ حسین علیہ السلام کو زنجیروں میں جکڑ کر اس کے دربار میں پیش کیا جائے تاکہ وہ خود، بنفس نفیس اپنے ہاتھ پر یزید کے لیے حسین علیہ السلام کی بیعت لے سکے۔

لیکن حسین علیہ السلام کو ابھی زنجیروں میں نہیں جکڑا جائے گا۔ عبید اللہ کا دبدبہ تھا مگر اسے پتہ چل جائے گا کہ ہر شخص اس سے دبنے والا نہیں ہوتا۔ سو گھڑ سواروں کی یہ ٹکڑی جس نے قادسیہ سے ہو کر جانے والا راستہ روک رکھا تھا، اس کا سپہ سالار حر تھا۔ حر کا مطلب آزاد یا آزادی نژاد کے ہیں۔ حر اپنے نام کی لاج رکھے گا اور عبید اللہ کے احکامات کو پس پشت ڈال کر پیغمبر کے نواسے کے خلاف طاقت کے استعمال سے انکار کر دے گا۔ یہی نہیں بلکہ وہ امن کی خواہش دل میں لیے حسین علیہ السلام سے بات کرنے آگے بڑھے گا تو معنی خیز انداز میں اپنی ڈھال بھی نیچی کر لے گا۔ حر نے بھی انہی کی طرح، خیر خواہوں کی طرح، جو پچھلے تین ہفتوں سے حسین علیہ السلام کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے بھی اپنے تئیں سعی کی۔ اس نے کہا کہ اگر وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی مگر خدا کے واسطے، وہ آگے نہ بڑھیں۔ اس کی بات مان لیں اور مکہ واپس لوٹ جائیں۔

'اللہ کی قسم، ہرگز نہیں!' جواب آیا، 'میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے خود کو ذلیل کروں گا اور نہ ہی

ایک ڈرپوک غلام کی طرح فرار کا راستہ اختیار کروں گا۔ مجھے یزید نہ سمجھو۔ میں حسین علیہ السلام ہوں جو مرتبے پر سودا نہیں کر سکتا اور ہرگز تذلیل کا راستہ اختیار نہیں کرے گا'۔ پھر اپنے مرتبے، قدر و منزلت کا مظاہرہ کرنے کے لیے حسین علیہ السلام اپنے گھوڑے کی کاٹھی پر تن کر بیٹھ گئے اور حر کے آدمیوں سے خطاب کیا۔ ان میں سے زیادہ تر وہ کوفی تھے جنہوں نے اس سے پہلے ان کی رہنمائی میں یزید کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا وعدہ کیا تھا مگر اب اپنی بات سے پھر چکے تھے۔

'میرے پاس تمہارے بھیجے ہوئے خطوط سے بھرے دو تھیلے ہیں!' حسین علیہ السلام نے زور دار آواز میں کہا، 'تمہارے بھیجے ہوئے قاصدوں نے تمہاری خیر خواہی اور وفاداری کا عہد پہنچایا تھا اور اگر تم اب اپنے عہد پر قائم رہو تو یقیناً سیدھے راستے پر گامزن ہو گے۔ میری زندگی، تمہارے ساتھ گزرے گی۔ میرا خاندان، تمہارے خاندانوں کے ساتھ ہو گا۔ لیکن اگر تم نے اپنا عہد و پیمان بھلا دیا ہے تو تم نے اپنی بد قسمتی کو دعوت دی ہے اور منزل کھو چکے ہو۔ یاد رکھو، آج جو اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکا وہ کسی اور کا نہیں بلکہ اپنی روح اور ضمیر کا غدار ہے'۔

یزید اور عبید اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، 'لوگو خبر دار ہو جاؤ! دنیا سے اچھائی اٹھ رہی ہے اور جو کبھی اچھائی تھی، آج برائی میں ڈھل چکی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھ سکتے کہ سچائی کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے؟ برائی کا زور بڑھتا ہی جا رہا ہے اور کوئی اس کے سامنے کھڑا نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی، میں ان جابروں اور ظالموں کے تلے، دب کر گزاری جانے والی زندگی کو آفت اور اذیت سمجھتا ہوں۔ ایسی زندگی پر لعنت، میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔ شہادت کو فوقیت دینا پسند کروں گا!'

انہوں نے کہہ دیا۔ انہوں نے بالآخر کہہ ہی دیا۔ پہلی بار اپنے منہ سے 'شہادت' کا نام لے لیا جس کا وہ ارادہ باندھے ہوئے تھے۔ اس کو وہ اپنی منزل بنا چکے تھے، جس تک پہنچنے کے لیے انہوں نے یہ طویل سفر اختیار کیا تھا۔ شہادت کی موت بھی انہیں مایوس نہیں کرے گی، وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ جو لفظ 'شہادت' ہے، اس کے بھی کئی معنی ہیں۔ جس طرح لفظ 'جہاد' کے کئی مطلب نکلتے ہیں،

شہادت کا بھی یہی قصہ ہے۔ ان دونوں الفاظ کی اصل روح کو اس وقت، اس کہر زدہ منظر نامے میں دیکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے جب اسلام کے نام پر شہادت سے مراد خود کش بمباری لی جاتی ہے یا ریاستی و غیر ریاستی عناصر کے ہاتھوں اسے بے دریغ قتل عام کا جواز قرار دیا جاتا ہو۔ مطلب یہ کہ پارسائی اور انصاف کے نام پر، سچائی کی اکڑ اور نیکوکاری کی دھن میں دھت ہو کر خود کو اور کئی دوسروں کو ہلاک کر کے سمجھتے ہیں کہ شاید قربانی دیتے ہیں یا جدوجہد کرتے ہوں۔ مگر اصل میں وہ انسانیت کی اساس کو ہی بھلا دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ شہادت کے معنی 'خود کو قربان' کرنے کے ہی ہیں، مگر وہیں شہادت کا مطلب 'گواہی دینے' بھی تو ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لفظ کے انگریزی زبان میں بھی دو ہی مطلب نکلتے ہیں۔ انگریزی میں 'شہید' کے لیے جو لفظ 'martyr' استعمال کیا جاتا ہے، اس کا ماخذ یونانی زبان ہے۔ یونانی زبان میں اس لفظ کے معنی 'گواہ' کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان لانے یا کلمہ توحید کو 'کلمہ شہادت' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات، ایمان لانے یا یقین کرنے کا اظہار ہیں۔ یہودیوں کے یہاں بھی، قدیم کتاب مقدس، یعنی تورات میں شمع کا جو حصہ ہے، اس کی پہلی دو آیات میں بھی ایمان لانے یا یقین کے اظہار کو عبرانی زبان میں 'شہادۃ' کہا گیا ہے جس سے مراد 'گواہی دینا' یا 'تائید کرنا' ہے۔ دونوں عقائد کی روح سے 'شہادت' کا مطلب 'گواہی' کے ہیں یا ان سے مراد 'کلمہ حق کی آواز بلند کرنے' یا اس کی 'تصدیق' ہیں۔ یوں، شہادت کے انہی دوہرے معنوں کے سبب، یعنی 'قربانی' اور 'گواہی یا آواز بلند کرنے' کی وجہ سے 1979ء میں ایرانی انقلاب کے پیچھے کارفرما سوچ اور فکر کو شہ ملی۔ اس سوچ کے خالق نے انتہائی خوبصورتی سے حسین علیہ السلام کی موت کو 'حریت پسندی' کی آواز بنا کر پیش کر دیا۔

گماں غالب ہے کہ آج مغرب اور مشرق میں بھی کئی جگہوں پر علی شریعتی کے نام سے شاید ہی لوگ واقف ہوں مگر یہ وہ ہیں جنہیں ایران میں تقریباً آیت اللہ خمینی کی ہی طرح عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ شریعتی کوئی عالم دین نہیں تھے بلکہ سوشیالوجی یا عمرانیات کے پروفیسر تھے۔ علم دین سے دلچسپی تھی اور اس سے جڑی عمرانیات پر خاصی کمان رکھتے تھے۔ انہوں نے فرانس کی مشہور سوربن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے مغربی فلاسفی اور ادب کا بغور مطالعہ کیا، فرانز فانن اور سارتر کے ساتھ ساتھ چی گویرا کی کئی تصنیفات کے فارسی زبان میں تراجم بھی کیے۔ شریعتی کا کمال یہ تھا کہ

انہوں نے عمرانیات اور علم دینیات کو یک جان کر کے اسلامی انسان دوستی کا ایسا تصور پیش کیا جس نے لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا۔ چونکہ وہ ایک جوشیلے اور والہانہ مقرر بھی تھے، اس لیے ان کے تصور کو مقبولیت حاصل کرنے میں پر لگ گئے۔ 1970ء کے اوائل میں انہیں سننے کے لیے ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن ان کا لیکچر ہوتا، ہال کے آس پاس تہران کی گلیوں میں ٹریفک جام ہو جاتی اور معمولات زندگی کٹ کر رہ جاتے۔ ہزاروں لوگ خاموشی سے سڑکوں پر بیٹھے، دور دور تک لگائے گئے لاؤڈ سپیکروں پر انہیں بولتا ہوا سنتے رہتے۔ ان کے کالم اور تقاریر چھپ کر بازاروں میں پہنچتیں تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں اور ہر اشاعت ایک عرصے تک ایران کی مقبول ترین تصانیف کی فہرست میں سب سے اوپر لگی رہتی۔ طالب علم اور مزدور، مذہبی اور سیکولر حلقے، مرد اور خواتین، الغرض جو بھی انہیں سنتا، گرویدہ ہو جاتا۔ شریعتی سے متاثر یہی لوگ بعد ازاں سڑکوں پر نکل آئیں گے اور شاہ ایران کے خلاف تحریک بن جائیں گے۔ اس سے یہ ہوا کہ عوام میں امید اور قوت کی ایک لہر دوڑ گئی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے شریعتی نے تن تنہا، چند برسوں کے اندر ہی شیعہ اسلام کے اہم ترین واقعہ میں پھر سے روح پھونک دی ہے۔

شریعتی ایک انتہائی مقبول لیکچر میں، حسین علیہ السلام کی شہادت کو شہادت کی کسی بھی آمیزش سے پاک، بے داغ اور خالص ترین مثال قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین علیہ السلام نے نہ صرف حاکم وقت کی جبر اور ظلم پر مبنی حکومت کے ساتھ تعاون سے انکار کر دیا بلکہ خاموش رہنے پر بھی مجبور کیے جانے کا دباؤ بھی قبول نہیں کیا۔ بجائے پیچھے ہٹنے کے، انہوں نے آگے بڑھ کر موت کو ترجیح دی اور موت بھی ایسی پائی کہ حقیقی معنوں میں 'شعور کا انقلاب' برپا کر دیا۔ یہ ایسا انقلاب تھا جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے اور تاریخ میں رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ اس کی بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ ان کے الفاظ میں حسین علیہ السلام کی شہادت آزادی اور حریت کا 'ابدی اور ارفع' مظہر بن گئی۔ شریعتی اپنے اسی لیکچر میں سننے والوں کو واپس ساتویں صدی میں لے جاتے ہیں، حسین علیہ السلام کو سوچتا، ان کے دماغ میں چل رہے تفکر سے روشناس کراتے ہیں۔ پھر جب واپس حال میں لوٹ کر آتے ہیں تو انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ دراصل لوگوں کو آج بھی شاہ ایران کی جابرانہ حکومت کی صورت ویسی ہی مشکل کا سامنا ہے جو کبھی حسین علیہ السلام کو درپیش رہی تھیں۔

'حسین علیہ السلام کے پاس ترکہ رکھنے کو کچھ بھی باقی نہیں تھا' شریعتی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گویا ہوتے ہیں، 'کوئی فوج نہیں، ہتھیار نہیں، دولت نہیں، اختیار نہیں، قوت نہیں، یہاں تک کہ ماننے والے پیروکار بھی نہیں رہے تھے۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ امویوں نے سماج کی بنیادوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ غاصبوں کی اصل طاقت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا راج تلوار اور بندوق کے زور پر قائم رکھتے ہیں یا پھر جہاں کچھ نہ بن پڑے یا ضروری سمجھیں، پیسے سے وفاداری خرید لیتے ہیں۔ ان دو حربوں سے وہ عوام کو دبا لیتے ہیں، انہیں چپ کرا دیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے، جب کوئی نہیں بولتا تو پھر طاقت کا منبع جابر حکمران کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ ایسی مملکت میں خیالات اور نظریات کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ دماغوں میں خناس بھر دیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی باتوں کا پرچار شروع ہو جاتا ہے، سکولوں اور مدرسوں میں یہی جھوٹ بولا اور پڑھایا جاتا ہے، لوگوں کو دن رات یہی بکواس سننے کو ملتی رہتی ہے۔ دین کے نام پر ایسی خرافات عام ہو جاتی ہیں کہ اللہ کی پناہ، قوم کی اجتماعی سوچ شل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جہاں اوپر بیان کردہ کوئی بھی حربہ نہ چلے تو پھر آخری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایمان اور یقین کا گلا کاٹنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ یزید نے یہی فیصلہ کیا تھا اور حسین علیہ السلام کی اصل طاقت یہی تھی۔ اسی واحد اور آخری طاقت، یعنی ایمان کے ساتھ وہ میدان میں اتر گئے اور ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے'۔

'یہ وہ آدمی ہے جو ان اقدار کو اپنائے ہوئے تھا جو کب کی تباہ، گم کر دی گئی تھیں۔ یہ ان لوگوں کے نقش قدم پر چل رہا تھا جن کی یاد تک محو ہو چکی تھی۔ وہ خالی ہاتھ نکلا اور اس کے پلے کچھ بھی نہیں تھا۔ امام حسین علیہ السلام اب بے اختیار ہیں، بے بس ہیں اور ان کی دو مجبوریاں تھیں۔ وہ ہرگز چپ نہیں رہ سکتے تھے لیکن وہ لڑنے سے بھی قاصر تھے۔ ایسی مظلومیت میں بھلا وہ کیا کرتے؟ ان کے پاس صرف ایک ہتھیار تھا اور وہ ہتھیار موت ہے۔ اگرچہ وہ دشمن کو شکست نہیں دے سکتے تھے مگر کم از کم اسے رسوا تو ضرور کر سکتے ہیں؟ وہ مر کر اسے بے عزت تو کر سکتے ہیں؟ اس کی قلعی تو کھول ہی سکتے ہیں؟ اگرچہ وہ جابر حاکم کو زیر نہیں کر سکتے مگر وہ اس کو ملامت تو کر سکتے ہیں؟ حسین علیہ السلام کے لیے شہادت گھاٹے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ تو ان کا انتخاب ہے۔ وہ خود کو قربان کر کے آزادی کی دہلیز پر مستقل نام لکھوا دیں گے۔ آزادی ان کے نام کا آستانہ بن جائے گی۔ وہ ہار کر بھی جیت جائیں گے'۔

ملاحظہ کیجیے کہ جوں جوں شریعتی آگے بڑھ رہے ہیں، شہادت کے معنی صرف 'گواہی' نہیں رہتے بلکہ یہ آہستہ آہستہ 'کشف' کا روپ ڈھالتی جارہی ہے۔ جبر اور استبداد، بدعنوانی اور جور ظلم کو بیچ چوراہے میں ننگا کر رہی ہے۔ حسین علیہ السلام کی شہادت ان کا خاتمہ نہیں بلکہ نکتہ آغاز بن چکا ہے۔ ان کی موت گھروں سے نکل کر عمل پر اکسانے والا نعرے کا روپ دھار رہی ہے۔

'شہادت کی اپنی ایک چمک دمک ہے۔ اس کی صفت تابندگی ہے۔' شریعتی نے اعلان کیا، 'اس سے دنیا میں روشنی اور گرمائش پیدا ہوتی ہے۔ اس سے تحریک جنم لیتی ہے۔ شہادت سے بصارت ملتی ہے، تصور نکلتا ہے۔ امید پھوٹتی ہے۔ شہید مر کر جابر کی مذمت کرتا ہے اور اپنے جیسے دبے ہوئے دوسرے لوگوں کو نئی، روشن راہ دکھاتا ہے۔ لوگوں کے یخ جمے ہوئے دلوں میں زندگی کا گرم خون اور احیاء کی لہر دوڑا دیتا ہے'۔

حسین علیہ السلام کی طرح قربان ہو جانے کا تصور صرف ایک دین یعنی اسلام یا ایک خطے یعنی مشرق وسطیٰ تک محدود نہیں ہے۔ یہ دنیا بھر کے لیے ایک پیغام ہے۔ جہان بھر میں جہاں بھی، جس کونے میں بھی انسان بستے ہیں، ان میں سے ہر انسان کے لیے، ہر دور میں مثال ہے۔ حسین علیہ السلام کا یہ فعل 'جبر اور استعداد کے بوجھ تلے کچلے ہوئے تاریخ کے تمام لوگوں' کی بات ہے۔ پسے ہوئے طبقات کے ہونے کی گواہی ہے اور ان کی دبی ہوئی آواز ہے۔ حسین علیہ السلام قتل کر دیے گئے، مگر مارے نہیں جاسکے۔ وہ ایک سوچ کی شکل میں زندہ ہیں۔ تب سے آج تک دنیا بھر میں جہاں بھی ظلم اور جبر کے خلاف، حریت کے لیے لڑی جانے والی ہر لڑائی میں شریک رہے ہیں۔ وہ ظالم سے نجات کی ہر تحریک کے علم بردار چلے آرہے ہیں اور سارے زمانوں میں جس جگہ پر بھی آزادی کی کوئی جنگ لڑی گئی، وہ اس کے ہراول دستے میں جانباز سپاہی کی طرح ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ حسین علیہ السلام کربلا کے میدان میں قتل کر دیے گئے مگر مارے نہیں جاسکے۔ وہ نسل انسانی میں ہر زمانے کے دبائے ہوئے لوگوں کے لیے حریت کا نام بن گئے'۔

شریعتی 1977ء میں صرف چوالیس سال کی عمر میں چل بسے تھے۔ یہ ایران میں برپا ہونے والے انقلاب سے صرف دو سال قبل کا واقعہ ہے، جب ایران کے کونے کونے میں اور بالخصوص تہران میں شاہ

ایران کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ طالب علم جتھے بنا کر سڑکوں پر نکلتے اور جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شاہی پولیس کے ساتھ بھڑ جاتے، گولیاں چلتیں اوران مظاہروں میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہوتے رہے۔ شریعتی کی موت کا سبب دل کا جان لیوادورہ بتایا جاتا ہے۔انہیں ایران سے جلا وطن کر کے انگلستان میں پناہ لیے ابھی تین ہفتے ہی گزرے تھے کہ موت کی اطلاع آگئی۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی موت شاہ کی پولیس کے ہاتھوں مسلسل ذہنی دباؤ، بار بار کی بے وجہ گرفتاری، قید تنہائی اوراعصاب شکن تفتیش کا نتیجہ تھا۔کئی لوگ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ دراصل شریعتی کو شاہ کی خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے جلا وطنی میں زہر دے کر مارا تھا۔ شاید کوئی انتہائی مہلک، فوری اثر کرنے والا زہر تھا، جسے نوک دار زیر جلد انجیکشن وغیرہ سے علاج کے دوران لگایا گیااور شریعتی کی موت ہوگئی۔اگرچہ ان الزامات کے کوئی ثبوت نہیں ملے مگر زہر کے پراپگنڈہ کی ہوا آگے چل کر یوں بھی چلی کہ شاید یہ زہر کی ان اقسام میں سے کوئی ایک زہر تھا جو ممکنہ طور پر پہلی بار معاویہ کے ذاتی معالج ابن اثل نے چودہ سو برس پہلے دریافت کیا ہوگا۔یہ تو شریعتی کا قصہ ہے مگر ہر دو صورت، شاہ نے بہت دیر کردی۔شریعتی نے اپنی شعلہ بیان تقریروں اور پر مغز لیکچروں کی مدد سے حسین علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کی کربلا میں شہادت کو انقلاب کی بھڑکتی ہوئی، انتہائی منظم تحریک میں بدل کر رکھ دیا تھا۔اب اسے روکنے کا کوئی طریقہ کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔

یہ پہلی بار نہیں تھی۔ صدیوں سے حسین علیہ السلام کی شہادت شیعہ اسلام میں کئی بار اور بیسیوں مواقع پر انقلابی فکر کی بنیاد بنتی چلی آرہی ہے۔یہ اچھائی اور برائی کی ابدی جنگ کا نشان رہا ہے مگر شریعتی نے پہلے بار یہ کیا کہ اسے ایک نئے درجے ،یعنی حریت کی الٰہیاتی فکر اور تحریک بنا دیا۔عاشورہ کے دس دن اس سے پہلے صرف ماتم اور گریہ کے لیے وقف تھے مگر شریعتی نے اس عشرے کو امید اور فلسفہ فعالیت میں ڈھال دیا۔ کربلا سے مراد اب صرف کرب اور بلا نہیں ہوگی، یہ صرف اور صرف ظلم کی علامت نہیں ہے بلکہ کربلا سے امید کشید کی جائے گی۔ یہ تاریخی سانحہ جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نشان بن جائے گا۔ شریعتی آگے چل کر انہی تصورات کی بنیاد پر شیعہ کو نئی راہ دکھائیں گے اور انقلاب پسند نوجوان تہران کی سڑکوں پر بے خوف وخطر نکل کر خوں ریز تحریک کا حصہ بن جائیں گے۔ شاہ کی افواج ان پر بہیمانہ تشدد کریں گی اور گولیوں کی بوچھاڑ ہوگی۔ مگر تحریک رکنے کا نام نہیں لے گی اور اس باڑ میں بھی سڑکوں پر ایک ہی نعرہ سنائی

دے گا، 'ہر دن عاشورہ ہے اور ہر جگہ کربلا ہے'۔ یہ نعرہ آج بھی، عاشورہ کے دس دنوں میں اور جہاں کہیں ظلم برپا ہو۔۔۔سنائی دے جاتا ہے۔

اگرچہ حسین علیہ السلام نے شہادت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر حر کسی بھی صورت یہ طوق اپنے گلے میں نہیں ڈالے گا۔ وہ کسی بھی طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ حر کو ایک عجب صورتحال کا سامنا تھا، بلکہ کہیے اسے دوہری مشکل درپیش تھی۔ ایک طرف تو عبید اللہ کے صاف احکامات تھے مگر دوسری جانب وہ حسین علیہ السلام کی تہہ دل سے عزت کرتا تھا۔ حسین علیہ السلام اہل بیت میں سے آخری چشم وچراغ تھے۔ وہ رسول کے نواسے، ان کا خون تھے۔ حر کسی بھی صورت حسین علیہ السلام کو آگے بڑھنے، کوفہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا مگر وہیں، ان پر حملہ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں قابو کرنا تو دور کی بات، صرف روکنے کے لیے بھی ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ آخر وہ کیا کرے؟ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!

کافی دیر گومگو کی یہی حالت رہی مگر پھر حسین علیہ السلام نے خود ہی حر کی مشکل آسان کر دی۔ وہ یہاں نہیں رکیں گے، وہ آگے کوفہ کی جانب بھی نہیں بڑھیں گے اور مکہ کی طرف تو ہرگز لوٹ کر نہیں جائیں گے۔ انہوں نے یہاں سے وہ راستہ اختیار کیا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے قافلے کو شمال کی جانب، صحرا میں روکھے اور پتھریلے علاقے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بنجر علاقہ تھا جہاں کھڑے ہوں تو آنکھوں کے سامنے ایک وسیع وادی نظر آتی ہے۔ اس ہموار، میدان جیسی وادی میں دجلہ اور فرات کے دریاؤں کی وجہ سے ہریالی ہے۔ حر اپنی فوجی ٹکڑی سمیت اس چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے حفاظت پر مامور ہو۔ اس کا انداز قطعاً دشمن کو ہدف سے دور لے جانے والا نہیں تھا۔ چلتے چلتے دن ڈھل گیا اور شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ عورتیں اور بچے تھک کر چور تھے اور پیاس سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ حسین علیہ السلام نے حکم دیا کہ پتھریلی سطح سے ہٹ کر نیچے کی طرف، جہاں فرات کی ایک شاخ بہتی تھی اور سامنے کھیت اور باغات تھے، پڑاؤ ڈال دیا جائے۔ یہ محرم کی پہلی تاریخ اور جمعہ کا دن تھا، حسین علیہ السلام اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا سفر یہیں تمام ہو گا، وہ یہاں سے مزید آگے نہیں جائیں گے۔

دو دن بعد، یعنی محرم کی تین تاریخ کو اس چھوٹی سی خیمہ بستی کو پوری فوج نے گھیر لیا۔ جب عبید اللہ تک

یہ خبر پہنچی کی حر نے بجائے حسین علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے شمال کی جانب سفر کرنے کی اجازت دے دی ہے تواس نے تقریباً چار ہزار گھڑ سواروں اور پیادہ جنگجوؤں اور تیر اندازوں پر مشتمل فوج کوفہ سے روانہ کی۔ لشکر کی سپہ سالاری عمر بن سعد کے ہاتھ میں تھی مگر روانہ کیے جانے والی فوج کی کمان ایک انتہائی بے درد اور سنگ دل جرنیل کے حوالے کی گئی۔ وہ کام جو حر پورا نہیں کر سکا، یہ شخص کرے گا۔

اس شخص کا نام شمر تھا۔ معاویہ، یزید اور عبید اللہ یا ابن زیاد کے بعد یہ چوتھا نام ہوگا جو شیعہ کی تقویمی یاد داشت میں جم کر بیٹھ جائے گا۔ ان چاروں کو شیعہ کے یہاں سے لعن طعن، ملامت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ خیر، شمر کے لیے احکامات صاف تھے۔ وہ یہ کہ حسین علیہ السلام کی خیمہ بستی کا محاصرہ کرلے اور کسی صورت دریا تک پہنچنے نہ دے۔ اتنی سخت ناکہ بندی کرے کہ تپتی ہوئی بلا کی، دم گھونٹ دینے والی گرمی میں اس قافلے کو ایک قطرہ بھی پانی میسر نہ آنے پائے۔ مقصد یہ تھا کہ پیاس سے نڈھال ہو کر حسین علیہ السلام گھٹنے ٹیک دیں گے۔

حسین علیہ السلام کے ساتھ بہتر جنگجو تھے۔ ان کا مقابلہ چار ہزار فوجیوں پر مشتمل انتہائی منظم، تربیت یافتہ اور پوری طرح مسلح لشکر سے تھا، یعنی بچ کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ تو اعداد و شمار کی بات ہے ورنہ حسین علیہ السلام کو اب کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، بچ نکلنے کی حاجت اور نہ ہی کوئی خواہش تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حسین علیہ السلام نے آخری وقت پر ایک انتہائی معقول تجویز پیش کی تھی مگر اب اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب جبکہ وہ اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے، یہ قصہ تاریخ میں نہیں لکھا جائے گا بلکہ تاریخ اس داستان کا حصہ بن جائے گی۔ اس چھوٹی سی خیمہ بستی کے پیاسے، پریشان حال مکین تاریخ کے دھارے میں، وقت کی قید سے آزاد ہو کر امر ہو جائیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کا شمار ابد تک زندہ رہنے والے ہیرو اور غیر معمولی برگزیدگی کے حامل ولیوں میں ہوا کرے گا۔

تاریخ میں اگلے سات دن کا قصہ محاصرہ کرنے والوں اور محاصرین میں سے بچ جانے والے، دونوں نے ہی یادداشتوں کی صورت تفصیل کے ساتھ بیان کر رکھا ہے۔ ان سات دنوں میں پیش آنے والے واقعات کا احوال کھول کھول کر اس طرح سناتے ہیں کہ ایک لمحے کی چُوک نہیں ہوتی۔ ان روایات کا مطالعہ کریں تو

ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے، ریت اور پتھر سے بنی ہوئی اس دنیا سے کہیں بڑے سٹیج پر یہ واقعات فلم کی طرح چل رہے ہیں۔ تب بھی، جب راویوں نے ان سات دنوں کا حال بیان کیا ہے، ان کا طرز بیان ایسا ہے کہ انہیں خوب علم تھا کہ آگے چل کر یہ واقعات مقدس اور متبرک بن جائیں گے۔ صاف نظر آتا ہے کہ کیسے عینی شاہدین کی آنکھوں کے سامنے تاریخ قدرتی اصولوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، حقائق کو ایک طرف رکھ کر کسی دیومالائی داستان کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ ایسی داستان جو رہتی دنیا تک امر ہو جائے گی اور اس کی گونج زمانوں کی آخری حد تک سنائی دے گی۔ یہاں شمر اور اس کے چار ہزار فوجی اس انتظار میں تھے کہ کب حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی پیاس سے نڈھال ہو جائیں تو ان کی ضد کا قصہ تمام ہو، یہ خود کو روک کر کھڑے تھے۔ حسین علیہ السلام کے جنگجو گاہے بگاہے انہیں طیش دلانے کے لیے چھوٹی موٹی جھڑپوں میں الجھاتے رہے۔ اس نوک جھونک کا بھی تاریخ میں حال تفصیل سے ملتا ہے، ایسے جیسے کبھی نہ مرنے والی یاد تخلیق کی جا رہی تھی۔ ان سات دنوں میں، شیعت کی سب سے نمایاں، ایک کے بعد دوسری تمثالی مورت میں زندگی کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ یہ علامتیں ہمیشہ کے لیے امر ہو جانے والے، دیومالائی خاکے تخلیق ہو رہے تھے۔

مثال کے طور پر حسین علیہ السلام کے بھتیجے اور حسن کے بیٹے قاسم کا حال سن لیں۔ ان کی شادی حسین علیہ السلام کی بیٹی سے اسی محصور خیمہ بستی میں ہوئی۔ اس بستی کے مکین جانتے تھے کہ موت ان کے سر پر کھڑی ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے موت کے منہ میں زندگی دوڑا دی۔ انہوں نے مستقبل کو حال میں ڈھال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی شادی تو ہوئی، رخصتی بھی ہوئی مگر دلہا اور دلہن کبھی اکٹھے نہیں ہو پائے۔ جیسے ہی شادی کی تقریب تمام ہوئی، قاسم نے تن تنہا باہر نکل کر دشمن کے ساتھ بھڑ جانے کی اجازت مانگی۔ یہ قاسم کی شادی کا دن تھا، ان کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی شادی کا جوڑا پہنے، تلوار سونت کر باہر نکلے اور شمر کی افواج کی طرف، مسلح صفوں کا رخ کر لیا۔

'جس سمت قاسم نے رخ پکڑا، اس جگہ پر ہم دس لوگ تعینات تھے اور سارے گھوڑوں پر سوار تھے'، شمر کے ایک فوجی نے بعد ازاں بیان دیا، 'ایک نوجوان لڑکا، سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس ہماری

طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ ہمارے گھوڑے اس کو دیکھ کر ہنہنا رہے تھے اور بے چینی میں اپنی جگہ پر کھڑے چکر لگاتے ہوئے، کھروں سے مٹی کھودتے، ہتھے سے اکھڑ رہے تھے۔ وہ لڑکا خاصا گھبرایا ہوا تھا اور پریشانی میں سر جھٹک رہا تھا۔ کبھی دائیں اور پھر بائیں دیکھتا۔ میں نے دور سے اس کے کانوں میں دو بالیاں چمکتی، لہراتی ہوئی دیکھیں'۔ اس کے کانوں میں چمکتی بالیاں زیادہ دیر تک نہیں لہرا سکیں۔ نئے نویلے دلہا کو موقع پر کاٹ کر پھینک دیا گیا اور شادی کے دن کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

پھر عباس ہیں۔ عباس، حسین علیہ السلام کے سوتیلے بھائی تھے۔ وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے اور ان کے سر پر لوہے سے بنا جنگی خود سختی سے ٹکا ہوا تھا۔ اس آہنی کلاہ پر بگلے کے پروں کا اونچا طرہ سجایا گیا تھا جو جری اور بہادر جنگجوؤں کا امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ حسین علیہ السلام کی خیمہ بستی میں پینے کے لیے ایک بوند پانی نہیں بچا تھا۔ چھوٹے بچے پیاس سے بلبلا رہے تھے، روتے تھے اور عورتوں کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ عباس یہ دیکھ کر سخت آوردہ ہوئے اور پوری طرح مسلح ہو کر بکری کی کھال کا کوزہ اٹھائے باہر نکلے اور دشمن کی صفوں میں سے راستہ بناتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ مشکیزے میں پانی بھرا اور واپسی کی راہ لی مگر راستے میں گھات لگا کر دھر لیے گئے۔ وہ تنہا تھے اور مقابلے پر بیسیوں فوجی کھڑے تھے۔ وہ دیر تک دیدہ دلیری سے لڑتے رہے، کئی زخم کھائے اور آخر کار ان کا وہ بازو کٹ گیا، جس سے تلوار چلاتے تھے۔ یہاں پہنچ کر کہا جاتا ہے کہ کٹے ہوئے بازو سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا مگر عباس دشمنوں کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ قہقہہ لگایا اور کہا، 'اسی لیے اللہ نے ہمارے دو بازو پیدا کیے ہیں'۔ جو ہاتھ سلامت تھا، اس میں تلوار تھامی اور پھر سے لڑائی میں جت گئے۔ پانی کا مشکیزہ سینے سے لگائے، مشکیزے کا منہ دانتوں میں دبا کر تھام کر لڑتے رہے۔ جلد ہی دوسرا بازو بھی کاٹ دیا گیا اور اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں مرنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ تلوار جو ان کے سینے میں گھونپی گئی، وہ پہلے پانی کے مشکیزے میں آر پار ہوئی۔ عباس کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور پانی کے ساتھ مل کر زمین پر کافی دیر بہتا رہا اور پھر ریت میں جذب ہو گیا۔ عباس کی لاش کے ارد گرد، چاروں طرف سرخی پھیل گئی۔

پھر حسین علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند کا احوال ہے۔ ان کا نام علی اکبر تھا۔ وہ ابھی بلوغت کی عمر کو ہی

پہنچے تھے اور چہرے پر شباب کی تازگی جھلکتی تھی۔ انہوں نے بھی تن تنہا نکل کر لڑائی کی اجازت طلب کی۔ وہ پیاس سے نڈھال تھے مگر لڑنے کے لیے پرعزم نظر آتے تھے۔ 'ایک نوجوان کو دیکھا جو سیدھا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا روشن تھا، جیسے چاند کا پارہ ہو! 'علی اکبر سے بھڑنے والے فوجیوں میں سے ایک نے روایت کی ہے، 'اس کی چپل ٹوٹی ہوئی تھی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ دائیں پیر کی تھی یا بائیں تھی۔ میرا خیال ہے، بائیں پیر کی تھی'۔

علی اکبر کو چند منٹوں کے اندر ہی انتہائی بے دردی کے ساتھ تلواروں اور برچھیوں کے کئی وار کر کے قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حسین علیہ السلام 'شکرے کی طرح' جھپٹے اور اس سے پہلے کہ گھڑسوار بے حرمتی کرتے، انہوں علی اکبر کا لاشہ بازوؤں میں اٹھالیا۔ شیعہ کے پوسٹروں میں ہمیشہ سے یہ منظر ایسا ہی دکھایا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج اسی طرح کے چند دوسرے پوسٹر عراق کے بازاروں میں عام مل جاتے ہیں جن میں جان بوجھ کر بعینہ حسین علیہ السلام جیسا ہی انداز اپنایا گیا ہے۔ ان پوسٹروں میں لشکر مہدی کے سربراہ مقتدی الصدر اپنے والد صادق الصدر کے لاشے کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صادق الصدر ایک نامی گرامی اور شیعہ میں قابل تعظیم علامہ گزرے ہیں جنہیں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ 1998ء میں، صدام حسین علیہ السلام کی خفیہ پولیس نے قتل کر دیا تھا۔

تاریخ میں کربلا کی جتنی بھی روایات ہیں، شاید ان میں سب سے زیادہ اثر انگیز حسین علیہ السلام کے نومولود بیٹے کی شہادت کا واقعہ ہے۔ اس کی عمر صرف تین ماہ تھی اور اب پیاس اور جسم میں پانی کی شدید کمی کے باعث اس قدر ناتواں ہو چکا تھا کہ حلق سے رونے کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ چلاتا تھا مگر سنائی نہ دیتا، آخر میں تو تھک ہار کر بے سدھ ہو گیا۔ حسین علیہ السلام سے اس بچے کی حالت دیکھی نہ گئی اور جب انہیں ناامیدی میں کچھ اور نہ سوجھا تو بچے کو اٹھایا اور خیمہ بستی سے باہر نکل آئے۔ کہتے ہیں انہوں نے اس معصوم کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا اور دشمن فوج کا ہر سپاہی انہیں اس بے بسی کے عالم میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ خود حسین علیہ السلام کا حلق پیاس سے سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور جب گویا ہوئے تو آواز نکلنے کی بجائے گلے میں ہی رندھ کر رہ گئی۔ وہ شمر کے آدمیوں سے التجا کر رہے تھے کہ بچوں کی حالت پر تو رحم کرو، کم از کم انہیں تو پانی

پلادو۔

جواب میں رحم کی بجائے ایک تیر اڑتا ہوا آیا اور حسین علیہ السلام کے بازوؤں میں تھامے ہوئے بچے کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ خون کی ایک ننھی سے پھوار نکلی اور حسین علیہ السلام کے ہاتھ رنگ گئے، چہرے اور داڑھی پر بھی سرخ چھینٹے اڑنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نومولود بچے کا خون حسین علیہ السلام کی انگلیوں کو رنگتا ہوا، بہنے لگا اور ریتلی زمین پر ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ حسین علیہ السلام کا جیسے جگر چر گیا۔ انہوں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شمر، شمر کے آدمیوں، عبید اللہ اور یزید کو بددعا دی۔ خدا سے درخواست کی کہ اب تو ان ظالموں پر قہر کی بجلی گرا دے، اب تو بس ہو گئی ہے۔ یہ واقعہ بار بار بیان کیا گیا ہے، نسل در نسل تفصیل سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ یوں وقت کے ساتھ آخر میں اس دل خراش کہانی سے کئی مفہوم بر آمد ہوتے چلے گئے۔ وقت آئے گا کہ لوگ کہیں گے، حسین علیہ السلام نے بددعا دی اور نہ ہی خدا سے قہر نازل کرنے کی التجا کی۔ انہوں نے تو رحم کی استدعا کی تھی۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ 'اے اللہ، گواہ رہیو اور اس قربانی کو قبول کرنا!'۔ ان کی دعا فوراً قبول ہو گئی تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ خون کے قطرے زمین پر گرنے کی بجائے کشش ثقل کے قوانین کو پچھاڑ کر سیدھا آسمان کی طرف اڑنے لگے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔

پھر عاشورہ کی شام آ گئی۔ عاشورہ، یعنی دسواں دن اور شیعہ کے نزدیک یہ دن کسی بھی دوسرے دن سے برتر اور محترم ہے۔ حسین علیہ السلام نے رات گئے اپنے بچے کھچے، پیاس سے نڈھال آدمیوں سے التجا کی کہ وہ انہیں ان کے حال پر، ان کی قسمت کے لکھے پر چھوڑ جائیں۔ 'میں اللہ کو گواہ بنا کر تم سب سے کہتا ہوں کہ میری طرف سے تم سب آزاد ہو۔ میں نے تمہاری وفاداری کا عہد بخش دیا۔ تم پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ رات کے اندھیرے کو اونٹ کی طرح استعمال کرو اور اس کی پشت پر سوار ہو کر نکل جاؤ۔ یزید کے آدمی میرے پیچھے پڑے ہیں اور انہیں میرے سوا کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ اگر وہ مجھے آن پکڑیں گے تو اس کے بعد وہ کسی کو کچھ نہیں کہیں گے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں، اپنے گھروں کو، اپنے پیاروں کے پاس لوٹ جاؤ!'۔

لیکن ان کا کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، سب کے سب ان کے گرد ٹک کر جمع رہے۔ ان کے منہ سوکھے ہوئے تھے، ہونٹوں پر پپیڑیاں جم چکی تھیں اور پیاس سے آواز سخت اور کھردری ہو چکی تھی۔ انہوں نے ساتھ نہ چھوڑنے کی قسم کھائی۔ 'اے حسین علیہ السلام! ہم اس وقت تک آپ کے شانہ بشانہ کھڑے رہیں گے، لڑ کر مر جائیں گے جب تک آپ اپنی منزل تک نہیں پہنچ جاتے'، ایک شخص منادی کرنے لگا اور باقی سب نے اس کی تائید کی۔ دوسرے نے کہا، 'اللہ کی قسم، اگر مجھے کوئی کہے کہ میں مار کر جلا دیا جاؤں گا اور میری راکھ اڑا دی جائے گی، پھر زندہ کیا جاؤں گا اور ایسے ہی بار بار، ہزار بار جلا کر مار دیا جاؤں گا تو اے حسین علیہ السلام، میں آپ کا ساتھ پھر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں جب کہ میں جانتا ہوں کہ موت صرف ایک بار آنی ہے؟'

'پھر اللہ کو یاد کرو اور اس سے رحم کی استدعا کرو' حسین علیہ السلام نے تلقین کرتے ہوئے کہا، 'کل یہاں ہمارا آخری دن ہو گا۔ انجام آن پہنچا ہے!'۔ پھر انہوں نے کچھ دیر توقف کیا، خیمے میں خاموشی چھائی رہی اور آخر کار دوبارہ بولے تو صرف قران کی وہ آیت پڑھی، جو عام طور پر موت کے سامنے، موت کی خبر اور نقصان کی اطلاع پر کہی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا، 'بے شک ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں'۔

چونکہ یہ آخری شب تھی، اسی لیے اس خیمہ بستی کے ہر شخص کے لیے خاصی طویل رات رہی ہو گی۔ پوری رات عبادات اور مناجات کے ساتھ لڑائی کی تیاریاں جاری رہیں۔ حسین علیہ السلام کی تیاری یہ تھی کہ انہوں نے زرہ بکتر اتار دی اور ایک سفید اور بے شکن جوڑا پہن لیا، گویا کفن اوڑھ لیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ایک پیالے میں مرکلی کی گوندھ پگھلا کر لائی جائے۔ انہوں نے اپنے جسم پر اس گندھ رس سے مالش کی، خوشبو لگائی اور باقی سب کو بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ سب جانتے تھے کہ یہ موت کی تیاری ہے، لاشے کو آخری رسومات کے لیے تیار کرنے کا طریقہ ہے۔

'یہ سب دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو ڈگمگا رہے تھے مگر میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو کیے رکھا، اپنے آپ کو روکے رکھا!' بعد ازاں حسین علیہ السلام کی ایک بیٹی اس رات کا احوال سناتے ہوئے کہنے لگیں، 'میں

چپ رہی۔ میں جانتی تھی کہ مصیبت اور آزار کی وہ آخری گھڑی آن پہنچی ہے جس کے لیے ہم نے یہ طویل سفر اختیار کیا تھا'۔

آنسوؤں کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ متعدی ہوتے ہیں۔ چھوت کی طرح اچانک نکل آتے ہیں اور پھیل جاتے ہیں۔ کسی فلم یا اصل زندگی میں بھی، لوگ خود کو پھوٹ پھوٹ کر رونے سے روکتے ہیں۔ کیونکہ عام خیال یہی ہے کہ یہ کمزوری کی علامت ہے یا پھر ہم اپنی انا اور مرادنگی کے ڈھونگ میں یہ چاہتے ہیں کہ ہمدردی کا سامان پیدا نہ ہونے پائے۔ لیکن، بسا اوقات آنسوؤں کو روکے رکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور پھر جب آپے سے باہر ہو جائیں تو آنکھیں خود بخود نم ہو جاتی ہیں، نظر دھندلانے لگتی ہے اور اسی کشمکش میں آنسوؤں کی جیت ہو جاتی ہے۔ ہم بے اختیار رونے لگتے ہیں، غم سے چور ہو جاتے ہیں۔

لیکن شیعہ کے یہاں آنسوؤں کو روکے رکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ یہ آنسو بہانے کا سامان کرتے ہیں۔ شیعہ رونے کی ترغیب دیتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ غم اور دکھ، ان کے یہاں ایمان کے کامل ہونے کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف کفارہ ہے بلکہ ہول و ہیبت کا کھلم کھلا اظہار ہونے کے ساتھ مستقل ایقان کا بھی مظہر ہے۔ ان کے نزدیک ہر آنسو بیش قیمت ہے، اس کے بہائے جانے کا مقصد ہے۔

مقصد یہ ہے کہ پچھلے تقریباً چودہ سو برس سے مسلسل، عاشورہ کے دس دن کربلا میں پیش آنے والی ابتلا، اس کٹھن گھڑی کی ہر ہر چھوٹی اور بڑی تفصیل دہرا کر یاد کی جاتی ہے اور اس دل خراش آزمائش میں مبتلا ہر کردار کو دوبارہ سے زندہ کیا جاتا ہے۔ شیعہ اسلام میں اس کڑے امتحان کی کہانی اس قدر نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ ہر سال، صدیوں سے اس کا تذکرہ اور یاد مقدس نوشتہ کے جیسے، اجتماعی یادداشت میں بار بار واقعات دہرا کے اور کردار تخلیق کر کر کے باقی رکھی گئی ہے۔

ہر سال تعزیہ منایا جاتا ہے، ماتم کیا جاتا ہے اور جذبات کو بھڑکانے والی تماثیل کا بندوبست ہوتا ہے۔ یہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی شیعہ آبادیوں میں تقریباً ہر جگہ پر اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

کوشش رہتی ہے کہ پچھلے برس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اہتمام کیا جائے۔ جلوس نکلتے ہیں، گریہ ہوتا ہے، لوگ زنجیر زنی کرتے ہیں اور غم میں خود کو تھپکتے، چھاتیاں پیٹتے ہیں۔ جھنڈے بلند کیے جاتے ہیں، کربلا کے کئی کرداروں، واقعات کی شبیہ دوبارہ سے تخلیق کی جاتی ہے اور پانی کی بے شمار سبیلیں لگتی ہیں۔ نوحے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ سلام، درود اور کربلا کے قصے سنانے کے لیے خصوصی محافل اور مجالس کا انعقاد ہوتا ہے اور لوگ سیاہ پوش، یعنی غم کے رنگ میں ڈھل کر عاشورہ کے دس دن مسلسل ماتم کناں رہتے ہیں۔

اہتمام کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قرون وسطیٰ کے دور سے جاری، عیسائیوں میں انتہائی مقبول سالانہ یسوع کی اوبر آمرگاؤ تماثیل، عاشورہ کے ہیجان خیز تجربے کی طویل داستان کے سامنے ایک زرد اور اندھے نقطے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جہاں طوالت، وہیں تعزیہ میں اہتمام بھی خاصا ٹھاٹھ دار اور پر شکوہ ہوتا ہے۔ واقعات کا احوال شان دار ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ ان تماثیل یا قصہ گوئیوں میں مکالمے، صرف بات چیت نہیں ہوتیں بلکہ لمبی تقاریر اور طویل بحثیں لگتی ہیں۔ صرف سوال اور جواب پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ پوری گفتگو ہوتی ہے، جس میں احساسات کو واضح آوازوں اور الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ سالہا سال کی مشق اور صدیوں سے کی جانے والی آبیاری کا نتیجہ ہے کہ اتنی تفصیل اور باریکی سے مزین کیے جانے والی تماثیل مشہور زمانہ براڈوے یا ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا، حالانکہ ان دونوں مقامات پر پیش کیے جانے والی تماثیل بارے کہا جاتا ہے کہ وہ ناظرین میں جذبات دوڑا دیتے ہیں۔ عاشورہ کی محافل میں عام قصہ گوئی اور تمثیلی نقلیں اور تجربات، ہر طرح سے برتر ہیں۔ دیکھنے اور سننے والوں پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ پورے انہماک سے کہیں کھو جاتے ہیں، جیسے سارے واقعات اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ سٹیج پر جب سیاہ مگر نہایت طمطراقی شاہانہ لباس پہنے یزید یا عبید اللہ یا شمر کے کردار سامنے آتے ہیں تو چاروں طرف سے لوگ پھنکارتے ہوئے، سی سی کی آوازیں نکالتے، ان پر آوازیں کستے ہیں۔ نئی نویلی دلہن جب اپنے خوبرو دلہا کو میدان جنگ میں بھیجنے سے پہلے وداع کرتی ہے تو دیکھنے والوں کے آنسو رکنے میں نہیں آتے اور ہال میں سسکیاں سنائی دیتی ہیں، آہیں بھری جاتی ہیں۔ حسین علیہ السلام کا اپنے بیٹے کی لاش کو دشمن فوجیوں کے سامنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے بلند کرنے کا ذکر آتا ہے یا تمثیل میں اس منظر کو دیکھتے ہیں تو لوگ بے اختیار چھاتیاں پیٹنے لگتے ہیں، چاروں طرف ہلکی آواز میں بین

سنائی دیتی ہے، بیچ میں کوئی کوئی سسکارتا ہے اور عورتیں یوں دبی دبی آوازیں نکالتی ہیں جیسے کوئی دم گھونٹ کر مار رہا ہو۔ پھر وہ یوں بین کرتی ہیں، روتی ہیں جیسے ان کا سینہ ہلکا ہو گیا تو چودہ سو سال پہلے پیش آنے والا المیہ ٹل جائے گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تماثیل اور داستان گوئی کے کئی رنگوں میں، جذبات اور تپاک اس وقت صحیح جوش میں نہیں آتا جب حسین علیہ السلام کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اصل لمحات تو وہ ہیں جب دسویں کی رات وہ زرہ بکتر اتار کر کفن پہن لیتے ہیں۔ سوز و گداز اور جاں بلبی میں اب تک جتنے لمحات آئے ہیں، ان میں سب سے رقت آمیز یہ وقت ہے۔ کئی لوگوں کو یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہو گی مگر دیکھنے والی آنکھ کے لیے داستان میں یہ انتہائی کٹھن اور برداشت سے باہر تجربہ ہوتا ہے۔ یہ موت کے سامنے کھڑی ایک انتہائی ٹھہری ہوئی، چپ چاپ اور پر سکون گھڑی ہے۔ شاید، اپنی نوعیت کا یہ واحد لمحہ ہے جب اگلی صبح اپنی جان کے جانے کا سارا غم دور ہو گیا ہے، تکلیف جاتی رہی اور حسین علیہ السلام نے اپنی قسمت کو قبول کر لیا۔ تقدیر کو مان لیا اور اب وہ کٹ مرنے کے لیے پوری طرح، دل و جان سے تیار ہیں۔

دس دن تک جاری رہنے والی تقریبات اور تماثیل کا حاصل یہ وقت ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد 'حسین علیہ السلام یہ' میں جمع ہوتی ہے۔ حسین علیہ السلام یہ سے مراد 'حسین علیہ السلام کے گھر' ہیں۔ یعنی وہ بڑے بڑے ہال، جن میں بیٹھ کر ذاکر کربلا کی داستان سناتے ہیں۔ مرد حضرات بھی گریہ کرتے ہیں، روتے ہیں، پیٹتے ہیں اور ساری رات آنسو بہاتے ہیں۔ اصل مقصد ماتم نہیں بلکہ اس دل چیر دینے والی داستان پر ایک جگہ جمع ہو کر، انفرادی سطح پر انعکاس ہے، غم میں ڈوب کر مراقبہ کرنا ہے، غور و فکر کو دعوت دینا ہے۔ عورتیں ایک دوسرے کے گھروں میں جمع ہو کر حسین علیہ السلام کی بیٹی اور ان کے بھتیجے کی شادی کی رات کے لیے چھتر بناتی ہیں۔ پھر اسے ریشم اور پھول کی لڑیوں سے سجاتی ہیں، فرش پر پھول کی پتیاں بچھائی جاتی ہیں۔ وہ پورے اہتمام کے ساتھ اس شادی کا بستر سجاتی ہیں جو کبھی مکمل نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہو پائے گی۔ اسی طرح گھروں میں پنگوڑے لائے جاتے ہیں۔ ان پنگوڑوں کو حسین علیہ السلام کے نومولود بیٹے کے لیے سجایا جاتا ہے اور اس میں اس معصوم بچے کے لیے کھلونے اور میٹھی ٹافیاں بھر کر رکھی جاتی ہیں۔ شادی کا بستر اور بچے کا پنگوڑا سجانا،

اس مشق کا مقصد سوچ وچار کرنا ہے کہ روزمرہ زندگی، شادی بیاہ اور بچے پالنے وغیرہ کے معاملات میں پھنس کر نہ رہ جائیں بلکہ ٹھہر کر غور کریں کہ اس سے کہیں بڑا کوئی مقصد ہے، فرض کے تقاضے ہیں۔ پھر ان معمولات کا صرف یہی پر مغز پس منظر نہیں ہے بلکہ عورتیں اس طرح کی رسم اور روایات زندہ رکھ کر، آج اکیسویں صدی میں بھی حسین علیہ السلام کو اپنی گھریلو زندگی کے معاملات میں مدخل کر کے خدا سے دعا کرتی ہیں کہ ان کے صدقے، بچوں کو، یعنی مستقبل کو ہر طرح کے شر، تشدد اور خطرات سے محفوظ رکھے۔ عاشورہ کے دس دن، ان معمولات کے بیچ ہر وقت گریہ جاری رہتا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے۔۔۔ الغرض ہر کوئی ماتم کناں رہتا ہے۔ چھاتیوں پر مکے مارتے ہیں، اپنے چہروں کو پیٹتے ہیں، نوچتے ہیں اور ساتھ لبوں پر ایک ہی نام رہتا ہے، 'حسین علیہ السلام، حسین علیہ السلام، حسین علیہ السلام، حسین علیہ السلام۔۔۔' یہ عالم تب تک جاری رہتا ہے جب تک گریہ کرنے والا تھک کر چور نہ ہو جائے اور ہمت جواب نہ دے چکے۔

ہر سال، محرم کے مہینے میں پہلے عشرے کی محنت اور ماتم، دسویں دن یعنی عاشورہ کے دن انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ صبح ہوتے ہی مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے اور بچے گھروں سے نکل آتے ہیں اور اکٹھے ہو کر دیہاتوں اور قصبات میں سینکڑوں اور شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں بازاروں، سڑکوں اور جہاں جگہ ملے جلوس نکالتے ہیں۔ مردوں کے کئی جتھے ایک ہی رو اور انداز میں مٹھیاں بھینچ کر چھاتی پیٹتے ہیں اور یوں پسلیوں کے ڈھانچے پر ضرب لگنے سے گونج پیدا ہوتی ہے۔ ہر قدم، ہر مکے پر ساتھ ہی وہ کہتے جاتے ہیں، 'یا حسین علیہ السلام۔۔۔ یا حسین علیہ السلام!'۔ دن بھر یہی جلوس چلتے رہتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ سنائی نہیں دیتا کہ، 'اے حسین علیہ السلام۔۔۔ اے حسین علیہ السلام!'۔ یہ دن، ہر طرح سے حسین علیہ السلام کا دن بن جاتا ہے۔

اگر ایک آدمی اپنی چھاتی کو خالی مٹھیاں بھینچ کر پیٹے اور اس سے گونج پیدا ہو جائے تو اس سے ہوش مندی اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ مگر جب ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایک ساتھ چھاتیاں پیٹ کر گونج پیدا کریں تو میلوں دور بیٹھ کر بھی یہ آواز سن سکتے ہیں۔ یہ کسی بھی شہر میں بجائی جانے والی گھنٹی یا بڑا ڈھول پیٹ کر پیدا کی جانے والی آواز یا اشارے سے کہیں اونچی گونج ہوتی ہے۔ یہ گونج مسلسل سنتے رہیں تو سوچ کر ہی ہول اٹھتا ہے کہ دراصل یہ زندہ لوگوں کی چھاتیوں سے نکلی گونج ہے جو گوشت کے گوشت سے

ٹکرانے پر پیدا ہو رہی ہے۔

کچھ لوگ تو حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ خود کو خالی مٹھیوں سے نہیں بلکہ زنجیروں کے سانٹ سے پیٹتے ہیں۔ ہر زنجیر کے سرے پر ایک چھوٹا سا تیز دھار بلیڈ لگا ہوتا ہے۔ وہ پہلے ان زنجیروں کو بائیں کندھے کے اوپر سے اور پھر سامنے سے گھما کر دائیں کندھے کے اوپر سے پیٹھ پر بغیر رکے ضربیں لگائے جاتے ہیں اور پیٹھ لہولہان ہو جاتی ہے۔ کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو چاقو پکڑے اپنی پیشانیوں کو چھیل دیتے ہیں۔ ماتھے سے خون بہہ کر چہرے پر پھیل جاتا ہے اور آنسوؤں میں گھل کر ٹپ ٹپ گرتا رہتا ہے۔ ان مناظر کو دیکھ کر حیرت اور استعجاب تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ انوکھا اور تقدیس سے بھرا خوف اور دہشت بھی طاری ہو جاتی ہے۔

ماتمی جلوسوں میں لوگ کئی پوسٹر، بینر اور سب سے زیادہ، جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جھنڈے خصوصی طور پر سیاہ ریشم سے تیار کیے جاتے ہیں اور کونے پر سنہری یا ہرے رنگ کی گوٹا کناریاں، پھول اور بوٹے کاڑھے ہوتے ہیں۔ ہرا رنگ اسلام اور سیاہ ماتم کی نشانی ہے۔ ان میں سے کچھ جھنڈے اور بینروں کا ایک ہی معیار برقرار رکھا جاتا ہے۔ حسین علیہ السلام سے منسوب ان چند جھنڈوں کا تقریباً ہر جگہ پر عرض ایک ہی ہوتا ہے اور یہ سب سے اونچے لہرائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر تو ان پر حسین علیہ السلام کا نام کاڑھا ہوتا ہے مگر اکثر ایسے بھی نظر آتے ہیں جس پر ان کی شبیہ بنائی ہوتی ہے۔ یہ ایک خوبرو نوجوان کی شبیہ ہے جس کے کاندھے پر ہرے رنگ کا کپڑا، جسے عربی میں 'کوفیہ' کہا جاتا ہے، ڈھلکا رہتا ہے۔ باقی کے جھنڈے اور بینر عاشورہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، جن پر اکثر خون، ماتمی کلمات وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ کئی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں ان بینروں پر حسین علیہ السلام کی ننگے سر، پیشانی سے خون بہتے ہوئے اور منہ شدید ایذا کی حالت میں منہ کھلا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ یہ بینر جب ہوا میں لہراتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کا سر خلا میں ٹنگا ہوا ہے اور یہ ایک برچھی کی نوک میں پرو رکھا ہے۔

ان ماتمی جلوسوں میں، سب سے ممتاز نشان ایک سفید، بن سوار کے گھوڑا ہوتا ہے۔ یہ حسین علیہ السلام کا گھوڑا ہے، جس کی کاٹھی خالی ہے۔

ان ماتمی جلوسوں میں، سب سے ممتاز نشان ایک سفید، بن سوار کے گھوڑا ہوتا ہے۔ یہ حسین علیہ السلام کا گھوڑا ہے، جس کی کاٹھی خالی ہے۔

انہوں نے اپنے گھر کی خواتین سے رخصت لی اور اپنے سفید اصیل نسل کے نر اسپ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس گھوڑے کو 'ذوالجناح' کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب 'بازوؤں یا پروں والا' کے ہیں مگر اصل معنوں میں مراد 'تعاقب کرنے والا' کے ہیں۔ اسی لیے، اس کا نام 'الحق' بھی مشہور ہے۔ بہر حال، حسین علیہ السلام ذو الجناح پر سوار ہو کر خیمہ بستی سے نکل کر میدان میں آ گئے اور لڑنے کے لیے تیار تھے۔ وہ گھوڑے کو سرپٹ بھگاتے ہوئے سیدھا دشمن کی صفوں میں جا گھسے اور چاروں طرف سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ تیر اور بھالے گھوڑے کی رانوں میں پیوست ہو گئے تھے، وہ شدید زخمی ہو چکا تھا مگر پھر بھی دوڑتا رہا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کمان کو گھوڑے کی ٹانگوں سے اٹھا کر تیر چلا سکے۔ اس پر حسین علیہ السلام گھوڑ آسن میں سوار، دائیں اور کبھی بائیں اپنی تلوار گھماتے جاتے اور راستے میں آنے والا کوئی بھی شخص اس کی زد سے بچ نہ پاتا۔ چند لمحے تو بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ چار ہزار کے لشکر کے مد مقابل وہ واحد آدمی ہیں۔ 'اللہ کی قسم! میں نے اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد اس طرح کی دلیری کہیں دیکھی ہے' لڑائی کے بعد شمر کا ایک آدمی بتانے لگا، 'پیدل فوجی تو انہیں دور سے ہی سرپٹ اپنی طرف آتا کر یوں پیچھے ہٹ رہے تھے جیسے بکریاں ایک بھیڑیے کو شکار کرتے، آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر دبک جاتی ہیں'۔

ظاہر ہے، حسین علیہ السلام کی دلیری کا یہ عالم زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ 'تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟' شمر اپنے فوجیوں پر برس رہا تھا، 'او نامرد کے بچو، او بزدل کی اولادو، او اس شخص کے پلو جس کا خوف کی وجہ سے خواہ مخواہ دونوں اطراف سے پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔۔۔ حملہ کرو اور اسے مار ڈالو۔ تمہاری مائیں تم سے محروم ہو جائیں۔۔۔' ابھی شمر یہی کہہ رہا تھا کہ ایک تیر اڑتا ہوا آیا اور حسین علیہ السلام کے کندھے میں پیوست ہو گیا۔ اتنی زور کا دھچکا لگا کہ وہ گھوڑے کی پشت سے زمین پر گر گئے، گھوڑا آگے نکل گیا اور شمر کے آدمی چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے۔

شمر کے آدمی بتاتے ہیں کہ جب کام تمام ہو گیا تو حسین علیہ السلام کے جسم پر لاتوں کے بتیس اور خنجر اور

برچھیوں کے تینتیس زخم آئے تھے۔ اب بھی ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ گویا ثبوت چھپانا چاہتے ہوں، لاشے کو، حسین علیہ السلام کے، پیغمبر کے نواسے کے، اہل بیت کے پانچ افراد میں سے آخری کے لاشے کو دیر تک گھوڑوں کی سموں تلے روندتے ہوئے کچلتے رہے۔ کربلا کی ریتلی مٹی میں انہیں رول کر پامال کرتے رہے۔

جب یہ ہو چکا تو سنیوں کے نزدیک جو صرف تاریخ ہے، شیعہ کے یہاں مقدس اور متبرک تاریخ کا روپ دھار لے گی۔ ان کے نزدیک تاریخ نے تقدیس اور عقیدت کا لباس پہن لیا اور شیعہ کے یہاں مشہور، تاریخ میں پیش آنے والے آگے کے واقعات کا احوال تبرک اور معظم یادداشتیں ہیں۔ مثلاً، تاریخ میں جتنی بھی روایتیں درج ہیں۔ ان میں کہیں بھی حسین علیہ السلام کی تین سالہ بیٹی سکینہ کا میدان جنگ میں بھٹکتے پھرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح کسی بھی جگہ حسین علیہ السلام کا گھوڑا 'ذوالجناح' آنسو بہاتا ہوا نہیں ملتا اور نہ ہی دو فاختائیں نظر آتی ہیں جو حسین علیہ السلام کے قتل ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے، مبینہ طور پر جنت سے اڑتی ہوئی آئیں اور میدان میں پہنچ گئیں۔ لیکن لاکھوں شیعہ کے سامنے ان حقائق کا تذکرہ کون کر سکتا ہے؟ شیعہ جو عاشورہ کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں، انہیں اب کون سمجھائے کہ یہ سب عقیدت کا نتیجہ ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اصل میں یہ جو کربلا کی داستان ہے، اس کو شیعہ کے یہاں اتنی بار دہرایا جا چکا ہے، اس کے گرد اتنے تانے بانے بنے گئے ہیں کہ اس میں نظر آنے والی گہرائی اور شدت کے سامنے کوئی عقلی دلیل ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ حسین علیہ السلام سے اس طرح جڑ گئے ہیں جیسے کٹر عیسائی یسوع کو، ان کے ساتھ پیش آنے والے مافوق الفطرت قصے کو ایمان کی حد تک مانتے ہیں۔

شیعہ کے یہاں مشہور ہے کہ کیسے ذوالجناح، جو عرب کے اصیل گھوڑوں میں سب سے یکتا تھا، وہ حسین علیہ السلام کو قتل کیے جانے کے بعد واپس لوٹ کر آیا اور اپنی پیشانی کو ان کے خون میں ڈبو کر رنگ دیا۔ پھر وہ سر پٹ بھاگتا ہوا خیمہ بستیوں میں عورتوں کے خیمے کے پاس چلا آیا۔ عورتوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنی پیشانی کو زمین پر پٹخ پٹخ کر مار رہا تھا جیسے ماتم کرتا ہو۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہ جانے کہاں سے، آسمان سے دو سفید فاختائیں اڑتی ہوئی آئیں اور اپنے پر حسین علیہ السلام کے خون میں تر کر لیے۔ پھر یہ دونوں فاختائیں جنوب کی جانب اڑنے لگیں۔ پہلی کا رخ مدینہ اور دوسری کا مکہ کی طرف تھا۔ یہاں

پہنچ کر جب مکہ اور مدینہ کے لوگوں نے ان پرندوں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ کیا سانحہ ہے جو دور کہیں، عراق کے ریتلے میدان میں رونما ہو چکا ہے۔ ان شہروں میں فوراً ہی بین اور رواس پٹاس شروع ہو گی اور دونوں شہر غم اور سوگ میں ڈوب گئے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ کیسے تین سال کی سکینہ اپنے ابا کی تلاش میں میدان میں بھٹکتی پھر رہی تھی، انہیں پکار رہی تھی اور کیسے ایک ایک لاشے کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ، کپڑے اور منہ خون سے لت پت تھا۔ پھر جب اسے ایک لاشہ نظر آیا، جس نے پکار کر اسے پاس بلایا۔ سکینہ سمجھ گئیں کہ یہی اس کے ابا ہیں۔ وہ سمٹ کر اس خون اور مٹی سے اٹے ہوئے لاشے کے پہلو میں لیٹ کر مزے سے بے خبر سو گئی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کیا عباس واقعی ایک بازو کٹ جانے کے بعد، دوسرے بازو سے بدستور لڑتے رہے؟ یا کیا گھوڑا زمین پر سر پٹخ کر واقعی رو سکتا ہے؟ یا کیا اس ریتلے صحرا میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ دو فاختائیں اڑتی ہوئی ایسے آئیں، جیسے جنت سے اتری ہیں؟ ایمان اور ضرورت کا تقاضا یہی تھا کہ مان لیا جائے، مشہور ہو جائے کہ واقعی ایسا ہوا تھا۔ کئی صدیوں سے بار بار، ہر برس دہرائی جانے والی کہانیاں مسلم اور ناقابل تردید سچ کا روپ اختیار کر گئیں۔ اگر واقعتاً یہ کہانیاں سچ نہ بھی ہوں، ان میں واضح کیے جانے والے معنی اور مفہوم بلاشبہ سچ ہیں۔ جیسا کبھی عیسیٰ کی موت کے ساتھ ہوا تھا، حسین علیہ السلام کا قتل بھی تاریخی واقعے کی بجائے تاریخ سے ماورا، زمینی حقائق سے کہیں برتر حقیقت بن جائے گی۔ یہ محض ایک دن نہیں رہا بلکہ یہ ایمان اور القا، یعنی عقیدے کا حصہ بن گیا۔ یہ یقین کا ایسا سمندر ہے جس میں جذبات اور شریعت کے دریا ایک ساتھ بہتے ہوئے آتے ہیں اور یہاں آ کر ایمان کے اس بحر بے پایاں میں مل جاتے ہیں۔

شمر کے آدمیوں نے حسین علیہ السلام کا سر تن سے جدا کر دیا۔ ان کے بہتر ساتھیوں کے سر بھی اسی طرح کاٹ کر جسم سے الگ کر دیے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر کو بوریوں میں بھر کر گھوڑوں کے گلے میں لٹکا لیا گیا۔ ہر سر، قتل کا ثبوت تھا۔ وہ نشانی جو کوفہ میں عبید اللہ کو پیش کر کے انعام کمانے کا ذریعہ ہو گی۔ لیکن حسین علیہ السلام کے سر کو کسی بوری میں نہیں ڈالا گیا بلکہ اسے الگ کر کے رکھ دیا گیا، کیونکہ اصل قیمت تو اس سر

کی تھی۔ شمر نے حکم دیا کہ ایک برچھی کی نوک پر حسین علیہ السلام کا سر پرو کر لشکر کے آگے آگے، کسی فتح کی جانے والی ٹرافی کی طرح سجا کر چلایا جائے۔ ایک وہ دن تھا جب صفین کے میدان میں قران کے پارچے نیزوں پر لگائے گئے تھے، آج کربلا میں حسین علیہ السلام کا سر ویسے ہی اٹھار کھا تھا۔

شمر نے سر کٹے بہتر لاشے دفنائے نہیں بلکہ حکم دیا کہ انہیں صحرا میں لگڑ بگڑوں اور بھیڑیوں کے لیے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انہیں نوچ کھائیں۔ عورتوں اور بچوں کو زنجیروں میں جکڑ کر کوفہ تک حسین علیہ السلام کے نیزے پر بلند کیے ہوئے سر کے نیچے پیدل چلا کر لایا گیا۔ جب وہ گورنر کے محل میں پہنچے تو شمر نے حسین علیہ السلام کا سر برچھی سے اتار کر اس کے پیروں میں اچھال دیا۔ عبید اللہ نے یہ دیکھ کر قہقہہ لگایا اور شمر کو شاباش دی۔ اس نے سر کو اپنی چھڑی سے چند ٹوکیں لگائیں اور پھر اتنی زور سے ضرب ماری کہ یہ سخت پتھریلے فرش پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر حاضرین میں پیغمبر کا ایک بزرگ ساتھی سے رہا نہ گیا، وہ اس بے حرمتی پر سخت خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جان کے خطرے سے بے پرواہ ہو کر بولا، 'اپنی چھڑی کو دور کرو، تمہیں خدا کا واسطہ!' پھر جیسے پھٹ پڑا، 'جس چہرے کی تم تضحیک کر رہے ہو، میں نے پیغمبر خدا کو کتنی ہی بار اس چہرے کو چومتے ہوئے دیکھا ہے'۔ پھر یہ شخص روتا ہوا، اس سے پہلے کہ عبید اللہ کے فوجی اسے روک پانے، چھڑی کے سہارے ٹیک لگا کر چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ بلکہ، کسی میں حتی کہ عبید اللہ میں بھی اس کو روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ باہر نکلا اور باہر جمع لوگوں سے آخری بار مخاطب ہوا،

'ایک غلام نے دوسرے غلام کو اقتدار اور طاقت دی تو اس نے لوگوں کو اپنی میراث بنا لیا' آواز میں زور تھا، 'تم۔۔۔ اے عرب کے لوگو، تم! آج کے بعد غلام ہو۔ تم نے فاطمہ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور یہ حرام زادہ گورنر تمہیں حکم دیتا ہے اور تم چوں چراں کیے بغیر مان لیتے ہو؟ تم نے ذلت اور خجالت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اللہ کرے وہ جو اس تذلیل اور فروتنی کو قبول کیے بیٹھے ہیں، ان پر قہر نازل ہو'۔

اس بوڑھے شخص کا غم اور غصہ، نراس زدہ ہول لوگوں کے اجتماعی ضمیر اور عمل میں جم کر بیٹھ گیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزرے ابھی پچاس برس بھی نہیں گزرے تھے اور یہاں ان کے گھر کے مردوں کا قتل عام ہو چکا تھا۔ عورتوں کی تذلیل کی جا رہی تھی اور بچے زنجیروں میں جکڑے، سہم کر بیٹھے تھے۔ جیسے ہی یہ خبر پھیلی،

پورے عالم اسلام میں غم و غصہ کی تلخ لہر دوڑ گئی۔ جو سنتا، وہی شرمندگی سے سر جھکا لیتا، ندامت کے آنسو تھے کہ رکنے میں نہیں آتے تھے۔ یوں، محمد ﷺ کے گھرانے، یعنی اہل بیت کا ایک نیا نام مقبول عام ہو گیا۔ اب انہیں اہل حزن، یعنی غم اور اندوہ کا گھر بھی کہا جانے لگا۔

حسین علیہ السلام کا اس طور صحرا میں حقارت اور انتہائی اندوہناک طریقے سے قتل ہو جانا، چھ سو سال قبل عیسیٰ کے بہیمانہ قتل کی طرح خاتمے کا نہیں بلکہ ایک نئی شروعات کا نشان ثابت ہو گا۔ یہ اس داستان کا انجام نہیں بلکہ ایک نئے باب کا آغاز ہے۔

باب 14

جیسا شمر نے چاہا تھا، ویسا نہیں ہوا۔ اس کے حکم کے مطابق لگڑ بگڑوں اور بھیڑیوں کو لاشیں بھنبھوڑ کر چیر پھاڑنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہوا یہ کہ جب لڑائی ختم ہو گئی تو اس کی افواج نے مقتولین کے سر کاٹ کر رکھ لیے، خیمہ بستی کو آگ لگا دی اور بچ جانے والوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ جب چلے گئے تو آس پاس کے لوگ نکل آئے۔ یہ دریا کے پار واقع کھجوروں کے باغات اور کھیت کھلیانوں میں کاشت کرنے والے دہقان تھے۔ انہوں نے بہتر سر کٹی لاشیں ایک جگہ پر جمع کیں اور انہیں میدان میں ہی دفن کر کے قبروں پر نشانی لگا دی۔ اس واقعہ کے چار سال بعد یہاں زائرین کی آمد و رفت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی بار یہاں آنے والے یہ چند ہزار لوگ تھے جو آنے آج ان لاکھوں زائرین کے پیش رو نقیب کہلائے جا سکتے ہیں جو ہر سال یہاں ضرور آتے ہیں۔ ہر سال، محرم کے مہینے میں ان شہداء کی برسی کے موقع پر بڑی تعداد میں لوگ حاضری لگانے آتے رہے اور یہ زائرین ہی تھے جنہوں نے اس بنجر اور پتھریلی صحرائی میدان کا نام کربلا رکھ دیا۔ یعنی، کرب اور بلا۔ یہ میدان اور بالخصوص وہ جگہ جہاں بہتر شہیدوں کی قبریں بنائی گئی تھیں، مصیبت اور آزمائش کا مقام کہلائی۔

حسین علیہ السلام کا مزار بھی یہیں ہے مگر ان کا سر چونکہ شمر کے آدمی اپنے ساتھ لے گئے تھے، بعد ازاں اس کی علیحدہ تدفین بارے کئی روایتیں مشہور ہو جائیں گی۔ کربلا کے بعد جو واقعات پیش آئے اور وہ چیدہ مقامات جو اس کہانی سے جڑے ہوئے تھے، تقریباً ہر جگہ پر سر کی تدفین کا دعویٰ سامنے آیا۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حسین علیہ السلام کا سر دمشق کی مرکزی مسجد کے ساتھ ہی، شمالی دیوار کے سائے تلے دفن کیا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حسین علیہ السلام کا یہ مزار مصر میں قاہرہ کی جامع مسجد الازہر کے داخلی راستے کے ساتھ جو روضہ ہے، ادھر واقع ہے۔ کئی ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ حسین علیہ السلام کے سر کو بعد ازاں امانت کے طور پر، یعنی حفاظت کی غرض سے آذر بائیجان لے جایا گیا اور وہیں مزار بنا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حسین علیہ السلام کا سر واپس کربلا لایا گیا تھا اور پورے اعزاز کے ساتھ یہیں تدفین کی گئی۔ دراصل اس داستان میں وقت کے ساتھ یہ بات اہم نہیں رہی کہ حسین علیہ السلام کا جسم یا جسمانی اعضاء کہاں گئے؟ وہ کہاں دفن

ہوئے؟ اہم یہ کہ حسین علیہ السلام کی کہانی زندہ رہی۔ آج بھی دنیا کے کونے کونے میں باقی ہے اور جہاں چلے جایئے، آپ حسین علیہ السلام کو وہیں پائیں گے۔ یہ سوچ ان مٹ ہو گئی ہے۔ حسین علیہ السلام کی کہانی کیونکر باقی رہی؟ یہ آج بھی کیوں زندہ ہے؟ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ تفاصیل کہاں سے آتی ہیں؟ کس نے بتایا؟ کربلا کا احوال ان کے قافلے میں بچ جانے والوں نے اور شمر کی افواج نے سنایا تھا۔ کربلا کی لڑائی میں بچنے والے حسین علیہ السلام کے گھر کی عورتیں، لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔

علی زین العابدین، حسین علیہ السلام کے فرزند تھے جو اس وقت بلوغت کی عمر میں تھے۔ انہوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ لڑائی کے دن یہ خیمے میں بستر پر پڑے رہے کیونکہ یہ اٹھنے سے بھی قاصر تھے۔ شدید بخار کی وجہ سے تقریباً بے ہوش تھے۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال، انتہائی بے بسی کے عالم میں اپنے دوستوں، قریبی عزیزوں اور آخر میں اپنے ابا کو خیمہ بستی سے باہر جاتے، موت کے گھاٹ اترتا ہوا دیکھتے رہے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی، یعنی حسین علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تو شمر کے آدمیوں نے خیمہ بستی کا گھیرا تنگ کر لی۔ وہ سیدھا عورتوں کے خیموں میں گھس آئے تھے۔ یہاں انہوں نے پہلی بار زین العابدین کو بیماری کی حالت میں بے سدھ پڑے دیکھا۔ وہ آسان ہدف تھے اور امکان تھا کہ موقع پر قتل کر دیئے جاتے مگر ان کی پھوپھی، یعنی حسین علیہ السلام کی بہن زینب بیچ میں آ گئیں۔

'کبھی شیطان کو اپنی دیدہ دلیری چھیننے مت دینا، کمزوری مت دکھانا۔۔' حسین علیہ السلام نے پچھلی رات ہی انہیں تلقین کی تھی۔ اب وہ اسی وجہ سے بہادری دکھائیں گی۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی آئیں اور خود کو دھکیل کر بھتیجے اور شمر کے بیچ لا کھڑا کیا۔ وہ تن کر کھڑی تھیں اور شمر کو للکار رہی تھیں کہ اگر ہمت ہے تو پہلے انہیں اور پھر زین العابدین کی طرف بڑھے۔ 'اگر تم نے اسے قتل کیا تو اس سے پہلے، مجھے مارنا ہو گا' وہ غصے میں تقریباً پھنکارتے ہوئے بولیں۔

شمر جیسے شخص میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ پیغمبر کی نواسی کو عمداً قتل کر سکے۔ بجائے اس کے، حکم دیا کہ لڑکے کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہی جنگی قیدی بنا لیا جائے۔ زینب نے اس دن نہ صرف حسین علیہ السلام کی نشانی، یعنی بچ جانے والے اس بیٹے کی جان بچائی بلکہ وہ آگے چل کر کربلا کی یاد کو بھی زندہ رکھیں گی۔ اس

عالم میں جب انہیں زنجیروں میں جکڑ کر، کپڑے تار تار تھے اور سر پر چادر بھی نہیں تھی، پہلے کوفہ اور پھر شام لے جایا جارہا تھا تو وہ سارے راستے بین کرتی رہیں۔ ان کے غم میں ڈوبے ہوئے رنجور الفاظ اور بے بسی کی حالت آنے والی صدیوں میں عالم اسلام کا پیچھا کرتی رہے گی۔

'اے محمد ﷺ، محمد ﷺ، میرے محمد ﷺ! جنت کے فرشتے تم پر رحمت بھیجا کریں' وہ بین کر رہی تھیں، 'دیکھو اے محمد ﷺ، محمد ﷺ، میرے محمد ﷺ! اپنے حسین علیہ السلام کو دیکھو۔ کھلے آسمان تلے، خون میں لت پت، سر، ہاتھ اور بازو، ٹانگیں کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ اے محمد ﷺ، محمد ﷺ، میرے محمد ﷺ! تمہاری بیٹیاں قید میں ہیں، تمہاری اولاد کو مار دیا اور مشرق کی ہوا لاشوں پر دھول اڑا رہی ہے۔۔۔ اے محمد ﷺ، محمد ﷺ، میرے محمد ﷺ!'

عراق کے کونے کونے میں یہ خبر، آل محمد ﷺ کی حالت زار کا احوال خود بخود ہی پھیل گیا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ مشرق سے چلنے والی ہوا اپنے ساتھ کیا لائی ہے۔ عراق میں یہ ہوائیں عام طور پر دھول کے طوفانوں کے لیے مشہور تھیں، جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لغوی معنوں میں بھی ان ہواؤں سے مراد مصیبت اور آزمائش کی گھڑی ہے۔

شمر کے آدمی بھی زینب کو اس طرح دل چیر دینے والے الفاظ اور بین کے ساتھ ماتم کرتے دیکھ کر شرمندہ ہو گئے یا کم از کم ان میں سے چند ایک نے ایسا ہی روایت کیا ہے، 'اللہ کی قسم! اس نے تو ہر شخص کو رلا دیا۔ دوست اور دشمن، کون تھا جو اس بین اور چیخ و پکار کو سن کر نہیں رویا؟'۔ لیکن اگر یہ فوجی واقعی شرمندہ تھے یا شدت جذبات سے روئے بھی ہوں گے مگر پھر بھی حکم کے پابند رہے۔ عبید اللہ نے قیدیوں کی سر عام تذلیل کی، انہیں کوفہ کی گلیوں میں ننگے سر اور پیر گھمایا۔ جب اس کی تشفی ہو گئی تو قیدیوں کو کٹے ہوئے بہتر سروں سمیت دمشق میں یزید کے دربار میں حاضر کرنے کے لیے بھجوا دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عبید اللہ نہیں بلکہ خود یزید تھا جس نے حسین علیہ السلام کے سر پر چھڑی سے ٹوکیں لگائی تھیں۔ زور کی ضرب لگا کر سر زمین پر لڑھکا دیا تھا اور جب اس کے پیروں میں سر پھینکا گیا تو اس نے

دیکھ کر قہقہے لگائے تھے۔ لیکن زیادہ تر روایات میں یہی درج ہے کہ وہ شمر اور عبید اللہ پر برس پڑا تھا۔ ان کے اس بابت شدید جوش اور تذلیل میں حد سے گزرنے پر سخت سرزنش کی تھی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا، کیونکہ اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے زینب بنفس نفیس، خود وہاں موجود تھیں۔

کہتے ہیں وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں، کپڑے تار تار اور ننگے سر تھیں۔ منہ اور بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی اور کوفہ سے یہاں تک صحرا میں تقریباً پیدل سفر کرنے کی وجہ سے پیروں میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔ سخت تکان کا شکار تھیں اور کئی دن کی مسافت اور مشقت سے حالت خراب ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اموی خلیفہ یزید کے سامنے، اس کے بھرے دربار میں، گھمنڈ اور نخوت سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کہتے ہیں، ان کا سر اعتماد سے اس طرح بلند اور آواز میں اس قدر رعب تھا کہ جیسے یہ دربار، یزید نہیں بلکہ ان کا ہو۔ وہ یزید کو اس کا نام لے کر مخاطب کر رہی تھیں اور سر عام اس کو ملامت کرنے لگیں، 'تم، تمہارا باپ اور تمہارا دادا۔۔۔ تم سب نے میرے باپ علی کے، میرے بھائی حسین علیہ السلام کے اور میرے نانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو قبول کیا تھا' اب جیسے وہ دہاڑتے ہوئے بولیں، 'پھر بھی تم نے انہیں رسوا کیا اور ان کی تذلیل کی؟ ان کے ساتھ ناانصافی کی، ان کے نام کی بے حرمتی کی اور ان پر جبر اور ظلم کیا؟ اسی دین کو کچل دیا جس کو تم تینوں، تین نسلوں سے مانتے آئے ہو؟'

تاریخ میں درج ہے کہ یہ سن کر یزید رو پڑا، 'اگر میں خود وہاں ہوتا تو اے حسین علیہ السلام! تم کبھی مرتے نہیں۔ تمہارے ساتھ قطعاً یہ سلوک نہ ہوتا' اس نے اپنے سر کی قسم اٹھائی۔ پھر فوری طور پر حکم جاری کیا کہ قیدیوں کے ساتھ انتہائی عزت اور اکرام کا سلوک کیا جائے۔ انہیں یزید کے گھر کی عورتوں کے ساتھ، نہایت احترام کے ساتھ ان کے لائق جگہ دی جائے اور ہر ممکن خوب سے خوب تر خیال رکھا جائے۔ کربلا کے چالیس دن بعد، جس دن کو شیعہ 'اربعین' یا 'چہلم' کہتے ہیں، یزید نے حسین علیہ السلام کے گھرانے کی ان عورتوں، لڑکیوں اور واحد بچ جانے والے لڑکے علی زین العابدین کو ذاتی طور پر تحفظ اور دیکھ بھال کی یقین دہانی کرائی۔ ان کے ساتھ ایک فوجی دستہ مقرر کیا اور پورے انتظام کے ساتھ، شاہی قافلے کی صورت واپس مدینہ روانہ کر دیا۔

شاید زینب کا خطاب سن کر یزید کو ایک دم معاویہ کے الفاظ یاد آ گئے ہوں گے جو انہوں نے مرتے ہوئے اس سے کہے تھے، '۔۔۔ تم اسے شکست دینا اور پھر معاف کر دینا کیونکہ وہ پیغمبر کا نواسا ہے اور اس کا یہی، بڑا حق ہے'۔ اگر اس کو اپنے کیے کا رنج تھا یا واقعی یہی بات تھی تو افسوس، اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شیعہ کے یہاں تو اسے سخت ذلت آمیز اور گالم گلوچ کی زبان میں یاد کیا جائے گا مگر تقریباً سنی بھی اسے اس گھناؤنے جرم پر کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس کے نام اور یاد کے ساتھ کڑواہٹ اور تلخی جڑ جائے گی۔ واقعہ کربلا کے فوراً بعد ہر طرف جیسے بغاوت شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ مدینہ اور مکہ میں بھی یورش کا عالم تھا۔ تقریباً تین سال بعد جب شامی افواج مکہ میں عائشہ کے بدقسمت بہنوئی زبیر کے فرزند کی سربراہی میں اٹھنے والی بغاوت سے نبٹتے ہوئے شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے قریب تھیں، دمشق سے یزید کے مرنے کی اطلاع آ گئی۔ شاید ہی کسی شخص نے اس کے مرنے پر آنسو بہائے ہوں۔ یزید کے مر جانے کے چھ ماہ بعد، کسی نے اس خبر پر تو بالکل بھی توجہ نہیں دی کہ اس کا تیرہ سالہ بیٹا، بیماری سے چل بسا۔ وہیں، اس بات میں بھی کوئی شک اور شبہ نہیں کہ مروان، جس نے یزید کے بعد خلافت سنبھال لی تھی، اس کے مرنے پر غم نہیں بلکہ خوشی کا سماں تھا۔ مروان وہی شخص ہے جو عثمان کی نیابت پر فائز تھا اور ان کی خلافت اور علی کے دور میں بھی، مبینہ طور پر پس پردہ کئی سازشوں میں ملوث رہا۔ یزید کے مرتے ہی اس کو موقع مل گیا اور اس نے اقتدار ہتھیا لیا مگر ایک سال کے اندر ہی، کہا جاتا ہے کہ بیوی کے ہاتھوں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔

اس سارے عرصے میں، 'کربلا کا عنصر' زوروں پر تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، کربلا کی کہانی زور پکڑ رہی تھی، اس کا بیانیہ مضبوط ہی ہوتا گیا۔ کربلا میں بچ جانے والوں نے اس دل خراش واقعہ کی یاد بھرپور انداز میں تازہ رکھی۔ پیش آنے والے واقعات کو جہاں موقع ملتا، دہراتے رہے۔ لوگ چونکہ اب بھی شرمسار تھے، انہوں نے کفارہ ادا کرنے کی غرض سے ان یادداشتوں کو ازبر کر لیا بلکہ اسی پر جڑ گئے۔ عرب ، شام اور عراق حتی کہ دور دور جیسے الجیریا اور ہندوستان سے بھی لوگ بچ جانے والے اہل بیت، جو اب اہل حزن کہلائے جاتے تھے، مکہ میں عمرہ اور حج جبکہ مدینہ میں زیارت کے لیے آتے رہے تو اہل بیت کے یہاں بھی ضرور جاتے، ان سے ملتے اور اپنے ساتھ 'کربلا کا عنصر' پلے سے باندھ کر واپس اپنے علاقوں میں لوٹتے رہے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے، اس سانحے کا احوال اور اس کے پیچھے عوامل اور حسین علیہ السلام کی سوچ، ایک انتہائی

طاقتور تحریک میں بدل گئی۔ ساتویں صدی عیسوی میں کربلا کے سانحے میں بچ جانے والوں کی یادداشتیں اور سنائی روداد، آج اکیسویں صدی میں بھی جوں کی توں زندہ ہے اور ہر دور میں کسی نہ کسی انقلابی تحریک کی بنیاد بن ہی جاتی ہے۔

ایرانی نژاد پروفیسر علی شریعتی، جن کے پیش کردہ نظریات 1979ء میں ایرانی انقلاب کی بنیاد بنے تھے، لکھتے ہیں کہ 'مذہب اور عقائد انتہائی طاقت ور اور غیر معمولی شے ہے۔ آپ اسے ایسا حیران کن رجحان کہہ سکتے ہیں جو لوگوں کی زندگیوں میں کئی طرح سے انتہائی متضاد کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر یہ سڑے ہوئے معاشروں میں دوبارہ جان ڈال سکتا ہے تو وہیں یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہنستے بستے سماج کو برباد کر کے رکھ دے۔ یہ سوچ کو دبا کر سلا بھی سکتا ہے اور ضرورت پڑے تو تحریک پیدا کر کے سوئے ہوئے شیر کو جگا بھی سکتا ہے۔ لوگ اس کے ہاتھوں اسیر بھی ہو جاتے ہیں اور انہیں اسی کے سبب نجات بھی مل سکتی ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں اطاعت اور فرمانبرداری بھی سکھاتا ہے اور غدر، باغیانہ پن پر بھی اکسا سکتا ہے'۔

خمینی نے شریعتی کو خوب اچھی طرح سمجھ رکھا تھا۔ شریعتی کی ہی طرح، خمینی کے خطبات، تعلیمات اور افعال میں بھی کربلا کو انقلاب سے لدی ہوئی علامت کے طور پر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے نکتہ نظر کو اسی بات پر مجتمع کرتے ہیں کہ دراصل کربلا بغاوت، ظلم اور جبر سے انحراف، شہادت سے جڑے جذبات، سماجی اور سیاسی اہمیت کا حامل واقعہ ہے جو کسی بھی دور میں، کسی بھی جگہ پر اور کسی بھی صورتحال میں باآسانی فٹ کیا جا سکتا ہے۔ شاہ ایران کی حکومت میں، جب سیاسی اختلاف رائے پر جیل کی صعوبتیں عام تھیں اور پر تشدد کارروائیوں میں ماورائے عدالت قتل ہوا کرتے تھے، مذہب احتجاج اور مزاحمت کی زبان بن کر ایرانی عوام کے لیے چھتر چھایا فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تحریک صرف مذہب اور عقیدے کے نام پر نہیں چل سکتی تھی۔ اس لیے اسے 'کربلا کے عنصر' کے پہیے لگا دیے گئے۔ 'کربلا کا عنصر' اس تحریک کا اس قدر جاندار مصدر تھا کہ ذرا اندازہ لگائیے، اوپر بیان کردہ خطوط پر ترتیب دی جانے والی انقلابی تحریک دیکھتے ہی دیکھتے ہر کسی کی آواز بن گئی۔ یہ کربلا کے بیانیے کا ہی کمال تھا کہ مذہبی حلقوں اور سیکولر طبقات، آزاد خیال اور قدامت پسند آبادیوں، شہر کے مارکسی ہوں یا روایت پسند دیہاتی، الغرض سب کے نظریات اور عام عوام کی

سماجی اور معاشی ضرورتیں اس تحریک کے ساتھ یکساں انداز میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئیں۔

خمینی نے نومبر 1978ء میں، جب وہ فرانس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، ایرانیوں کے نام یہ پیغام نشر کیا، 'اس برس عاشورہ کے خون آلود جھنڈے لے کر نکلو۔ جہاں ممکن ہو یہ جھنڈے اس دن کی نشانی کے طور پر بلند کرو جب کچلے اور ستائے ہوئے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور جابر، ظالم اور بے انصاف حکمرانوں سے انتقام لیں گے'۔ پھر یہی ہوا۔ اس برس عاشورہ کے دن، یعنی 11 دسمبر کو خمینی کی اس اپیل کا نتیجہ تھا کہ روایتی ماتمی جلوس، انتہائی کارگر سیاسی ہتھیار میں تبدیل ہو گئے۔ عوامی دباؤ اور سخت احتجاج کے بعد شاہ ایران نے دو دن کے لیے مارشل لاء ہٹا دیا اور شہروں میں کرفیو نرم کر دیا گیا۔ نویں اور دسویں محرم کے دو دنوں میں خمینی کی درخواست پر لاکھوں لوگ نکلے اور گلیوں کوچوں، بازاروں اور شاہراؤں پر جلوس ہی جلوس تھے۔ محرم کے ماتمی جلوسوں میں عام طور پر بلند ہونے والا نعرہ 'موت بر یزید!' یعنی 'یزید کی موت'، اس برس، 'موت بر شاہ!' یعنی 'شاہ کی موت!' بن گیا۔

چالیس دن بعد، یعنی چہلم کے موقع پر خمینی نے دوبارہ اپیل کی اور 'کربلا کے عنصر' کو بدستور تحریک کا مرکز بنائے رکھا۔ انہوں نے شاہ کی پولیس کے ہاتھوں گلی کوچوں میں قتل ہو جانے والوں کو ان کے ساتھ ملا دیا جو چودہ سو برس پہلے یزید کی افواج کے ہاتھوں شہید کر دیے گئے تھے۔ 'یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ہمارے شہداء کا خون، کربلا کے شہداء کے خون، ان کے قتل کا تسلسل ہے' خمینی نے لکھا، 'یہ ہمارا دینی اور قومی فرض ہے کہ اس دن، یعنی چہلم کے دن جلوس نکالیں اور اس ظلم پر سراپا احتجاج بن جائیں'۔ اب کی بار مارشل لاء نہیں ہٹایا گیا، سخت کرفیو میں بھی کربلا کا سانحہ ایک دفعہ پھر لاکھوں لوگوں کو سڑکوں پر لانے کا محرک بن گیا۔ لوگوں کا ایک سمندر تھا، جس جلوس میں دیکھیے، ہزاروں اور لاکھوں لوگ جمع تھے۔ شاہ کی پولیس نے پھر گولیاں چلائیں اور اس موقع پر مزید شہداء نکل آئے۔ اس کے بعد تو جیسے ساری رکاوٹیں بے معنی ہو گئیں۔ بات اتنی بڑھی کہ مہینے کے آخر تک شاہ کو حکومت چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کرنی پڑ گئی۔

انقلاب آ چکا تھا لیکن کئی لوگ کہتے ہیں کہ انقلاب تو آ گیا مگر ساتھ ہی انتقام بھی شروع ہو گیا۔ تحریک

کے کامیاب ہوتے ہی پرانی رنجشیں، مخالفتیں اور نظریات کی جنگ دوبارہ سے شروع ہو گئی۔ انقلاب کے صرف دو ماہ بعد ہی ایران کو 'اسلامی جمہوریہ' بنانے کا اعلان کر دیا گیا اور خمینی نے خود کو 'سپریم لیڈر' مقرر کر دیا۔ آزاد خیال مسلمان اور سیکولر حلقے اب خود کو اس مذہبی آگ کی تپش سے جھلسا ہوا پائیں گے، جسے انہوں نے مذہبی حلقوں کے ساتھ مل کر بھڑکایا تھا۔ انقلاب، ملائیت کے سامنے سرنگوں ہو چکا تھا۔ وہ آزادی جو قدیم زمانوں سے ایران یعنی فارس کا خاصا ہوا کرتی تھی، جاتی رہی۔ انصاف کے ایسے معیار مقرر ہوئے کہ جلد ہی ملک میں جاری طرز حکومت کو 'اسلامی آمریت' جیسے ناموں سے بھی پکارا جانے لگا۔ ہزاروں سیکولر اور آزاد خیال، انتہائی سرگرم عمل کارکن جو انقلاب میں پیش پیش رہے تھے، انہیں پابند سلاسل کر دیا گیا اور زیادہ تر کو موت کی سزائیں سنائی گئیں۔ عورتیں سر تا پا سیاہ حجابوں کے پیچھے چلی گئیں۔ وہ جوان عورتیں جو صرف پتلی چادریں لپیٹ کر ہاتھ میں ہلکی مشین گنیں اٹھائے، انقلاب کے دنوں میں تہران کی سڑکوں پر نعرے لگایا کرتی تھیں، خود کو 'زینب کی سپاہی' کہلواتی تھیں، جلد ہی روایتی کام کاج اور دروازے کے اندر، معمولی نوعیت کے دفتری امور میں مشغول کر دی گئیں۔ شریعتی کی زیادہ تر تعلیمات کو غیر اسلامی قرار دے دیا گیا۔ ان کی تصویریں کبھی خمینی کے قد آدم پوسٹروں اور بینروں پر ایک ساتھ نظر آتی تھیں، اب کہیں نظر نہیں آئیں گی۔ تب سے سرکاری تقریبات، اشتہارات، پوسٹروں، بینروں، ٹی وی، ریڈیو، ڈاک ٹکٹوں اور کرنسی نوٹوں پر بھی صرف خمینی ہی نظر آتے ہیں۔ شریعتی یوں غائب ہوئے، جیسے کبھی رہے ہی نہیں تھے۔

یہ قصہ یہیں پر تمام نہیں ہوا بلکہ 'کربلا کا عنصر' اس کے بعد بھی بدستور استعمال میں رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب اسے ردوبدل کر کے، جوڑ توڑ اور قومیت کے لیے کارآمد بنا دیا گیا۔ یہ پچھلی صدی میں اسی کی ہی دہائی کا واقعہ ہے، جب ایران اور عراق کے بیچ جنگ جاری تھی۔ ہزاروں نوعمر لڑکے، سرپٹیاں جن پر 'کربلا' کاڑھا ہوتا تھا، جنگی علاقوں میں بارودی سرنگیں صاف کرنے کے کام پر لگا دیئے گئے۔ یہ بارودی سرنگیں صاف کرنے کا روایتی طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے، جس کے لیے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ یہ جتھوں میں تقسیم ہو کر آگے پیچھے کئی صفیں بناتے اور ناک کی سیدھ میں عراقی سرحد کے اس پار جہاں بارودی سرنگیں نصب کی گئی تھیں، دوڑ لگا دیتے۔ راستے میں جتنی بارودی سرنگیں آتیں، پھٹ

جاتیں اور یوں ایرانی افواج کے لیے راستہ صاف ہو جاتا۔ ان میں سے ہر لڑکا ایمانی جذبات سے شرابور، جنت کمانے کی دھن میں گم ہوتا تھا، یا صاف کہیں تو گم کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہراول دستوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے وقتاً فوقتاً مشہور گائیکوں اور قوالوں کے اگلے مورچوں پر جا کر محافل منعقد کرنے کا بھی انتظام کیا جاتا۔ یہ گائیک کربلا کو یاد کر کے گریہ وزاری کرتے، واویلا مچاتے اور فوجیوں میں کہرام مچ جاتا۔ صرف افواج ہی نہیں، یہ گویے بھی ایمان کی حرارت میں پکے تھے۔ اس زمانے میں سب سے مشہور ہونے والا ایسا ہی ایک گائیک، 'خمینی کی بلبل' کہلایا۔ خمینی 'کربلا کے عنصر' کو کام میں لاتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ گئے تھے، اسی کو مصرف میں لا کر حکومت کا انتظام پوری طرح سنبھال لیا اور پھر اسی کے بل بوتے پر ایران میں ملائیت کا گھر کھڑا کیا۔ وہ مذہب کے اسی کردار کو، جس کردار سے عرصہ پہلے شریعتی نے خبردار کیا تھا، سامنے لے آئے۔ یعنی پہلے مذہب کے ذریعے لوگوں کو شاہ کے خلاف بھڑکایا، پھر اسی کے بل بوتے پر ایرانی عوام کو ریاست کے اصل حاکموں، یعنی ملاؤں کی اطاعت اور فرمانبرداری پر مجبور کر دیا گیا۔

یہ تو ایران کا قصہ ہے۔ دوسری طرف وہ جگہ جہاں کربلا نے جنم لیا تھا، یعنی عراق میں اس عنصر کو آسانی سے قابو نہیں کیا جا سکے گا۔ یہاں تو اس کے ساتھ ماجرا یہ ہوا کہ کربلا کے واقعے نے ماضی اور حال کو ہی نہیں، مستقبل کو بھی ایک ہی طرح، ایک ساتھ جوڑ دیا۔ آج چودہ صدیاں گزر گئیں مگر عراق میں زمانے کی ان تین حالتوں میں کبھی کوئی فرق ہی نہیں رہا۔

کربلا میں حسین علیہ السلام کے پانچ بیٹوں میں سے صرف ایک ہی زندہ بچ پایا۔ شیعہ کے لیے وہی ایک ہی کافی تھا۔ علی زین العابدین، شیعہ کے بارہ اماموں میں چوتھے امام ہوں گے۔ ان بارہ اماموں کی تصویروں والے پوسٹر شیعہ کے یہاں عام مل جاتے ہیں۔ ان تصاویر میں زیادہ تر سارے امام اردو کے ہندسے آٹھ (۸) کی شکل میں دو صفیں بنا کر بیٹھے نظر آتے ہیں اور علی ان سب کی امامت کرتے ہوئے، یعنی سالار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی۔ امام کا منصب سنبھالنے والا ہر بیٹا بالضرور ہی عالم دینیات، الہام کا پیارا اور الہام کی ہی طرف سے عطا ہونے والے اس رتبے کا نہ صرف اہل سمجھا جاتا تھا بلکہ اس نے اپنی زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر رکھی ہوتی تھی۔ شیعہ کا ماننا ہے کہ کربلا کے بعد سے ہر امام کو

زہر دے کر عمداً مارا گیا۔ یہ امام پہلے امویوں اور پھر ان کے بعد آنے والے عباسیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں سے ہر ایک، سوائے آخری یعنی بارہویں امام کے، باقی سب کو ایک ایک کر کے یوں ہی قتل کر دیا گیا۔ ان پوسٹروں میں بارہویں امام کے چہرے کی کوئی شبیہ نہیں ملتی۔ تو جہاں تصویر ہونی چاہیے، وہاں سفید ہالہ سا بنا ہوتا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ تقدس اور حرمت کی روشنی اس قدر تیز ہو سکتی ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔

شیعہ کا نکتہ نظر اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ اماموں میں سے چوتھے، پانچویں اور چھٹے نے۔۔۔ یعنی بالترتیب حسین علیہ السلام کے فرزند، پوتے اور پڑپوتے جعفر صادق نے مدینہ میں بھرپور زندگی گزاری۔ جعفر صادق وہ ہیں جنہوں نے پہلی بار شیعہ کے مذہبی عقائد کو باقاعدہ شکل دی۔ شیعہ میں عام خیال یہی ہے کہ انہیں بھی زہر دے کر مارا گیا تھا مگر یہ تاریخی حقیقت سے زیادہ ایمان کا معاملہ بن چکا ہے۔ ریکارڈ میں اس بابت کوئی ایسی اطلاع، غیر قدرتی طریقے سے موت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ جب عباسیوں کا دور آیا تو بارہویں کے علاوہ اس دور کے باقی ماندہ تمام اماموں کی طبعی عمریں، اپنے آباء کے مقابلے میں کم رہی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ بہت جلد اس دنیا سے چل بستے رہے یا غالباً روانہ کر دیے گئے۔

کربلا کے تقریباً ستر سال بعد عباسیوں نے امویوں کو حکومت سے نکال باہر کیا اور خلافت کو شام سے واپس عراق میں لے آئے۔ 762ء میں انہوں نے دجلہ کے کنارے سلطنت کا ایک نہایت شاندار دار الخلافہ تعمیر کروایا۔ یہ شہر ایک بے عیب دائرے کی شکل کا ہوا کرتا تھا۔ اسے اوائل دور میں عربی زبان میں 'مدینۃ السلام' یعنی 'امن کا شہر' کہا گیا لیکن جلد ہی اس کا نام تبدیل ہو کر بغداد پکا ہو گیا۔ بغداد فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی 'جنت کا تحفہ' ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا دور چل رہا تھا اور اسلامی سلطنت کی سرحدیں سپین سے لے کر ہندوستان تک پھیل چکی تھیں۔ ایسے میں، بغداد بے شمار علوم، بشمول سائنس اور آرٹ کا انتہائی مشہور اور غیر معمولی مرکز بن چکا تھا۔ یہ شہر بغداد ہی تھا جہاں علم ریاضی نے جدت اور نت نئی دریافتوں میں آسمان کی حدوں کو چھو لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں اور اس دور میں ہونے والی تحقیق کا

بھی کوئی جواب نہیں۔ مثلاً ریاضی کا مشہور علم الجبرا، اسی دور میں پروان چڑھا۔ 'الجبرا' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس دور میں فنون لطیفہ اور ادبی تخلیقات بھی بے پناہ ہوئیں۔ جیسے سب سے مشہور زمانہ کہانیوں کی کتاب 'الف لیلۃ و لیلۃ' یعنی 'ایک ہزار ایک رات' اسی دور میں عربی ادباء نے لکھی تھی جس میں بعد ازاں ایرانی، مصری اور ترک قصہ خوانوں نے بھی حصہ ڈالا۔ اس کتاب میں کئی کہانیاں اور حکایات ایسی ہیں، جو 'ہارون الرشید کے زمانے۔۔۔' سے شروع ہونے والے افسانوی قصے اور حکایات ہیں۔ اسی دور میں مورخین کی بھی خوب چاندی تھی۔ تاریخ دان، مثلاً الطبری کی ہی مثال لے لیں۔ ال طبری کی لکھی تاریخ پر ہی یہ کتاب اور آج کئی دوسری تواریخ اور پیغمبر خدا کی سوانح لکھی گئی ہیں، اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ الغرض، یہ علم و ادب کے لیے واقعی سنہری دور تھا اور بغداد اس کا مرکز تھا۔ لیکن شیعہ کی نسبت سے کہیں تو انہیں اس سنہری دور کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ عباسیوں نے شیعہ کی پر زور حمایت کے بل بوتے پر امویوں سے قیادت اور اختیار واپس حاصل کیا تھا۔ عباسی خود کو عباس سے جوڑتے تھے۔ عباس، محمد ﷺ کے چچا تھے اور یہ سلطنت عباسیہ کے خلفاء انہی کی اولاد تھے۔ اگرچہ عباس ہو بہو 'اہل بیت' تو نہ تھے مگر ان کی اولاد نے اپنے آپ کو ان کے سب سے قریب ہی گردانا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ لیکن جب ایک دفعہ اقتدار عباسیوں کے ہاتھ آ گیا تو انہوں نے بھی شیعہ کا نعرہ ترک کر دیا اور یوں انہیں، یعنی شیعہ کو ایک دفعہ پھر سے غداری اور جفا کے احساس اور حالات نے آن گھیرا۔ یوں، شیعہ میں بھی اسی وجہ سے تقسیم در تقسیم شروع ہو گئی۔ وہ جو عباسیوں کے سخت خلاف تھے، ان میں زیدی سب سے آگے تھے۔ یہ یمن سے تعلق رکھنے والے شیعہ سلسلے کے داعی تھے اور ان میں سے اکثر کا یہ ماننا تھا کہ دراصل امامت صرف سات لوگوں تک محدود ہے۔ ان کے علاوہ اسماعیلی ہیں جو پہلے پہل یہ مانتے تھے کہ امام پانچ ہی ہیں اور یوں انہوں نے اپنے لیے علیحدہ سے قیادت کی جنگ چھیڑ دی۔ ایک اسماعیلی شاخ نے فاطمید نامی شاہی سلسلے کی بنیاد رکھی اور مصر پر اپنی خلافت قائم کی۔ یہ یہی اسماعیلی تھے، یعنی فاطمید سلطنت کے سلاطین جنہوں نے شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی تھی اور مصر پر دسویں سے بارہویں صدی تک حکومت کی۔ اسماعیلی فرقے کی دوسری شاخ آج بھی باقی ہے اور آغا خان اس کے روح رواں ہیں۔ لیکن شیعہ کی اکثریت آخر میں زیادہ سے زیادہ بارہ اماموں پر متفق ہو جائے گی اور انہی بارہ

اماموں کے طریق پر زندگی گزارنے پر زور دیا جائے گا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اماموں کا زیادہ تر زور اسی بات پر رہا کہ بجائے سنی خلفاء کی مخالفت جاری رکھیں، اپنے دینی عقائد اور مشغولات پر توجہ دی جائے۔

حسین علیہ السلام کے بعد سب ہی اماموں کا یہی وطیرہ رہا۔ انہوں نے خود کو سیاسی امور سے دور کر لیا اور خالصتاً سارا وقت علم دینیات کے لیے وقف کر دیا۔ امویوں نے بھی ایک طرح سے ان کی اس حکمت عملی کو قبول کر لیا اور وہ انہیں اس وقت تک چھیڑنے سے باز ہی رہے جب تک کہ وہ صرف مدینہ میں بیٹھ کر علم و عرفان نہیں پھیلاتے رہے۔ جہاں تھوڑی سی مشکل پیش آتی، اب بات چیت کر کے، مکالمے کے ذریعے معاملات کو سنبھال لیتے۔ مگر عباسی پھر بھی آ کر رہے۔ لیکن آتے ہی، انہیں ان اماموں سے خطرے کی بو آنے لگی۔ یہ امام بجا طور پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل سے تھے اور ان کا شجرہ سیدھا نبی سے جا ملتا تھا، جو ظاہر ہے عباسیوں کا نہیں تھا اور یوں شیعہ کا نام لے کر ان کے دعویٰ قیادت کے خلاف جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جو امام ہیں، کسی بھی وقت، اگر وقت آیا تو مزاحمت اور بغاوت کا نشان بن سکتے ہیں۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ جہاں امویوں نے ان اماموں کو مدینہ میں امن اور آشتی سے بسر کرنے کی اجازت دے دی تھی، عباسیوں نے انہیں یہیں نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے قریب لے آئے، تاکہ نظر رکھ سکیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ساتویں امام کے دور امامت سے، ہر امام کو عراق بلا لایا جاتا اور یہاں اس کا زیادہ وقت جیل میں گزرتا یا پھر اسے ہر وقت اپنے گھر میں ہی نظر بندی جھیلنی پڑتی۔ چونکہ ان کی بسر پہرے میں رہا کرتی تھی اور اس پر امن زمانے میں بھی، ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی طبعی عمر کو نہیں پہنچ پایا۔ عین ممکن ہے کہ انہیں زہر دے کر مار دیا گیا ہو گا۔

مشرق وسطیٰ، بالخصوص عراق میں آج سنہری گنبد والے کئی مزارات ہیں۔ عام لوگ بالخصوص مغرب کے لوگ ایران اور عراق میں واقع ان سنہری گنبد والے مزاروں کی تعداد اور مقبروں کی ایک ہی جیسی طرز تعمیر اور مختلف شہروں میں واقع ہونے کے سبب، ان کے بارے اور پس منظر کو سمجھنے میں دشواری محسوس کر سکتے ہیں۔ احوال یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر مقبرے، شیعہ اماموں کے ہیں۔ علی کے مزار پر تعمیر شدہ سنہری مقبرہ نجف میں واقع ہے۔ کربلا میں ایسے دو مقبرے ہیں، جن میں سے ایک حسین

علیہ السلام اور دوسرا ان کے سوتیلے بھائی عباس کا ہے۔ ان دونوں مزارات پر ہر سال عاشورہ کے موقع پر اور عام دنوں میں بھی زائرین کارش لگا رہتا ہے، لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی کے مزارات عظمت میں ان سے کم ہیں۔ بغداد کی ہی حدود میں واقع 'کاظمین' کے نام سے موسوم سنہری گنبد والے مقبرے ہیں جن میں ساتویں اور نویں اماموں کے مزارات ہیں۔ ایران کے شہر مشہد میں 'مقبرہ امام رضا' ہے جس میں آٹھویں امام کا مزار ہے۔ دسویں اور گیارہویں اماموں کی قبریں بغداد شہر سے ساٹھ میل دور شمال کی جانب دریائے دجلہ کے ساتھ واقع قدیم شہر سامرہ یا سامرا کے 'عسکریہ' کے مقبروں میں واقع ہیں۔

سامرہ میں دفن دو اماموں کے مزارات کو 'عسکریہ' کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ ان کے شب و روز اور بالآخر انجام سے جڑی ہے۔ عسکریہ عربی کا لفظ ہے جس سے مراد فوجی چھاؤنی یا کیمپ ہے۔ خلافت عباسیہ میں سامرہ کی یہی حیثیت تھی، مثال یوں سمجھیں کہ جیسے یہ شہر اس سلطنت کا پینٹا گون ہوا کرتا تھا۔ دسویں اور گیارہویں امام کو یہیں پر اپنے گھروں میں نظر بند کر کے رکھا گیا تھا اور ان کا نام بھی اسی نسبت سے 'عسکری' مشہور ہو گیا، یعنی 'وہ جو فوجی چھاؤنی میں' میں بسر رکھتے تھے یا ان کی بسر عسکریہ میں تھی۔

شیعہ کے یہاں عسکریہ کے مزارات کی اہمیت ایک لحاظ سے دوسرے تمام مزارات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ شیعہ کا ماننا ہے کہ بارہویں امام نے یہیں، سامرہ کی چھاؤنی میں گیارہویں امام کے یہاں جنم لیا تھا۔ یہ امام، یعنی بارہواں امام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحیح معنوں میں جانشین ہے۔ فاطمہ اور علی کا خون ہے اور رہتی دنیا تک شیعہ کا نجات دہندہ ہے۔

بارہویں امام کی سالگرہ ہر سال اسی جوش و خروش سے منائی جاتی ہے جیسے عیسائی کرسمس یا عیسیٰ کی پیدائش کا دن مناتے ہیں۔ شیعہ کے یہاں اگر عاشورہ غم اور ماتم کا دن ہے تو بارہویں امام کی سالگرہ خوشی اور جشن کا موقع ہوتا ہے۔ جیسے کرسمس کی شام، ویسے ہی شیعہ کے یہاں 'عبادت اور نیک تمناؤں کی رات' منائی جاتی ہے۔ اس رات گھروں میں چراغاں کیا جاتا ہے، قمقمے روشن ہوتے ہیں اور لوگ دعوت اور خوشی کی محافل کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسلامی مہینے شعبان کی پندرہ تاریخ کی رات شیعہ خوشی مناتے ہیں اور خوب ہلا گلا ہوتا ہے۔ بچوں میں مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں اور آتش بازی کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس رات کو

قسمت کی رات بھی کہا جاتا ہے۔ ماننا یہ ہے کہ عبادات اور دعائیں فوراً قبول ہوتی ہیں، تقدیر لکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شیعہ اس رات سامرہ کا نہیں، جہاں بارہویں امام کی پیدائش ہوئی تھی، بلکہ کربلا کا رخ کرتے ہیں۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ امام لوٹ کر یہیں آئیں گے اور یوں آئیں گے کہ ایک طرف حسین علیہ السلام اور دوسری جانب عیسیٰ ہوں گے۔

بارہویں امام کا پورا نام محمد ال مہدی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ جسے مقدس روح، الہام نے سکھلا، سدھا رکھا ہے۔ انہیں کئی دوسرے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے، جیسے 'ال قائم' یعنی وہ جو باقی ہے مگر اٹھا دیا گیا، 'صاحب الزماں' یعنی زمانوں کا شاہ، 'ال منتظر' یعنی جس کا انتظار کیا گیا ہے۔ عام طور پر، روزمرہ بات چیت میں لوگ انہیں 'امام مہدی' یا 'مہدی' ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ گیارہویں امام اور بازنطینی فرمانروا کی مقید پوتی کی خفیہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کو بھی مخفی رکھا گیا تھا تاکہ عباسیوں کو خبر نہ ہو اور انہیں بھی زہر نہ دے دیں۔ لیکن مہدی کے والد، یعنی گیارہویں امام کا 872ء میں انتقال ہوا تو اس وقت مہدی کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ یوں، انہیں تحفظ اور بچا کر رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ شیعہ میں یہ ایمان کی حد تک مانا جاتا ہے کہ اسی سال مہدی کو خود الہام نے دنیا سے چھپا لیا اور سامرہ شہر کے نیچے واقع ایک غار میں اتار دیا۔

مزید یہ مانتے ہیں کہ وہ کافی عرصہ تک اس غار میں ہی بسر کرتے رہے۔ ان کا یہاں انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ 'احتجاب' یا 'گرہن' کی حالت میں چلے گئے، یعنی چھپ گئے۔ یہ لفظ احتجاب یا اصل معنوں میں گرہن جو ہے، اس حالت کے مفہوم کو خوب بیان کرتا ہے۔ وجہ یہ کہ یہ ستاروں کے علم یعنی فلکیات کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب ایک فلکی جسم دوسرے اور تیسرے فلکی جسم کے بیچ حائل ہو جائے تو دوسرے فلکی جسم کا مشاہدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چاند گرہن یا سورج گرہن آسانی سے سمجھ میں آنے والی مثالیں ہیں۔ یہ تو لغوی معنی ہیں مگر مہدی سے متعلق ایمان کو سمجھنے کے لیے یہ لفظ 'گرہن' پورا نہیں پڑتا، اسی لیے 'استتجاب' کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ استتجاب سے مراد اخفا، رازداری یا پردہ داری وغیرہ ہے۔ اسی لیے عام طور پر مہدی کو مخفی امام بھی کہا جاتا ہے، شیعہ پوسٹروں میں ان کی شبیہ نہیں ملتی۔

شیعہ کہتے ہیں کہ مہدی کا یہ استعجاب یا اخفا مستقل نہیں ہے۔ یہ ایک عارضی حالت ہے۔ اسے عدم موجودگی یا عدم وجود نہ سمجھا جائے بلکہ یہ صرف ظہور کا تعطل ہے۔ یہ تعطل اب تقریباً ایک ہزار سال سے جاری ہے۔ مہدی بالآخر لوٹ آئیں گے، بلکہ یوں کہیے کہ دوبارہ اسی وقت ظاہر ہوں گے جب قیامت قریب ہو گی۔ وہ قیامت سے پہلے امن اور انصاف قائم کریں گے، بدی کو ایک جنگ میں شکست دیں گے۔

مہدی کے ظہور کی تاریخ اور دن سب کو معلوم ہے۔ وہ دسویں محرم کو، یعنی جس دن حسین علیہ السلام کو کربلا میں قتل کیا گیا تھا، ظاہر ہوں گے۔ لیکن کس سال؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح دوبارہ ظہور ہمیشہ ہی قریب الوقوع محسوس ہوتا ہے۔ یعنی ہر سال یہ امکان رہتا ہے کہ شاید اب کے برس وہ ظاہر ہو جائیں؟ یہ بھی مشہور ہے کہ ان کا ظہور امت کے لیے سخت پریشانی اور مشکل کے دور میں ہو گا اور وہ مسلمانوں کی مشکل آسان کریں گے۔ یعنی، وہ اسلام کے مسیحا ہوں گے۔

گیارہویں صدی میں لکھے جانے والے ایک تحقیقی مقالے، جس کا حوالہ آج مسلمانوں کے یہاں زور و شور سے دیا جاتا ہے، اس میں ان نشانیوں اور شگون کو جمع کیا گیا ہے جو سنیوں کے مطابق امام مہدی کے ظہور اور شیعہ کے یہاں دوبارہ ظہور تک رونما ہوں گی۔ ان میں سے اکثر نشانیاں اور علامتیں عیسائیوں کے لیے نئی نہیں ہیں، عیسائیت میں انہیں 'کشفی رویت' کہا جاتا ہے۔ مثلاً، قدرت کا طریقہ (موسم وغیرہ) بدل جائے گا، سورج اور چاند گرہن ایک ہی مہینے میں دیکھنے کو ملیں گے، سورج مغرب سے طلوع ہو گا، سیاہ آندھی چلے گی، زلزلوں کی بہتات ہو جائے گی اور دنیا بھر میں فصلوں پر ٹڈی دلوں کے حملے بڑھ جائیں گے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدرت کے طریقے یعنی موسمیاتی تبدیلیاں، قدرتی آفات، نظام قدرت میں بد نظمی اور انتشار میں انسان کا عمل دخل ثابت ہے۔

اوپر بیان کردہ شگون کے علاوہ بھی کئی دوسری نشانیاں ہیں۔ جیسے لادینی بڑھ جائے گی۔ آسمان سے آگ برسے گی جو کوفہ اور بغداد کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گی۔ جھوٹے مہدی ظہور کا دعویٰ کریں گے اور ایک دوسرے سے خونی جنگ کریں گے۔ مسلمان تنگ آکر ہتھیار اٹھا لیں گے اور بیرونی حملہ آوروں کو نکال کر اپنی زمین کا دوبارہ سے انتظام سنبھال لیں گے۔ ایک بہت بڑا تنازعہ کھڑا ہو گا جس میں سارا ملک شام

تباہ ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اور کئی دوسری نشانیاں آج کے جدید دور میں مشرق وسطیٰ پر فٹ بیٹھتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں نے ان طاقتوں کو 1979ء کے انقلاب میں تنگ آ کر نکال باہر کیا جو بیرونی پشت پناہی سے حکومت کر رہی تھیں۔ تب انقلابیوں نے کئی امریکیوں کو یرغمال بنا لیا تھا اور پھر بعد میں حکومت ایران نے انہیں، یعنی شاہ کے حامی مغربی ایجنٹوں کو ملک بدر کر دیا تھا۔ اسی طرح 2003ء میں بغداد پر امریکی حملے کے شروع دنوں میں آسمان سے بموں کی شکل میں آگ برسائی گئی۔ آج جھوٹے مہدی اس امریکی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لیے ایک دوسرے سے مسلح ہو کر گتھم گتھا ہیں۔ شام میں جاری خانہ جنگی کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے مگر اس ملک بارے مشرق وسطیٰ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اصل تنازعہ اسرائیل کے ساتھ ہے۔ ملک اسرائیل اور فلسطین کا علاقہ کبھی اسلامی سلطنت میں صوبہ شام کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

خمینی نے اقتدار سنبھالتے ہی امریکہ کے خلاف شدید مخالفت پر مبنی انداز اپنا لیا اور قدم جمانے کی غرض سے یہ اعلان کیا کہ وہ مہدی کے نمائندہ ہیں۔ گویا وہ مہدی کی مرضی، انہی کا کام کر رہے تھے۔ جلد ہی یہ افواہ بھی مشہور ہو گئی کہ مہدی کوئی اور نہیں بلکہ خمینی خود ہیں اور ان کا دنیا میں پھر سے ظہور ہو چکا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ افواہ کہاں سے نکلی۔۔۔ کیا کیا جائے کہ افواہوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ماخذ کا پتہ نہیں چلتا، لیکن ایسا ماننے میں کوئی عار نہیں کہ عام طور پر افواہ وہیں سے جنم لیتی ہے جس کے مفادات جڑے ہوں یا جسے افواہ سے فائدہ پہنچتا ہو۔ چونکہ عام لوگ، کربلا کے عنصر پر مبنی بیانیے کی وجہ سے خمینی کو پہلے ہی 'حسین علیہ السلام کا جانشین' اور 'اس دور کا حسین علیہ السلام' وغیرہ قرار دیتے آ رہے تھے، یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ وہ تیسرے امام سے سیدھا بارہویں امام کی مسند پر جا بیٹھیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جلد ہی خمینی اپنے لیے بھی 'امام' کا خطاب منتخب کریں گے اور اب وہ 'روح اللہ خمینی' یا صرف 'خمینی' نہیں بلکہ 'امام خمینی' بن جائیں گے۔ گماں یہ ہو گا کہ جیسے وہ بارہ اماموں کے جانشین ہیں۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ اپنے بارے ان افواہوں کی خمینی نے تصدیق کی اور نہ ہی کبھی تردید کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ خیر، یہ افواہیں

آخر کار اس وقت دم توڑ گئیں جب خمینی 1989ء میں انتقال کر گئے۔ انہیں تہران میں دفن کیا گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی قبر پر بھی سونے کا پانی چڑھا کر ایک سنہری گنبد تعمیر کیا گیا۔ اس مقبرے کے گنبد اور چار میناروں کا ڈیزائن تقریباً علی اور حسین علیہ السلام کے مزارات جیسا ہی ہے۔

یہ نجات دہندہ کا جو معاملہ ہے، بہت دور تک جاتا ہے۔ پچھلی صدی میں اسی کی دہائی کے دوران ایران اور عراق کے بیچ جنگ میں بھی اس سے خوب مدد لی گئی۔ ایرانی افواج کے ہراول دستے رات گئے جب اگلے مورچوں پر چوکنا بیٹھے ہوتے تو اچانک کیا دیکھتے کہ سامنے سے ایک سفید لباس میں ملبوس بزرگ ہستی، سفید رنگ کے ہی گھوڑے پر سرپٹ دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ کہا جاتا کہ آخر یہ مہدی کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟ یہ پراسرار بزرگ ہستیاں، بعد میں پتہ چلا کہ اصل میں پیشہ ور اداکار تھے۔ ان کا مقصد وہی اثر پیدا کرنا تھا، جس کی ایرانی افواج کو اس وقت اشد ضرورت تھی۔ تاہم ثابت ہو جانے کے بعد بھی، ان 'کرشمات' بارے کبھی کسی نے وثوق سے یہ نہیں کہا کہ اصل میں یہ کیا قصہ تھا۔ یہ اظہار عقیدت تھا یا وہی پرانا حربہ جس کے تحت انتہائی درشتی کے ساتھ ہر دلعزیز عوامی سوچ اور ایمان کو بیچ میں لا کر جھوٹی سازش رچانا مقصود ہوتا ہے؟

خیر، یہ تو تب کی بات تھی۔ لیکن 2005ء میں جب احمدی نژاد نے ایرانی صدارت سنبھالی تو ان کا طریق کسی بھی طرح سے سازشی یا چھل پرت نہیں تھا۔ احمد نژاد ایک انتہائی صاف گو اور کھرا آدمی مشہور ہے اور یہ بات درست ہے۔ وہ اپنی سوچ کسی مقبول رائے عامہ کو توڑ مروڑ کر ترتیب نہیں دیتے بلکہ جس چیز پر ان کا ایمان ہے، اسی کو سیدھا سیدھا، لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں مغرب میں انتہا کی حد تک خطرہ سمجھا گیا اور ان کے دور میں ایران کے دنیا کے ساتھ سفارتی تعلقات تقریباً ہمیشہ ہی کشیدہ رہے۔ بات یہ تھی کہ وہ جو کہا کرتے تھے، باقی دنیا، یہاں تک کہ ایران کے اتحادی ملکوں کے لیے بھی پریشان کن رہا کرتا تھا۔ مثلاً صاف کہتے تھے کہ حکومت ایران کی پالیسی اس اصول پر کاربند ہے کہ مہدی کے ظہور کو جلد از جلد ممکن بنایا جائے۔ مہدی یا مسیحا کا یہ وہ تصور ہے جس سے عیسائی بنیاد پرست پہلے سے واقف ہیں۔ کٹر عیسائیوں کے یہاں بھی بہت عرصہ سے عیسیٰ، یعنی یسوع مسیح کے دوبارہ ظہور بارے یہی

بیانیہ رہا ہے اور اپنے تئیں، ان کی کوشش یہی رہتی ہے۔ دوسری جانب کٹر یہودیوں بنیاد پرستوں کا حال یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرز، یعنی یہودیت میں پہلے مسیحا کا جلد از جلد ظہور چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر، اسرائیل پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہے، کٹر یہودیوں کے ان عزائم پر دنیا بھر میں اکثر تشویش پائی جاتی ہے۔ بہر حال اس طرح کے بیانات کی وجہ سے احمدی نژاد صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے بھی 'سچائی کی حد تک، مقبول ایمانی جذبات' پر مبنی مذہبی نظریات کے در پر دستک دیتے ہوئے پائے جاتے رہے۔ معاملہ پھر بھی سنبھل جاتا مگر ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ احمد نژاد کا انداز عجب رخ اختیار کرتا گیا۔ اب وہ نہ صرف پہلے سے زیادہ 'جلد از جلد ظہور' کی اشاریت کو کام میں لانے لگے بلکہ اپنے اس تصور کو انہوں نے اسے ایرانی انقلاب کی بنیاد یعنی امریکہ اور اسرائیل مخالف مشن کے ساتھ بھی جوڑ دیا۔ آخر میں یہ حال ہو گیا کہ ان کی طرز حکمرانی اور سفارتی معمولات اسی ایک نکتے تک محدود ہو کر رہ گئے اور دنیا بھر میں ایران کے نام کو شدید نقصان پہنچا۔ صرف نام ہی نہیں، ایرانی عوام کی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی گئی۔ صرف مغرب ہی نہیں، دنیا بھر میں ایرانی ریاست کے اس طرز عمل کی وجہ سے سفارتی اور ریاستی حلقوں میں شدید خوف پایا جاتا تھا۔ وجہ صاف تھی کہ ایک طرف تو ان عزائم کے پیچھے 'کشف' کا عنصر تھا جسے ایرانی صدر نے صاف صاف کہہ دیا تھا، دوسرا یہ امکان تھا کہ ایران کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی ہو سکتے ہیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھیں تو بڑی طاقتیں اس پریشانی میں گھر گئیں کہ اگر ایسا ہو گیا تو دنیا بھر کے لیے اس سوچ کے انتہائی خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ تو ایران کا قصہ ہے لیکن بات چل نکلی ہے تو پھر، یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسرائیل کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟ کیا وہاں بھی ایٹمی ہتھیار موجود ہیں؟ یا اسرائیل کی قیادت کس طور سوچتی ہے؟ بڑی طاقتوں کا ماننا ہے کہ اسرائیل کو وہ اپنے ہاتھ تلے رکھ کر قابو میں رکھ سکتے ہیں مگر شاید ایران کے معاملے میں، جہاں دوسرے عقائد اور ممالک بارے رویہ سخت نفرت پر آراستہ ہو اور ایسا دور آئے کہ ریاست کے اصول ہی قیامت برپا کرنے کی کوششوں پر چلائے جاتے ہوں، ایسے ملک کی ضمانت دینا، باقی تو سب کے لیے مگر اتحادیوں کے لیے بھی انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

عراق میں یہ ہوا کہ 'کشف' کو حقیقت کا روپ دینے میں قطعاً کوئی مشکل نہیں ہوئی بلکہ یہ خود چل کر گھر میں آ گیا۔ 2003ء میں امریکی حملے کے بعد وہ افراتفری پھیلی، تباہی ہوئی کہ مثال محال ہے۔ کشفی

نظریات کی عملی شکل کی ایک مثال یہ ہے کہ بنیاد پرست مذہبی رہنما مقتدی الصدر نے اپنی ملیشیا فوج کا نام انتہائی طاقتور، 'لشکر مہدی' منتخب کیا۔ یہ تو رہا ایک طرف، مقتدی الصدر کا عزم صرف امریکہ کو عراق سے نکال باہر کرنا نہیں تھا بلکہ اب جبکہ صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، وہ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جب یہ ہو رہے یعنی امریکہ نکل جائے تو پھر سنی شدت پسندی کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیں گے۔ 2008ء میں انہوں نے ایسا کر بھی دیا جب 'لشکر مہدی' کی مسلح تحریک کے سیاسی اور سماجی ونگ بھی قائم کر دیے، یعنی وہ اب پوری طرح سے پرانے کھاتے، یعنی طویل مدتی ایجنڈے کے تحت شیعہ سنی خانہ جنگی میں جت جائیں گے۔ ان کی یہ تحریک 'ممھدون' کہلائے گی، جس سے مراد 'مہدی کے لیے راہ ہموار کرنے والے' ہے۔

لیکن یہاں اس ایک مثال سے یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر کشف، ایمان اور یقین کو مستقبل کے لیے امید کا نشان بنایا جا سکتا ہے تو وہیں یہی کشف، ایمان اور یقین اس امید کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ فروری 2006ء میں یہی ہوا۔ ہوا یہ کہ کسی شخص نے، عین ممکن ہے کہ اس شخص کا تعلق سنی شدت پسند گروہ القاعدہ تھا، سامرہ میں عسکریہ کی مسجد میں انتہائی خوف ناک دھماکہ کر دیا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ مقبرے کا سنہری گنبد زمین بوس ہو گیا اور یوں شیعہ اور سنی کے بیچ ایک دفعہ پھر سے انتقامی کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ یہ عین اس وقت ہوا جب کافی عرصے بعد پہلی دفعہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید عراق میں اب امن قائم ہو رہا ہے اور خانہ جنگی کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ حالات اس وقت اور بھی بدتر ہو گئے جب اگلے ہی برس عسکریہ کی مسجد اور مقبرے میں پہلے دھماکے سے بچ جانے والے دو میناروں کو بھی ایک اور دھماکے سے اڑا دیا گیا۔

عراق میں القاعدہ اس سے زیادہ سخت طریقے سے اپنا پیغام ریکارڈ نہیں کروا سکتی تھی۔ اس حملے کے بعد شیعہ کے بچے بچے کے ذہن میں یہ بات سختی سے بیٹھ گئی کہ اس تباہی، بالخصوص عسکریہ کے مقام پر ہونے والی تباہی کا کیا مطلب ہے۔ دیکھیے، یہاں صرف دسویں اور گیارہویں امام کے مزارات ہی نہیں ہیں بلکہ ادھر 'الغائبہ' یعنی 'استجاب' کا مقام بھی ہے۔ یہ غار جس میں بارہویں امام نے اتر کر عارضی طور پر دنیا سے

'استعجاب' اختیار کر لیا تھا، دوبارہ ظہور تک وہ او جھل ہی رہیں گے۔

اس حملے میں اصل ہدف یہ غار تھا۔ مزارات پر پہلے بھی حملے ہوتے رہے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں کئی بار، باقی تو چھوڑو، حسین علیہ السلام کے مزار پر بھی کئی حملے ہوئے۔ ماضی قریب میں تو صدام حسین کے فوجیوں نے بھی ایک دفعہ اس پر دھاوا بول دیا تھا۔ اگر کوئی حسین علیہ السلام کے مزار پر حملہ کرتا ہے تو اس کا مطلب، وہ شیعہ اسلام کے قلب پر وار کرتا ہے۔ اگر کوئی نجف میں علی کے مزار کو نقصان پہنچاتا ہے، جیسا کہ 2004ء میں امریکی افواج نے یہاں سے لشکر مہدی کو نکالنے کے لیے حملہ کیا تھا، گویا وہ شیعہ اسلام کی روح کے در پر ہے۔ لیکن سامرہ میں عسکریہ کے مزارات پر حملہ؟ شیعہ کے نزدیک یہ انتہائی بد ترین فعل ہے۔ یہ مہدی پر ،یعنی شیعہ کی امید اور شناخت پر کھلم کھلا حملہ ہے۔ عسکریہ کے مقبروں کی دھماکے کے نتیجے میں تباہی صرف ماضی یا حال پر حملہ نہیں تھا بلکہ پرانے دشمن نے شیعہ کے مستقبل پر وار کیا تھا۔

باب 15

2004ء میں کربلا کے مقام پر عاشورہ کے اجتماع پر پے در پے کئی حملوں اور 2006ء میں عسکریہ کے مقام پر مسجد اور مزارات کو تباہ کر کے جس طرح سفاکی اور بربریت کا مظاہرہ کیا گیا، دونوں واقعات ایک دم خبروں کی سرخیاں بن گئے۔ اب دنیا بھر میں سب کا یہی اتفاق ہے کہ یہ دونوں حملے آج عراق میں جاری طویل فرقہ بند تصادم کی لہر کا نکتہ آغاز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حالیہ دور میں یہ واقعات عراقی عوام کی اجتماعی یادداشت اسی طرح میں کھب کر نقش ہو گئے ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے پیش آنے والے سانحات کی یاد تازہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک طویل عرصے بعد یہ محسوس ہوا کہ کربلا کی کہانی کا کوئی انت نہیں ہے۔ اس سانحے کے پیچھے کارفرما سوچ ویسی کی ویسی پختہ ہے اور وقت کے ساتھ یہ قصہ بڑھتا ہی جائے گا۔ نہ صرف یہ کہ لہو لہو داستان جاری رہے گی بلکہ آنے والے برسوں میں، ہر بار کسی نئے موڑ پر جب بھی ظلم اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جائے گا، اس کی اہمیت دوگنی اور چوگنی ہو جائے گی۔

لیکن بات یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں منزل کا کبھی بھی، صاف صاف تعین بھی تو نہیں کیا جا سکتا؟ لیکن یہ ضروری تھا اور پھر یہ کہانی آخر کہاں رکتی اور کیونکر ختم ہوتی؟ کربلا کے میدان میں قتل حسین علیہ السلام کے سو سال کے اندر شیعہ اور سنی کے بیچ تقسیم ایک واضح شکل اختیار کر گئی۔ تقسیم کا خط کھنچ گیا اور اب صورتحال یہ تھی کہ شیعہ اور سنی صحیح معنوں میں ایک ہی جسم کے دو الگ دھڑے بن گئے۔ یہ تو بالآخر ہونا ہی تھا مگر انتہا یہ ہوئی کہ جب اس پھوٹ کا واقعی ایک ڈھانچہ نظر آنے لگا تو اسے سیاسی نہیں بلکہ دین کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا۔ اس کی بھی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ وسیع و عریض اسلامی سلطنت میں خاصا تنوع پایا جاتا تھا۔ بے شمار نسلی گروہ تھے اور کئی علاقائی تہذیبیں اور مختلف معاشرے ایک ہی جھنڈے تلے جمع تھے۔ اب، اس عظیم الشان سلطنت میں غیر معمولی تنوع اور نمایاں گروہی اور علاقائی اختلافات تو تھے مگر اس کے ساتھ واضح سیاسی ہم آہنگی کا کوانتظام بھی نہیں تھا، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت کو چلانے کے لیے ایک مرکزی سیاسی ڈھانچے کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہو گیا۔ مثلاً، نویں صدی عیسویں میں جوں جوں عباسی خلافت کمزور ہو رہی تھی، سلطنت میں نچلی سطح پر سیاسی اور بڑے منظر نامے پر مذہبی حاکمہ مضبوط ہونے کے ساتھ، قدرتی

طور پر پہلے صرف دو مگر پھر آگے چل کر، جیسے آج کی دنیا میں نظر آتا ہے، کئی گروہوں میں بٹتی چلی گئی۔ چونکہ سیاسی موافقت اور اس بابت عمومی اتفاق رائے موجود نہیں تھا اور سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے یہ انتہائی ضروری تھا، اس لیے علماء یعنی مذہبی سکالروں نے اس انتہائی اہم ضرورت کے پیش نظر یہ مطابقت اور ہم آہنگی دین کی بجائے علاقائی، نسلی اور گروہی بنیادوں پر تشکیل دینا شروع کر دی۔ یوں ایک ہی سلطنت میں، ایک ہی دین کے کئی رنگ نظر آنے لگے جو بعد میں ہم دیکھیں گے کہ کیسے واضح ہو جائیں گے۔ علماء نے اس طرح خود اپنے لیے بھی وہ مقام اور رتبہ حاصل کر لیا جو آج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی رنگ برنگے گروہ اور ان دھڑوں کے بانی اور روح رواں عالم، عام مل جاتے ہیں۔ یعنی آج ہمیں کئی مکاتب فکر، گروہ اور فرقے نظر آتے ہیں اور ہر علاقے کا اپنا ایک علیحدہ رنگ ملتا ہے، اور ہر عالم اپنا علیحدہ حلقہ بنا کر بیٹھا ہے۔ جب امہ اس قدر متنوع ہو کہ آج پانچ میں سے چار مسلمان غیر عرب ہیں تو دین اور اسلامی دنیا کا یوں تہہ در تہہ کئی رنگوں میں بٹ جانا، اور بھی آسان ہو گیا ہے۔

یہ تو خیر وقت کی دھول کا نتیجہ ہے ورنہ واقعی بٹوارے کی، جیسا اس انقسام کو آج ہم دیکھتے ہیں، شروعات کیسے ہوئی، یہ بھی سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو احادیث کے شیعہ اور سنی، جدا مجموعے سامنے آگئے۔ ان مجموعوں میں پائے جانے والے فرق کی بنیاد تاریخی یادداشتوں کے حوالے اور اصل روایات ہیں۔ چونکہ تب پیش آنے والے واقعات کے کئی نسخے تھے، طرح طرح کی روایات مل جاتی تھیں اور اس زمانے کے ہر شخص کا اپنا مشاہدہ، ان کے بارے نکتہ نظر اور احوال بتانے کا طریقہ جدا اور موقف تھا، اس لیے اختلافات پیدا ہونا قدرتی بات ہے، یا کہیے ان روایات کا مختلف نظر آنا قدرتی بات ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک ہی واقعہ کی کئی راویات ہیں، یہ تو تاریخ کی خوبصورتی ہے۔ شیعہ اور سنی میں اختلافات اس بات پر نہیں کہ یہ کب، کیا، کہاں اور کیسے ہوا؟ اصل جھگڑا تو یہ ہے کہ جو ہوا، کہا اور کیا گیا۔۔ اس کا اصل مطلب کیا ہے؟ مثال کے طور پر، جہاں سنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہجرت کے دوران ہمراہی اور محمد ﷺ کی بیماری کے دوران امامت کا منصب سنبھالنا ثبوت ہے کہ آپؐ ابو بکر کو ہی جانشین مقرر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف شیعہ کا نکتہ نظر یہ ہے کہ غدیر خم کا واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمد ﷺ علی کو ہی جانشین بنانا چاہتے تھے۔ یہ شیعہ اور سنی کے بیچ واقعات اور روایات پر اختلاف کا صرف ایک نمونہ ہے ورنہ تاریخ

ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن یہی کلیہ پوری تاریخ پر لاگو کریں، یا کہیے بڑے منظر نامے کو دیکھیں تو اختلاف کچھ یوں ہے۔ ہوا یہ کہ سنیوں نے اپنے مکتب فکر میں تاریخ کو اسی طرح لاگو کیا، جس طرح یہ وقوع پذیر ہوئی تھی۔ مگر شیعہ نے اس کے بر خلاف تاریخ کو اس صورت میں اپنا لیا جیسا ان کے خیال میں اسے اصولی طور پر رونما ہونا چاہیے تھا۔ شیعہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ دنیاوی لحاظ سے تو تاریخ کا یہ رخ نہیں بن پایا مگر ان کی دنیا میں، ان کے لیے یہ ہمیشہ یوں ہی رہے گا۔ ان کے مطابق، یہ صرف دنیاوی میراث کا معاملہ تو نہیں ہے، اس کے ساتھ روحانیت کا ایک جہان جڑا ہے۔ قصہ مختصر، ایک جملے میں کہیں تو اختلاف 'کیا ہوا' اور 'کیا ہونا چاہیے تھا' کا ہے اور ظاہر ہے، اس بحث کی کوئی انت، ہو ہی نہیں سکتی۔

خیر، دسویں صدی تک خلافت عباسیہ تو تھی مگر سنی نظریات کے حامل عباسی خلفاء کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ اصل سیاسی طاقت اور حکومت آل بویہ کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ بویہ فارس کے شمال مشرقی علاقے سے تعلق رکھنے والے شیعہ نظریات کا حامی گروہ تھا۔ یہ بویہ ہی تھے جنہوں نے عاشورہ کے دس دن پر مشتمل ان ماتمی رسوم اور شعائر کی بنیاد ڈالی تھی جنہیں آج ہم ہر جا دیکھتے ہیں۔ لیکن خلافت کے لیے صرف بویہ ہی مسئلہ نہیں تھے، اس دور میں ان کی ہی طرح کم از کم دو حکومتیں دوسری بھی تھیں، جو خلافت کی اصل باگ ڈور چلا رہی تھیں۔ بجائے خلافت سنبھلتی، وقت گزرنے کے ساتھ مرکزی حکومت کی حالت پتلی ہی ہوتی چلی گئی اور 1258ء میں اتنی کمزور ہو گئی کہ ہلاکو خان، جو چنگیز خان کا پوتا تھا، اس کی سپہ سالاری میں منگولوں کے حملے کے سامنے ٹھہر نہ پائی۔ اس کا عملی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ کسی زمانے میں یہ ایک انتہائی مضبوط اور عظیم الشان سلطنت ہوا کرتی تھی مگر اب حال یہ ہوا کہ غرق ہو کر کئی چھوٹی چھوٹی، علاقائی سلطنتوں میں بٹ گئی۔ کئی شاہی سلسلے تھے، جن میں شیعہ اور سنی، دونوں ہی طرح کے سلاطین کا راج چلتا تھا۔ یعنی، دینی بنیادوں پر سیاسی رائے عامہ بنانے کے نتائج کھل کر سامنے آ گئے۔

یہ سلسلہ مزید دو صدی تک جاری رہے گا اور خلافت کے حالات میں قدرے بہتری آئے گی۔ بہتری سے مراد یہ ہے کہ بجائے چھوٹی سلطنتیں ہوں، اب صحیح معنوں میں دو بڑی سلطنتیں ہوں گی۔ صورتحال یہ ہو گی کہ مشرق وسطیٰ ایک دفعہ پھر اسی طرح تقسیم ہو چکا ہو گا جس طرح یہ کبھی بازنطینی اور فارسی سلطنتوں

میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اب کی بار نقشہ یہ ہو گا کہ ایک طرف ترکی میں سنی خلافت عثمانیہ اور فارس، یعنی آجکل ایران میں شیعہ صفوی سلطنت قائم ہو گی۔ صفوی سلطنت وہ ہے جس نے پہلی بار شیعہ اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب بنایا تھا۔ قدیم زمانے کی سلطنتوں کی طرح ان دونوں کے بیچ بھی گہری چپقلش رہے گی اور ان دونوں طاقتوں کے بیچ ایک بار پھر، اس کی بدنصیبی ملاحظہ کریں، عراق واقع ہو گا۔ ان بڑی سلطنتوں کی سرحدیں عراق میں ملتی تھیں اور اسی علاقے میں ان کے بیچ پر تشدد تصادم ہوا کریں گے۔

دونوں سلطنتوں کی آپس میں جاری چپقلش کے سبب عراق خون خرابے کا میدان بنتا ہی رہا مگر اس کے ساتھ، فرقہ بندی کی وجہ سے بھی ہولناک تشدد اور تباہی نے بھی اس بد قسمت علاقے کا مستقل گھر دیکھ لیا۔ مثلاً کربلا اس سارے عرصے میں کئی بار حملوں کا نشانہ بنا۔ ان میں سب سے خونخوار حملہ 1802ء میں وہابیوں نے کیا تھا۔ اسی طرح 1843ء میں ترک افواج نے بھی اس پر چڑھائی کی اور وحشیانہ طریقے سے شہر کی کل آبادی کے تقریباً پانچویں حصے کا گلے کاٹ کر قتل عام کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حملے کے دوران کربلا کا شہر ذبح خانے کا منظر پیش کر رہا تھا، گلیوں میں خون ہی خون بہہ رہا تھا۔ لیکن ایک بات توجہ کی متقاضی ہے کہ ان حالات میں بھی، یہاں اور دنیا بھر میں شیعہ اور سنی آبادی کا بڑا حصہ، یعنی لوگ اختلاف رائے پر ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے، عام عوام میں اس بابت، عمومی حالات میں کوئی غم و غصہ یا بھڑکاؤ نہیں تھا۔ روزمرہ معمولات زندگی میں تو اکثر ان اختلافات کو یکسر خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ دونوں مسالک کے علماء کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی، یعنی نظریات کا ٹھیلا الگ کر دینے اور علیحدہ علیحدہ رائے عامہ بنانے کے بعد بھی، مقبول مذہبی رجحانات اور عقائد کو کنڑول نہیں کیا جا سکا۔ وہ رسوم اور رواج جو عام لوگوں میں مقبول تھے، وہ سرکاری اور حکومتی ترجیحات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مثلاً عام شیعہ اور سنی، دونوں دھڑے ہمیشہ ہی دل و جان سے علی کی تعظیم سے کرتے تھے اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ اسی طرح بنیاد پرست سنی مکتب فکر میں مزارات کی زیارت وغیرہ 'شرک اور بت پرستی' کے زمرے میں رکھا جاتا تھا مگر عوام الناس نے، یعنی کئی سنی گروہوں نے بھی اس عمل کو ترک نہیں کیا۔ وہ بدستور زیارت کے لیے جاتے ہیں، دعائیں اور منتیں مانگتے ہیں۔ جو لوگ نہیں بھی جاتے، وہ مزارات میں دفن ہستیوں کی دل سے عزت اور ان کی حیثیت اور رتبے کا اعتراف کرتے ہی ہیں۔ جہاں ایک طرف عاشورہ کے

موقع پر اکثر ہی ماتمی جلوس اور دعائیہ تقاریب شدت پسند سنی حملوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں، وہیں گلی محلوں اور عام عوام میں سنی اپنے شیعہ ہمسائے کے ساتھ تعاون کرتے ہی ہیں۔ اکثر تو ان کے ساتھ مل کر شعائر میں باقاعدہ حصے لیتے ہیں اور عام گلی محلوں میں ایک دوسرے کی طرز زندگی پر، معاشرے کے دونوں دھڑوں کی ایک دوسرے پر رسوم اور ریت کی چھاپ ہمیشہ سے واضح نظر آتی رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دور میں شیعہ سنی فرقہ وارانہ مسائل کی جڑ دینی اختلافات نہیں بلکہ اس وقت کی سیاست اور سرکاری ضرورت رہی ہے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، ایمان اور ایقان، یعنی عقیدے کے ساتھ ہمیشہ سے ہی یہی سلوک ہوتا چلا آیا ہے۔ چاہے یہ آج امریکہ جیسے جدید ملک میں عقیدے کا سوال ہو یا کئی صدی پہلے مشرق وسطیٰ کا سیاسی منظر نامہ ہوا کرے، عقیدے کو سیاسی مقاصد کے لیے ہمیشہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ عقائد اور نظریات کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ نہایت آسانی سے مقصد پورا کر دیتے ہیں مگر جہاں تک شیعہ اور سنی اختلافات کی بات ہے، یہ تو ایسی سوکھی اور تیل میں تر لکڑی کا بالن ہے جسے سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے تیلی دکھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہلکی سی چنگاری بھی شعلوں کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔

خیر، اس دور میں اگر کوئی توازن رہا بھی کرتا تھا، وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ میں تقسیم در تقسیم کی وجہ سے بگڑ جائے گا۔ مغرب کا اثر و رسوخ بڑھنے اور مداخلت کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کا حلیہ بدل جائے گا۔ مغربی طاقتیں نڈر ہو کر، اس خطے کی اپنی ترجیحات اور تاریخ کی باریکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کئی تبدیلیاں لائیں گی۔ وہابی اور سعودی اتحاد جب جزیرہ نما عرب پر قبضہ کریں گا تو ایسا کرنے میں انہیں برطانیہ کی پشت پناہی حاصل ہو گی۔ اسی طرح شیعہ اکثریتی عراق پر ایک بیرونی سنی بادشاہ لا کر بٹھا دیا جائے گا اور نازیوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والا رضا خان، شاہ ایران بن جائے گا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ دنیا میں سپر پاور بن کر ابھرا۔ سرد جنگ کے نظریات کی ضرورت کے تحت امریکیوں نے ایران میں فوجی انقلاب کی راہ ہموار کی اور نئے منتخب شدہ وزیر اعظم محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کی جگہ رضا خان کے بیٹے شاہ رضا پہلوی کو شاہ ایران کی مسند پر لا بٹھایا اور اس کی خوب حمایت کی۔ یہ رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت کی ہی بات ہے کہ جب پہلی بار ایران میں ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کے خیال نے جنم لیا تھا۔ اندازہ لگائیں کہ تب ایرانیوں کے ان خیالات کو امریکی انتظامیہ کی طرف سے خوب شہ ملتی تھی۔ جہاں

ایک طرف شاہ ایران کو حمایت دی، وہیں دوسری جانب اس سارے عرصے کے دوران تقریباً ساری امریکی حکومتوں نے وہابی نظریات کی حامل سعودی بادشاہت کی بھی پشت پناہی جاری رکھی۔ مقصد صرف معدنی تیل کے ذخائر تک رسائی نہیں تھا بلکہ وہ سعودی فرمانرواؤں کے ذریعے بحیرہ احمر کے اس پار سوویت یونین کے حمایت یافتہ صدر ناصر کی حکومت کو بھی نکیل ڈال کر رکھے ہوئے تھے۔ سعودی بادشاہت کی مثال صدر ناصر اور سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے قلعہ کی تھی۔ یہ قصہ یہیں نہیں رکا بلکہ گزشتہ صدی میں اسی کی دہائی کے دوران امریکہ نے سعودی عرب اور پاکستان کے ساتھ اتحاد کیا اور افغانستان میں سوویت حملے کے خلاف 'مجاہدین'، جنہیں صدر ریگن 'حریت پسند' اور 'خدائی جنگجو' کہا کرتے تھے، فنڈ کرنا شروع کر دیا۔ سوویت یونین کے خلاف کئی عشروں سے جاری اس مہم کے نتیجے میں اس کا بھٹا تو بیٹھ گیا مگر افغانستان اور پاکستان میں اس 'جہاد' کے انتہائی مضر نتائج بر آمد ہوئے۔ امریکہ کے نکلتے ہی افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور آخر کار معاملات 'تحریک طالبان' کے ابھرنے پر منتج ہوئے۔ اسی دہائی کا واقعہ ہے کہ امریکہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ خود کو ایران اور عراق جنگ میں بھی دھکیل دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس جنگ میں امریکہ دونوں فریقین کو اسلحہ فراہم کرتا ہوا پایا گیا۔ ہوا یوں کہ اس نے کھل کر عراقی صدر صدام حسین کی پشت پناہی کی، مقصد انقلاب کے بعد ایران کو امریکہ مخالف نظریات پر سبق سکھانا تھا۔ مگر وہیں، دوسری طرف امریکہ 'یرغمالیوں کے بدلے ہتھیار' نامی گھٹاٹوپ پالیسی پر بھی گامزن رہا۔ یعنی ایران کی سخت مخالفت کے باوجود، اسے عراق کے خلاف ہتھیار فراہم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اوپر بیان کردہ امریکہ کی عجیب و غریب، غیر منطقی، سخت گیر اور بے ڈھب دخل اندازیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعہ اور سنی دونوں ہی گروہوں کے یہاں مغرب کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ یہ طبقات مغربیت سے اتنے سخت متنفر ہوئے کہ آج ہم شیعہ اور سنی، دونوں ہی فرقوں کی انتہا پسندانہ سوچ اور انقلابی سیاست کو مغرب سے بیزاری اور تنفر کی بنیاد پر کھڑا دیکھتے ہیں۔

آج اس پورے خطے میں مغربی طاقتوں کی ساز باز اور سازشوں کے خلاف پائے جانے والے خوف اور آزردگی کا ایران سے تعلق رکھنے والے تہذیبوں کے تنقید نگار علی احمد نے خوب اظہار کیا ہے۔ احمد نے

1962ء میں ایک انتہائی مقبول، بیسٹ سیلر کتاب 'غرب زدگی' لکھی تھی۔ اس مشہور زمانہ تصنیف میں وہ مغرب کی تہذیبی اور معاشی بالادستی کو ایک مہلک اور تباہ کن بیماری قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس بیماری کو ایرانی قوم کے سیاسی نظام سے نکال پھینکنا، ان کے الفاظ میں 'جڑ سے اکھاڑنا' انتہائی ضروری ہے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ پہلے ایرانی نظام اور پھر مجموعی طور پر دین اسلام اور پوری امت سے اس ناسور کا خاتمہ کرنا لازم ہے۔ احمد کے یہ خیالات سنی اور شیعہ اختلافات کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے، دور ملک مصر میں بنیاد پرست نظریہ ساز سید قطب کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سید قطب وہ شخص ہیں جنہوں نے جدید اسلامیت کی نظریاتی بنیاد رکھنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے 1964ء میں ایک کتاب 'این الطریق' کے نام سے شائع کی، جس کا انگریزی میں 'سنگ میل' کے نام سے ترجمہ بھی ہوا۔ قطب لکھتے ہیں، 'زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنے اور آدمی کی بادشاہت ختم کرنے سے مراد یہ ہے کہ غاصبوں سے اختیار چھین لیا جائے اور اسے واپس اللہ کو لوٹا دیں۔ اصل اختیار صرف اللہ کا ہے'۔ آخری بات، بلاشک وشبہ ساتویں صدی میں خوارج کے نعرے یعنی 'حکم اور فیصلہ صرف اللہ کا ہے!' کی گونج ہے۔ تب خوارج نے علی کی شدید مخالفت کی تھی اور بالآخر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سید قطب ساری زندگی 'اخوان المسلمین' نامی تنظیم سے جڑے رہے۔ اس تنظیم کو کئی دہائیوں تک سعودی یعنی وہابی مکتبہ فکر کی بھرپور حمایت حاصل رہی ہے۔

قصہ مختصر، جدید دور کے اسلام میں شیعہ اور سنی بنیاد پرست دھڑوں نے ایک ہی طرح سے اپنا یہی وطیرہ بنالیا کہ ساتویں اور بیسویں صدی کی زبردست آمیزش تیار کی جائے۔ یعنی یہ کہ کربلا کے عنصر اور مغرب مخالف جذبات کو یکجا کر دیا جائے۔ بیسویں صدی میں اسی کی دہائی کے دوران اس طرح کے نظریات کا پنپنا تھا کہ امریکی حمایت یافتہ سعودی بادشاہت کو خطرے کا اندیشہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب حال ہی میں برپا ہونے والے ایرانی انقلاب کا طوفان تھمنے میں نہیں آرہا تھا اور سعودی اچھی طرح جانتے تھے کہ عین ممکن ہے، کل کلاں سنی بنیاد پرستوں کی توانائیاں عرب میں بھی ایرانی انقلاب یعنی شیعہ جیسی کسی سیاسی کایا پلٹ کا سبب بن سکتی ہیں۔ چنانچہ سعودیوں نے اپنی اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ بجائے بنیاد پرستوں اور ان کے نظریات کو گھر میں رکھا کریں، کیوں نہ اس ٹک ٹک کرتے ہوئے بم کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا

جائے؟ ہم نے دیکھا کہ اس عرصے کے دوران، سعودی ایک دم ہی دنیا بھر میں وہابی شدت پسندی کے برآمد کنندہ بن گئے اور ساری کی ساری سنی بنیاد پرست توانائی شیعہ مخالف تحریکوں میں جھونک دی۔ یہ سعودیہ اور خلیجی ریاستوں کی طرف سے ملنے والی افرادی اور مالی قوت کا نتیجہ تھا کہ افریقہ سے انڈونیشیا تک سارے عالم اسلام میں ایرانی انقلاب کے بعد کی از سر نو مستحکم ہوتی ہوئی شیعہ شناخت اور طاقت کو قابو کرنے، اسے باندھنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ یوں، آج جدید دور میں شیعہ اور سنی کے بیچ پھوٹ اور انقسام، ایک دفعہ پھر اسی طرح سیاسی ہتھیار بن گیا، جس طرح پہلے دن سے بنتا چلا آیا ہے۔

اس آمنے سامنے کے دوران، لڑائی مار کٹائی میں ظاہر ہے سنیوں کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ انہیں یہ برتری حاصل ہے کہ عالم اسلام میں شیعہ کی تعداد بمشکل پندرہ فیصد ہے۔ لیکن اس طرح کی مجموعی شماریات گمراہ کن ہو سکتی ہیں، یاد رہے عالم اسلام میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے اور علاقائی و نسلی عوامل انتہائی اہم ہیں۔ وہ یوں کہ مشرق وسطیٰ میں، یعنی اسلام کے مرکز میں شیعہ کی آبادی تقریباً پچاس فیصد ہے۔ یہی نہیں، اس شیعہ آبادی کی بسر ان ملکوں میں ہے جہاں معدنی تیل کے بیش بہا خزانے ہیں۔ ایران، عراق، خلیج فارس اور یہاں تک کہ سعودی عرب کے مشرقی حصے میں بھی شیعہ کی اکثریت ہے۔ جب تک دنیا کی معیشت کا انحصار معدنی تیل پر رہے گا، یہ بازی اسی طرح لگی رہے گی جیسے کبھی اسلامی سلطنت کے سنہری دور میں جمی رہتی تھی۔ ایسے میں، تنازعہ وہی رہے گا جو کبھی ساتویں صدی میں بھی فتنے کا باعث تھا۔ یعنی، اسلام کی قیادت کس کے ہاتھ آئے گی؟ پہلے یہ قضیہ صرف مشرق وسطیٰ تک محدود تھا مگر اب یہ بین الاقوامی سطح کا مسئلہ بن جائے گا۔ اس زمانے میں علی اور معاویہ کے بیچ چپقلش تھی، آج جدید دور میں شیعہ ایران اور سنی سعودی عرب، عالم اسلام کی سیاسی قیادت اور اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہیں گے۔ دردناک بات یہ ہے کہ ان دونوں طاقتوں کے بیچ جاری اقتدار اور اختیار کی یہ جنگ ان کے اپنے یہاں، یعنی ایران اور سعودی عرب یا خلیجی ریاستوں میں نہیں بلکہ عالم اسلام کے چند انتہائی بد قسمت ممالک جیسے عراق کے شہروں، شام کے میدانوں، پاکستان کی گلیوں اور افغانستان کے پہاڑوں میں لڑی جا رہی ہے۔

دوسری طرف مغرب ہے۔ عراق اور افغانستان میں ہزاروں امریکی فوجی مروانے کے بعد ہی ریاست ہائے متحدہ کو بھی سمجھ آئی کہ جب مغربی طاقتیں قیادت اور اختیار کی اس جنگ میں دست اندازی کرتی ہیں تو اس طرح وہ خود کو بھی شدید خطرات سے دوچار کر دیتی ہیں۔ یہ صرف جانی اور مالی ضیاع نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں یہ تاثر بڑھتا جا رہا ہے کہ مغرب نے جان بوجھ کر شیعہ سنی تفریق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسے شہ دے کر اپنے مفادات کا تحفظ کیا ہے، مقاصد حاصل کیے ہیں۔ 2003ء میں عراق پر حملے کے بعد جو افراتفری اور انارکی پھیلی، امریکیوں کے نظر میں معمول کی جنگوں میں سے کسی ایک جنگ کے صرف غیر متوقع نتائج رہے ہوں گے لیکن عراقی اسے سوچی سمجھی سازش سمجھتے ہیں۔ 'حملہ آور نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے' مقتدی الصدر 2007ء میں خطاب کر رہے تھے، 'اتحاد میں طاقت ہے اور پھوٹ کمزوری ہے'۔

فتنہ کے اب نئے معنی اور مفہوم نکل رہے ہیں اور یہ پہلے سے کہیں زیادہ پریشان کن حد تک اشتعال انگیز ہیں۔ وہ یوں کہ اس خطے میں رائے عامہ یہ بنتا جا رہا ہے کہ اسلام کے اندر تنازعات اور خانہ جنگی پر بیرونی قوتوں، یعنی دشمنانِ اسلام نے دیدہ و دانستہ سازشیں رچا کر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے تاکہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا جائے۔ دشمنانِ اسلام یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ لڑ مر کر کمزور ہو جائیں اور دنیا سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے۔ اس سوچ کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ، عراق جنگ کے دوران کافی عرصے تک میڈیا اور عوامی حلقے، چاہے وہ مشرقِ وسطیٰ میں ہوں یا امریکہ سے تعلق رکھتے ہوں، 'صلیبی جنگ' جیسی اصطلاحات کا خوب اچار بناتے رہے۔

یہ سطور مغرب کے سر سمجھ اور بوجھ کا سہرا باندھنے والی بات ہو گی، حالانکہ خود سر مغربی طاقتوں نے شاید ہی کبھی فہم اور فراست سے کام لیا ہو۔ دیکھیے، اگر مغرب نے واقعی شیعہ اور سنی کے بیچ پھوٹ کا فائدہ اٹھایا ہے تو ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی ہے۔ ایسی کوششوں کے نتیجے میں مغرب کو ہمیشہ بازی الٹی پڑی ہے۔ اب تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور مغربی طاقتوں کو اچھی

طرح سمجھ آگئی ہے کہ اگر شیعہ سنی کی آگ میں کودیں اور توقع یہ رکھیں کہ اس تندور میں ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا، یہ احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات ہے۔ یہ سمجھ پہلے سرے سے تھی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر بش انتظامیہ کو کربلا کے واقعہ، اس عنصر کی طاقت کی ذرہ برابر بھی سمجھ ہوتی تو امریکی افواج کو نجف اور کربلا کے مقدس شہروں سے کوسوں دور، کم از کم سو میل کے دائرے سے بھی باہر، بہت دور رہنے کا حکم ملتا۔ لیکن ظاہر ہے، یہ بھی خوش فہمی ہی ہے۔ جیسے ساتویں صدی میں یزید، ویسے ہی اکیسویں صدی میں جارج بش، تب اور آج بھی تاریخ اکثر غافلوں اور لاپرواہوں کے ہاتھوں ہی لکھی گئی ہے۔ یہ بنی یا بگڑی ہے۔

تقریباً ایک صدی پر محیط، پے در پے ناکام مہمات اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ انداز میں مداخلت کے بعد اب ضرورت ہے کہ مغربی طاقتیں پیچھے ہٹ جائیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ مشرق وسطیٰ اور باقی دنیا میں جہاں جہاں اس کے اثرات ہیں، شیعہ اور سنی انقسام سے جڑے جذبات انگیز معاملات کو نیک نیتی کے ساتھ قبول کریں اور اس معاملے کا اس طرح لحاظ اور پاس رکھیں، جو اس کا تقاضا ہے۔ کربلا کی کہانی زمانے کی لاتیں کھا کر بھی باقی ہے بلکہ دن بدن اس کی طاقت میں صرف لیے اضافہ نہیں ہو رہا کہ یہ اخلاقیات وغیرہ کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے یا یہ صرف نیکی اور بدی کا تصور نہیں ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ صرف اور صرف تصوریت اور عملیت کی جنگ نہیں ہے یا اس کے پیچھے صرف سمجھوتہ کرنے یا نہ کرنے کا سوال نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد میں جو نظریاتی پتھر رکھے گئے ہیں، وہ اس مادے سے بنے ہیں جو وقت آنے پر سیاست اور عقیدے، دونوں کا برابر امتحان لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورت پڑے تو یہ انقسام کسی بھی زبردست تحریک میں روح پھونکنے کا حامل ہے۔ یہی نہیں، جب ایسا ہوتا ہے تو پھر ابھرنے والا منظر نہایت خوفناک ہوتا ہے، اس منظر میں سیاست اور عقیدہ ایک دوسرے کو قطع کرتا ہوا، یہاں اور وہاں جھولتا رہتا ہے۔ اس بات سے پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تقدیس کہاں ملے گی؟ جیسا کہ شیعہ کا ماننا ہے، یہ محمد ﷺ کے گھرانے، ان کے خون میں ہوتی ہے یا دوسری طرف جو سنی مانتے ہیں، یہ اجتماعیت یا امت میں رکھی ہے؟ مغرب کو یہ بات پلے سے باندھ لینی چاہیے کہ وہ قوت جو اسلام کی ان دو شاخوں کو جوڑے ہوئے ہے، ان طاقتوں سے کہیں بڑی ہے جو ان کے بیچ تقسیم کا باعث بن گئی۔ مغرب یہ نہ بھولے کہ

مسلمان، شیعہ یا سنی، ان کا بچہ بچہ اس اتحاد اور یگانگت پر یقین رکھتا ہے جس کی تعلیم محمد ﷺ نے خود دی تھی۔ وہ اگر آج جدا ہیں مگر اپنے دھڑوں کے اندر سختی سے اسی نظریے پر قائم ہیں، یعنی اتحاد اور یگانگت قائم رکھنے کا رواج رکھتے ہیں۔ بھلے پھوٹ ہو، دھڑ بھی جدا ہوں مگر یہ مت بھولیے کہ ہر شے سے اوپر، ہر اختلاف، نزاع اور جھگڑے سے بالاتر، مسلمانوں کے دل بدستور محمد ﷺ کے لیے دھڑکتے ہیں۔ اسلام کا یہ ہے کہ الہام کا پیغام اور محمد ﷺ کا نام مل کر ایسا تصور بن جاتے ہیں، جس کو قائم رکھنے کی دھن میں پیش پیش رہنے کی خواہش کا نتیجہ ہے کہ شیعہ اور سنی کی یہ داستان پیش آئی۔ اختلاف اسلام پر کبھی نہیں رہا، تضاد تو اس کی روح کو صحیح معنوں میں برقرار رکھنے کے طریقہ کار اور قیادت پر ہوا ہے۔ دین اسلام کے تصور کی مضبوطی اور گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسلام کا بچہ بچہ، مرد اور عورت، عوام اور خواص۔۔۔ الغرض ہر شخص اس کو زندہ رکھنے لیے ایک دوسرے سے آگے نکل گیا۔ یہ مسلمانوں کے اسی جنون کی حد تک شوق کا نتیجہ ہے کہ اسلام تو باقی ہے مگر اس کے نام لیوا، یعنی وہ خود ٹوٹ کر رہ گئے۔

ماخذ اور حوالہ جات

اوائل اسلامی تواریخ اور حوالہ جات

ان دونوں کتابوں 'دی فرسٹ مسلم' اور 'آفٹر دی پرافٹ' کو انگریزی زبان میں تحریر اور اردو زبان میں بالترتیب 'اول المسلمین' اور 'اول المسلمین کے بعد' کے عنوانات سے تراجم کرنے میں سب سے زیادہ الطبری (923–839) کے حوالہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ الطبری کے بارے یہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا میں ہر لحاظ سے، اوائل دور اسلامی کی تاریخ کا انتہائی مکرم اور مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیف 'تاریخ الرسل والملک' انتہائی شاندار، متاثر کن اور یادگار کتاب ہے۔ اس تفصیلی تاریخ میں وہ قدیم زمانے، یعنی انجیل کے زمانے سے لوگوں اور پیغمبروں سے شروع ہو کر، قدیم فارس کی دونوں یعنی روایتی اور حقیقی تاریخ سمیت سارا حال سناتے ہیں۔ پھر وہ انتہائی تفصیل کے ساتھ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہیں جس میں وہ صدیوں کا حال جمع کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کا دسویں صدی عیسوی تک کا مکمل، مفصل اور انتہائی مستند حال بیان کرتے ہیں۔ الطبری کی اس شہرہ آفاق تصنیف کا کئی زبانوں، بشمول انگریزی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ مکمل کرنے کے لیے ایک انتہائی گراں قدر اور پر شکوہ منصوبہ بنایا گیا تھا جس کی ادارت کا کام احسان یار شاتر نے سرانجام دیا اور اسے نیو یارک کی سٹیٹ یونیورسٹی نے انتالیس جلدوں میں شائع کیا۔ یہ اس قدر محنت طلب کام تھا کہ اسے مکمل کرنے میں تقریباً پندرہ برس لگ گئے، یوں 1985ء اور 1999ء کے دوران یہ کار گراں تکمیل تک پہنچا۔ انگریزی زبان میں اس کا عنوان 'ہسٹری آف الطبری' اور اردو میں یہی تراجم "تاریخ الطبری' کے نام سے دستیاب ہیں۔ زیر نظر دونوں

کتابوں میں الطبری کی تاریخ کا بطور حوالہ استعمال بارے یہ ہے کہ من و عن روایات، مکالمے اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ کئی جگہوں پر داستان کی روانی کے لیے ان حوالہ جات کو سادہ عبارتوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، مگر ان کے حوالہ جات اور اصل ماخذ بھی ہر باب کے ساتھ دستیاب ہیں۔

تاریخ الطبری بارے کیا کہا جائے؟ یہ نہایت عمدہ کام ہے۔ تاریخ دانی کی زبان میں کہیے تو یہ ہر لحاظ سے، زمان و مکان کے طول و عرض میں غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے اور انداز بیان تو نہایت بھلا ہے۔ الطبری، جن کا پورا نام ابو جعفر محمد ابن جریر الطبری ہے۔ انہیں لوگ الطبری کے نام سے جانتے ہیں، جس کی وجہ تسمیہ ابو جعفر محمد ابن جریر کی جائے پیدائش، طبرستان ہے۔ طبرستان بحر قزوین کے جنوبی ساحلوں پر واقع ہے۔ الطبری خود ایک سنی سکالر مشہور ہیں جنہوں نے علم و عرفان حاصل کرنے اور تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے عباسی خلافت کے دور میں، بغداد شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ انہیں سنی نظریات کا پیروکار قرار دیا جاتا ہے مگر ان کی ترتیب دیے ہوئے تاریخ کے اس حوالے کے بارے اکثر سنی مکاتب فکر ہمیشہ سے اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ شاید انہیں شیعہ کی حمایت حاصل تھی یا وہ اس مسلک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ درست نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ الطبری نے ایک نہایت عملی اور پیشہ ور انداز میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی زبانی تاریخ کو تحریر میں ڈھال کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس مقصد کے لیے وہ سلطنت اسلامی کے طول و عرض کا سفر کرتے رہے، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں اور ہر طرح کے لوگوں کا انٹرویو کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہر روایت اور بیان کو پورے حوالے، راوی کے حوالے سمیت تحریری شکل دیتے گئے۔ یہ کام اس قدر تفصیل اور احتیاط سے کیا گیا ہے کہ واقعات اور واقعات کا ماخذ بالکل صاف ہے۔ ہر واقعہ کے ماخذ کا اس وقت تک پیچھا کیا اور اسے تاریخ کا تبھی حصہ بنایا جب اس کے عینی شاہد یا حقیقی شخصیت کا حوالہ نہیں مل گیا۔ یعنی، ہر روایت اوائل دور میں جا کر دم لیتی ہے۔ اس طرح تاریخ الطبری میں وہ رنگ اتر آیا ہے جو مغرب کی اپنی تواریخ میں بھی کبھی ممکن نہیں رہا، یعنی الطبری کی تاریخ ہر لحاظ سے غیر جانبدار اور مورخ سے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ ساتویں صدی سے گونجتی ہوئی روایات، (یعنی شیعہ اور نہ ہی سنی) نہ صرف ان کی آواز جن سے الطبری کی ملاقات رہی بلکہ ان کی بھی، جن کی یہ تاریخ ہے اور جن کا احوال سنایا جا رہا ہے، اس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ جیسے وہ شخصیات سیدھا قاری سے مخاطب ہوں، یعنی بیچ

میں کوئی قلمی اور ذاتی خیال کی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ کہیے، یہ لفظ بہ لفظ بیانات ہیں۔ اس جان توڑ محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ الطبری اس قدر واضح اور بیانیہ اتنا صاف ہے کہ قاری منظر میں کھب جاتا ہے اور تحریر میں عینی شاہدین کا انداز، آواز میں اتار چڑھاؤ، مزاج اور طور بھی صاف صاف نظر آتا ہے۔ وہ جو بولتے ہیں، کہو تحریر میں صاف سنائی دیتا ہے۔ یہ کمال ہے۔ الطبری کے مقابلے میں جتنی بھی باقی تواریخ لکھی گئی ہیں، وہ تقابل کرنے پر انتہائی خشک اور روح سے خالی نظر آتی ہیں۔

الطبری نے زبانی روایات کو اوائل دور کی میسر تواریخ سے بھی ملایا ہے، بلکہ دوہری محنت کر رکھی ہے اور ہر قدم پر یہ کوشش کی ہے کہ کسی بھی طرح سے وہ یا ان کے زمانے کی تواریخ یا ان کے ذاتی خیالات اس شاندار علمی خدمت میں مدخل نہ ہو سکیں۔ یہ کام انہوں نے اتنی جانفشانی اور ایمانداری سے سرانجام دے رکھا ہے کہ ان کی اپنی لکھی ہوئی چند دوسری تصانیف اور حوالہ جات کو وہ خود اپنے ہاتھ سے مسترد کر دیتے ہیں۔ تاریخ الطبری میں جب واضح اور حقیقی بیان مل جاتا ہے تو وہ اپنی ان باقی تصانیف کو، جو اس کام سے پہلے مرتب کی تھیں، معمولی سا فرق دیکھنے پر بھی خود رد کر دیتے ہیں۔ ان تصانیف اور علمی کاوش کا کسی بھی طرح سے اس تاریخ میں نہ تو حوالہ شامل کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں محفوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی اور کئی دوسری تصانیف ان کے حکم پر یا تو تلف کر دی گئیں یا پھر ان کے بارے الطبری نے خود ہی اس حتمی تاریخ کے اندر باور کرا دیا کہ آئندہ استعمال نہ کی جائیں بلکہ جہاں ملیں، ضائع کر دی جائیں۔ لیکن، جو حوالہ جات مستند تھے یا تہہ در تہہ تحقیق کے بعد بھی باقی رہے، ان کا الطبری نے اس تاریخ میں خوب استعمال کیا ہے۔ مثلاً 680ء میں پیش آنے والے سانحہ کربلا کی زیادہ تر روایات انہوں نے 'کتاب مقتل الحسین' سے نقل کی ہیں جو ابو مخنف کوفی کی تصنیف ہے۔ کوفی نے یہ کتاب کربلا کے واقعہ کے صرف پچاس سال بعد تحریر کی تھی اور یہ اس طرح مستند ہے کہ عینی شاہدین کے بیانات، اقوال اور خیالات مل جاتے ہیں۔ اس کتاب کے روایوں میں کربلا میں بچ جانے والے، حسین علیہ السلام کے واحد فرزند علی زین العابدین کے بیانات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔

قارئین میں وہ لوگ جو مشرق وسطیٰ کے مشہور و معروف، انتہائی خوب اور آزاد انداز بیاں میں دلچسپی

رکھتے ہیں، الطبری کا مطالعہ ان کے لیے نہایت فرحت بخش تجربہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے، ہم عام طور پر ایک ہی خط پر، گنے چنے اصولوں کے پابند اور قطعیت سے لکھی گئی کتابیں پڑھنے کے عادی ہیں تو عام قاری، اس سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے مگر یوں کہیے، اس کے لیے ذہن بنانا پڑتا ہے مگر جب ایک دفعہ ذہن بن جائے تو یقین جانیے، مطالعے کا اس سے زیادہ پر لطف تجربہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ الطبری کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اکثر ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ یا مکالمے کو بار بار، اکثر تو درجن بار بیان کیا گیا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ، ہر روایت کو مختلف راویوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ یوں ہوتا یہ ہے کہ بیانات شخصی حوالہ جات کی وجہ سے زمانے میں آگے اور پیچھے جھولتے رہتے ہیں، مگر دلچسپ عنصر یہ ہے کہ ہر روایت میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جاتا ہے جو پہلے گزر جانے والی روایت میں نہیں تھا۔ یعنی یا تو راوی بھول گیا تھا یا اس کا نقطہ نظر دوسرے سے مختلف رہا تھا، مگر اس واقعہ یا مکالمے کا ہر صورت پورا حال احوال آخر میں مکمل مل جاتا ہے۔ یوں کئی راویوں اور انداز بیانات کو جمع کرنے سے ہر واقعہ یا مکالمے کے بارے پہلے یہ لگتا ہے کہ شاید کھلی چھوٹ ہے، اس انداز بیان کا ڈھانچہ بھی کوئی نہیں ہے مگر آخر تک پہنچیں تو معاملہ بالکل شیشے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ ہر چیز جگہ پر بیٹھ جاتی ہے اور بڑے منظر نامے پر ایک نہایت واضح ڈھانچہ بن کر انتہائی خوبصورتی سے پس منظر اور زیر نظر ماحول میں فٹ ہو جاتا ہے۔ یوں تاریخ بنتی جاتی ہے اور داستان کھلتی جاتی ہے۔

اب، یہ نکتہ انتہائی اہم ہے، قارئین کی بھرپور توجہ درکار ہے۔ بات یہ ہے کہ الطبری کے طریقہ کار کو دیکھیں تو ہمیں ہر واقعہ کی کئی روایات مل جاتی ہیں، بہت سے راوی ہیں اور کئی زاویے ہیں۔ لیکن، آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ ان دونوں کتابوں 'اول المسلمین' اور 'اول المسلمین کے بعد' میں، ہر جگہ، ہر واقعہ اور ہر مکالمے کا ایک ہی نسخہ استعمال ہوا ہے جو اصل میں ایک نسخہ نہیں ہے۔ اصل کتابوں یا تراجم میں الطبری کی طرح کسی بھی واقعہ یا مکالمے کے درجن بھر حوالے شامل نہیں کیے گئے۔ یہ بات جیسے کہ اوپر بیان کی گئی، درست ہے کہ اصل تاریخ، یعنی الطبری کی تاریخ میں یہ ایسے ہی ہے، یعنی ایک واقعہ یا مکالمے کی کئی روایات ہیں جنہیں مختلف گواہوں اور روایوں نے بیان کر رکھا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی میں مصنفہ اور اردو میں مترجم نے ایک ہی مکالمہ یا حوالہ کیوں شامل کیا ہے؟ یا وہی الفاظ کیوں استعمال کر رکھے ہیں جو ان

دونوں کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں؟ یہ انتہائی اہم سوال ہے اور اس کا جواب قاری کے لیے اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ہوا یہ ہے کہ، الطبری کی اصل تاریخ میں ہر واقعہ یا مکالمے کے کئی راوی ہیں، بہت سے زاویے ہیں۔ مگر لے دے کر، آخر میں ہر واقعہ یا مکالمے کا احوال اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ تقریباً سب ہی روایات کا بہاؤ ایک ہی جیسا ہے، جو فرق ہے وہ الفاظ کے چناؤ کا ہے، یا جس شخص نے روایت کی اس کے انداز کا ہے، یا جس شخص کو روایت کیا ہے، اس کی طبیعت اور اس کے بارے روایت کرنے والے کا نکتہ نظر ہے۔ یوں ان روایات میں جہاں الفاظ یا بول چال میں فرق ہے، اکثر تفاصیل بھی کم یا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک شخص کو اگر یہ بات یا انداز یاد رہا تو دوسرے شخص کو کچھ حصہ یا تیسرے شخص کو ان دونوں سے زیادہ واضح یاد ہے۔ یعنی، ماخذوں کی یادداشت کا بھی عمل دخل ہے۔ خیر، مصنفہ کا انگریزی میں اور مترجم کا اردو میں، طریقہ کار یہ رہا ہے کہ ایک ہی واقعہ یا مکالمے کی کئی روایات میں چھان بین کر کے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کونسی روایت استعمال کی جائے یا زیادہ واضح کرنے کے لیے، کون کون سی روایات کو جوڑ دیا جائے یا کئی روایات کو جوڑ کر ایک بنا لیا جائے تا کہ ماحول اور پس منظر کے عین مطابق، صورتحال واضح ہو جائے۔ اسی طرح، اس بات کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہے کہ انگریزی یا اردو میں ترجمہ کرتے وقت الفاظ کا چناؤ بھی ایسا ہو کہ آخر میں مدعا بیان ہو جائے، صوت سے یا لفظوں کی نفسیات سے ہر واقعہ یا مکالمے کا اصل نکل کر باہر آ جائے۔ مقصد صراحت اور وضوح پیدا کرنا ہے۔ یاد رہے، کسی بھی موقع پر، کسی بھی جگہ پر، ہر گز ہر گز نہ تو انگریزی اور نہ ہی اردو میں، مرصع نگاری سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی اصل بیانات میں کہیں کچھ کمی یا بیشی کی گئی ہے۔ کتابوں کے دونوں نسخوں، چاہے انگریزی یا اردو میں مطالعہ کرنے پر یہی محسوس ہو گا کہ ہر قدم پر، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ بجائے عمومیت، اصلیت نکل آئے۔ اسی لیے بیان سادہ، سلیس اور واضح ہے اور تفاصیل خاصی براہ راست یا بلاواسطہ بن جاتی ہیں۔

یہ تو ان روایات کا احوال ہے جہاں بیانات جمع ہو کر ایک ہی نتیجے کا باعث بن جاتے ہیں، یعنی روایات میں انیس بیس کا فرق ہے، زیادہ نہیں۔ لیکن کئی واقعات ایسے بھی ہیں جن کی الطبری کی تاریخ میں مختلف روایات مل جاتی ہیں اور کئی بیانات تو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اس صورت میں، اصل نسخے، انگریزی

اور اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ان تضادات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے اور احتیاط برتی گئی ہے۔ یہ بات باور کرانا انتہائی لازم ہے کہ مصنفہ اور مترجم نے اس ضمن میں الطبری کا ہی انداز اپناتے ہوئے اس پر فیصلہ یا حتمی رائے دینے کی بجائے اس پر تکیہ کیا ہے جو الطبری کا بھی خاصہ ہے۔ الطبری اپنی تاریخ کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں، 'ہر چیز جو یہاں بتائی گئی ہے، اس کے لیے میں نے پوری تحقیق سے کام لے کر، مستند حوالہ جات سے مزین ایسی بنیاد رکھی ہے جس پر میں خود بھروسا کر سکتا ہوں۔ یاد رہے، یہ بنیاد زبانی بیانات اور کلامی روایات پر کھڑی ہے جو کئی کئی راویوں سے منسوب ہیں۔ اس بنیاد میں استعمال ہونے والا علم اطلاع دینے والوں اور راویوں کے اصل بیانات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس علم میں کسی بھی طرح سے مصنف کے ذاتی خیالات، سمجھ، عقل، جذبات یا بصارت کی کھوٹ داخل نہیں ہے۔ اگر اس کتاب میں ماضی کی کسی شخصیت بارے بیانات یا ان شخصیات کے اپنے بیانات شامل کیے ہیں، جو بعض لوگوں کے لیے باعث تشویش یا تکلیف ہو سکتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ اس کی ذمہ داری ہماری نہیں بلکہ اس شخص کی ہے جس نے یہ ہم تک پہنچایا، یا اپنی ذمہ داری پر روایت کر رکھا ہے۔ یعنی، اس تاریخ کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔ ہم نے ان کے بیانات، اقوال اور روایات کو من وعن اسی طرح لکھ دیا ہے جس طرح یہ ہم تک پہنچے تھے'۔

محمد ﷺ کی سب سے پہلی سوانح حیات ابن اسحاق نے ترتیب دی تھی۔ ان کی جمع کی ہوئی یادداشتوں کے مجموعہ کو 'سیرت الرسول اللہ' کہا جاتا ہے اور یہی یادداشتیں آج تک دنیا میں جتنی بھی سیرت کی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی بنیاد ہیں۔ الطبری کی لکھی ہوئی تاریخ کی ہی طرح ابن اسحاق کی 'سیرت رسول' بھی اسلامی دنیا میں ہر جگہ مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خود الطبری نے محمد ﷺ کی زندگی بارے چار جلدوں کے تقریباً مندرجات ابن اسحاق سے ہی مستعار لیے ہیں، جن پر مکمل تحقیق کی گئی۔

محمد ابن اسحاق 704ء کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور 767ء کو بغداد میں وفات پائی۔ ان کی جمع کی ہوئی 'سیرت رسول اللہ' کی یادداشتوں کا اصل مسودہ اب ناپید ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں تحریر لکھنا اور پھر اسے باقی رکھنا انتہائی مشکل رہا کرتا تھا۔ لیکن ان کی اصل یادداشتوں اور حوالہ جات کو ہی استعمال میں لاتے ہوئے بصرہ میں پیدا ہونے والے تاریخ دان ابن ھشام نے 'سیرت ابن ہشام' ترتیب دی تھی، جس میں ابن

اسحاق کے اصل نسخوں کو وسعت دی گئی اور اس میں مزید تحقیق شامل ہوئی۔ ابن ہشام نے فسطاط (قاہرہ)، یعنی مصر میں بسر رکھی۔ ابن ہشام کے ہاتھوں ترتیب پانے والی، ابن اسحاق کی 'سیرت رسول' کا 1955ء میں انگریزی ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ممکن بنا کر شائع کروایا۔ یہی انگریزی نسخہ، زیر نظر دونوں کتابوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

الطبری اور ابن اسحاق کے علاوہ یہاں اوائل دور کے دو مزید مورخین کا ذکر انتہائی ضروری ہے۔ پہلے مورخ بلازری ہیں، جنہوں نے الطبری کی تاریخ کو استعمال میں لاتے ہوئے تاریخ اسلامی میں مزید فصاحت اور نفاست پیدا کی۔ ابوالحسن احمد بن یحیی بلازری فارس میں پیدا ہوئے اور سکونت بغداد میں رکھی اور یہیں 892ء میں وفات پائی۔ ان کی تصنیف، 'فتوح البلدان' یعنی عربوں کی ملکی فتوحات کا انگریزی ترجمہ 1924ء میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب، 'انساب الاشراف' یعنی 'عربوں کی حسب نسبی تاریخ'، جس میں تمام خلفاء اور زیر نظر دونوں کتابوں میں جتنی بھی شخصیات کا ذکر آیا ہے، ان کے حسب اور نسب کا پورا بیان ملتا ہے، تحقیق کے لیے دستیاب رہی۔ اگرچہ بلازری کی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ تو نہیں ہے مگر کوشش کر کے اس کو عربی اور فارسی زبان کی سمجھ رکھنے والے احباب کی مدد سے پوری طرح استعمال میں لایا گیا ہے۔

دوسرے مورخ ابن سعد ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اوائل دور اسلام کی تقریباً شخصیات کی سوانح حیات لکھ رکھی ہیں۔ ابن سعد کی لکھی ہوئی تاریخی سوانح حیات، بعد کے تقریباً سب ہی مورخین کے لیے مستند حوالہ رہی ہے، یہاں تک کہ الطبری نے بھی ابن سعد کی تصانیف کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ابن سعد 764ء میں بصرہ شہر میں پیدا ہوئے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور یہیں 845ء میں وفات پائی۔ انہوں نے 'کتاب الطبقات' لکھی، جو نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان نو جلدوں میں محمد ﷺ، محمد ﷺ کے اصحاب، اوائل دور کی چیدہ شخصیات اور سکالروں اور بالخصوص خواتین کا حسب نسب، کردار اور زندگیوں کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ابن سعد کی اس ضخیم تصنیف میں سے منتخب شدہ اقتباسات کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔ انگریزی زبان میں یہ کل دو نسخے ہیں۔ پہلا، 'مدینہ کی خواتین' 1995ء میں اور دوسرا 'مدینہ کے

حضرات'1997ء میں شائع ہوا۔

قرانی نسخے اور تفاسیر

زیر نظر دونوں کتابوں کو ترتیب دینے اور اردو ترجمہ کرنے کے لیے قرانی آیات کو بھی بطور حوالہ شامل کیا گیا ہے۔اس مقصد کے لیے قران کے ایک سے زیادہ انگریزی اور اردو نسخے استعمال میں لائے گئے، تاکہ بیان، پس منظر اور ماحول کے عین مطابق واضح رہے اور مصنفہ یا مترجم سے کسی بھی قسم کی چوک نہ ہونے پائے۔ یادرہے، یہاں اصطلاح 'نسخے 'استعمال کی گئی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنفہ اور مترجم یہ سمجھتے ہیں کہ بنیادی اسلامی عقیدہ کے مطابق قران، الہامی کتاب یعنی خدا کا کلام ہے۔ماننا یہ ہے کہ الہامی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اس لیے ترجمہ کہنا مناسب نہیں۔ دوسری زبانوں میں یہ اصل کلام کا ترجمہ نہیں بلکہ توضیح ہوتی ہے، یعنی صرف اظہار ہے۔ اسے ایسا ہی سمجھا گیا ہے، یہ اصل نسخوں کا ہر گز متبادل نہیں ہیں۔ بہر حال، ضرورت کے تحت انگریزی زبان کے استعمال کیے گئے قرانی نسخوں میں ایڈورڈ پالمر 1900ء، آربیری 1955ء، داؤد 1956ءاور لیلیٰ بختیار 2009ء جبکہ اردو زبان میں مودودی، جالندھری، عثمانی اور تھانوی کے نسخے شامل ہیں۔

علمی، مسلکی اور تحقیقی حوالہ جات

اوپر بیان کردہ اہم اور کلیدی حوالہ جات کے علاوہ بھی کئی مورخین، نظریہ کاروں، شیعہ سکالرز، سنی سکالرز اور مشرقی و مغربی محققین کے علمی کام کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ان میں سے اکثر کے کام کو ان کے نام کے ساتھ دونوں کتابوں میں شامل کیا گیا ہے لیکن کئی جگہوں پر چاشنی برقرار رکھنے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں رہا۔ بہر حال، یہ اہم ہے کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ان حوالہ جات کی مکمل فہرست زیر نظر دونوں کتابوں کے انگریزی نسخوں کے آخر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

Ahmed, Leila. *Women and Gender in Islam.* New Haven: Yale University Press,1992.
Ajami, Fouad. *The Vanished Imam: Musa al Sadr and the Shia of Lebanon.* Ithaca: Cornell University Press,1986.
Ajami, Fouad. *The Foreigner's Gift: The Americans, the Arabs, and the Iraqis in Iraq.* New York: Free Press,2006.
Akhavi, Shahrough. "Shariati's Social Thought." In *Religion and Politics in Iran*, ed. Nikki Keddie. New Haven: Yale University Press,1983.
Al-e Ahmad, Jalal. *Occidentosis: A Plague from the West*, tr. R. Campbell from the 1962 Farsi
Gharbzadegi. Berkeley: Mizan Press,1984.
Allen, Charles. *God's Terrorists: The Wahhabi Cult and the Hidden Roots of Modern Jihad.* Cambridge: Da Capo,2006.
Al-Mufid, Shaykh. *The Book of Guidance into the Lives of the Twelve Imams*, tr. I. K. A. Howard of *Kitab al-Irshad.* London: Muhammadi Trust,1981.
Arjomand, Said Amir. *The Shadow of God and the Hidden Imam: Religion, Political Order and Societal Change in Shi'ite Iran from the Beginning to 1890.* Chicago: University of Chicago Press,1984.
Aslan, Reza. *No God but God: The Origins, E Volution, and Future of Islam.* New York: Random House,2005.
Ayoub, Mahmoud. *Redemptive Su_ering in Islam: A Study of the Devotional Aspects of Ashura.* The Hague: Mouton,1978.
Beeman, William O. "Images of the Great Satan: Representations of the United States in the Iranian Re Volution." In *Religion and Politics in Iran*, ed. Nikki Keddie. New Haven: Yale University Press,1983.
Berkey, Jonathan P. *The Formation of Islam: Religion and Society in the Near East, 600-1800.* Cambridge: Cambridge University Press,2003.
Cockburn, Patrick. *Muqtada: Muqtada al-Sadr, the Shia Revival, and the Struggle for Iraq.* New York: Scribner,2008.
Cole, Juan. *Sacred Space and Holy War: The Politics, Culture and History of Shi'ite Islam.* London: I. B. Tauris,2002.
Cole, Juan. Ongoing informed commentary on Middle Eastern politics at www.juancole.com.
Cole, Juan, and Nikki Keddie, eds. *Shi'ism and Social Protest.* New Haven: Yale University Press,1986.
Cook, David. *Understanding Jihad.* Berkeley: University of California Press,2005.
Crone, Patricia, and Martin Hinds. *God's Caliph: Religious Authority in the First Centuries of Islam.* Cambridge: Cambridge University Press,1986.
Dodge, Toby. *Inventing Iraq: The Failure of Nation Building and a History Denied.* New York: Columbia University Press,2003.
Enayat, Hamid. *Modern Islamic Political Thought.* London: I. B. Tauris,2005.
Flaskerud, Ingvild. *Standard-Bearers of Hussein: Women Commemorating Karbala.* DVD for academic and research distribution only. ingvildf@sv.uit.no, University of Tromsö,2003.
Geertz, Clifford. *Islam Observed: Religious Development in Morocco and Indonesia.* Chicago: University of Chicago Press,1968.
Geertz, Clifford. *The Interpretation of Cultures: Selected Essays.* New York: Basic Books,1973.
Grant, Christina Phelps. *The Syrian Desert: Caravans, Travel and Exploration.* London: A. and C. Black,1937.
Halm, Heinz. *Shi'a Islam: From Religion to Re Volution.* Princeton: Markus Wiener,1997.
Heck, Gene W. "Arabia Without Spices." *In Journal of the American Oriental Society*, Vol. 123. 2003.
Hegland, Mary. "Two Images of Husain: Accommodation and Re Volution in an Iranian Village." In *Religion and Politics in Iran*, ed. Nikki Keddie. New Haven: Yale University Press,1983.
Hjarpe, Jan. "The Ta'ziya Ecstasy as Political Expression." In *Religious Ecstasy*, ed. Nils G. Holm. Stockholm: Almqvist and Wiksell,1982.
Hourani, Albert. *A History of the Arab Peoples.* Cambridge: Harvard University Press,1991.
Humphreys, R. Stephen. *Islamic History: A Framework for Inquiry.* Minneapolis: Biblioteca Islamica,1988.
Humphreys, R. Stephen. *Mu'awiya ibn Abu Sufyan: From Arabia to Empire.* Oxford: One

World,2006.
Kennedy, Hugh. *The Prophet and the Age of the Caliphates: The Islamic Near East from the Sixth to the Eleventh Century.* London: Longman,1986.
Kennedy, Hugh. *The Great Arab Conquests: How the Spread of Islam Changed the World We Live In.* Cambridge: Da Capo,2008.
Kenney, Je□rey T. *Muslim Rebels: Kharijites and the Politics of Extremism in Egypt.* Oxford: Oxford University Press,2006.
Khomeini, Ruhollah. *Islam and Re Volution: Writings and Declarations of Imam Khomeini*, tr. Hamid Algar. Berkeley: Mizan Press,1981.
Kurzman, Charles. *The Unthinkable Re Volution in Iran.* Cambridge: Harvard University Press,2004.
Lammens, Henri. "Fatima and the Daughters of Muhammad." In *The Quest for the Historical Muhammad*, ed. Ibn Warraq. Amherst: Prometheus Books,2000.
Levey, Martin. *Early Arabic Pharmacology.* Leiden: E. J. Brill,1973.
Levey, Martin. *Medieval Arabic Toxicology: The "Book on Poisons" of Ibn Wahshiya and Its Relation to Early Indian and Greek Texts.* Philadelphia: American Philosophical Society,1966.
Lewis, David Levering. *God's Crucible: Islam and the Making of Europe.* New York: Norton,2008.
Mernissi, Fatima. *The Veil and the Male Elite: A Feminist Interpretation of Women's Rights in Islam.* New York: Basic Books,1991.
Mernissi, Fatima. *The Forgotten Queen of Islam.* Oxford: Oxford University Press,1993.
Moin, Baqer. *Khomeini: Life of the Ayatollah.* New York: Thomas Dunne,1999.
Morony, Michael G. *Iraq After the Muslim Conquest.* Princeton: Princeton University Press,1984.
Motahhary, Morteza. *The Martyr.* Houston: Free Islamic Literatures,1980.
Mottahedeh, Roy. *The Mantle of the Prophet: Religion and Politics in Iran.* Oxford: One World,1985.
Musil, Alois. *The Middle Euphrates: A Topographical Itinerary.* New York: American Geographical Society,1927.
Musil, Alois. *The Manners and Customs of the Rwala Bedouins.* New York: American Geographical Society,1928.
Nakash, Yitzhak. *Reaching for Power: The Shi'a in the Modern Arab World.* Princeton: Princeton University Press,2006.
Nakash, Yitzhak. *The Shi'is of Iraq.* Princeton: Princeton University Press,1994.
Packer, George. *The Assassins' Gate.* New York: Farrar, Straus and Giroux,2005.
Pelly, Lewis. *The Miracle Play of Hasan and Hussein, Collected from Oral Tradition.* London: W. H. Allen,1879.
Qutb, Sayyid. *Milestones [Ma'alim f'il-Tariq*, 1964]. Karachi: International Islamic Publishers,1981.
Rahnema, Ali. *An Islamic Utopian: A Political Biography of Ali Shariati.* London: I. B. Tauris,1998.
Richard, Yann. *Shi'ite Islam: Polity, Ideology, and Creed.* Oxford: Blackwell,1995.
Robinson, Chase F. *Islamic Historiography.* Cambridge: Cambridge University Press,2003.
Rodinson, Maxime. *Muhammad.* New York: Pantheon,1971.
Rogerson, Barnaby. *The Heirs of the Prophet Muhammad.* London: Little, Brown,2006.
Rosen, Nir. *In the Belly of the Green Bird: The Triumph of the Martyrs in Iraq.* New York: Free Press,2006.
Ruthven, Malise. *Islam in the World.* Oxford: Oxford University Press,2000.
Sachedina, Adulaziz Abdulhussein. *Islamic Messianism: The Idea of Mahdi in Twelver Shiism.* Albany: State University of New York Press,1981.
Shadid, Anthony. *Night Draws Near: Iraq's People in the Shadow of America's War.* New York: Henry Holt,2005.
Stark, Freya. *Baghdad Sketches.* New York: Dutton,1938.
Stark, Freya. *East Is West.* London: John Murray,1945.
Taheri, Amir. *The Spirit of Allah: Khomeini and the Islamic Re Volution.* Bethesda: Adler and Adler,1986.
Taheri, Amir. *Holy Terror: The Inside Story of Islamic Terrorism.* London: Hutchinson,1987.
Thaiss, Gustav. "Religious Symbolism and Social Change: The Drama of Hussein." In

Scholars, Saints, and Su□s: Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500, ed. Nikki Keddie. Berkeley: University of California Press,1972.
Thaiss, Gustav. “Unity and Discord: The Symbol of Husayn in Iran.” In *Iranian Civilization and Culture*, ed. Charles J. Adams. Montreal: McGill University Institute of Islamic Studies,1972.
Watt, W. Montgomery. *Muhammad at Mecca.* Oxford: Oxford University Press, 1953.
Watt, W. Montgomery. *Muhammad at Medina.* Oxford: Oxford University Press, 1956.
Watt, W. Montgomery. “The Significance of the Early Stages of Imami Shi’ism.” In *Religion and Politics in Iran*, ed. Nikki Keddie. New Haven: Yale University Press,1983.
Young, Gavin. *Iraq: Land of Two Rivers.* London: Collins,1980.
Zakaria, Rafiq. *The Struggle Within Islam: The Conflict Between Religion and Politics.* London: Penguin,1988.

ABOUT THE AUTHOR

British-born Lesley Hazleton is a psychologist and veteran Middle East journalist whose work has appeared in the *New York Times, Esquire, Vanity Fair, Harper's, The Nation, New Republic, New York Review of Books*, and other publications. The author of several acclaimed books on Middle East politics, religion, and history, including *Jerusalem, Jerusalem* and *Mary: A Flesh-and-Blood Biography of the Virgin Mother*, she now lives in Seattle, Washington.

For more information, visit this book's Web site:

www.AfterTheProphet.com